راہِ عمل ①

نقوشِ موعظت

جس میں موجودہ حالات میں بین الاقوامی اور ملکی مسائل و حالات اور خود مسلمانوں کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف حادثات اور تاریخی واقعات کے پس منظر میں عبرت و موعظت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

تالیف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

Madrassah Arabia Islamia
[illegible]
Azaadville South Africa
Tel: [illegible]

AL FAROOQ INTERNATIONAL
[illegible]
Tel: [illegible]

ISLAMIC BOOK CENTRE
[illegible]
Tel/Fax: [illegible]

Azhar Academy Ltd.
[illegible]
[illegible] London [illegible]
Phone: [illegible]

[illegible]

[illegible] 021-2760374

[illegible] 021-2725673

[illegible] zamzam01@cyber.net.pk

[illegible] http://www.zamzampub.com

فہرست مضامین

- پیش لفظ ۷
- عرض مرتب ۸
- دو کردار ۱۲
- قرآن مجید اور ہماری ذمہ داری ۱۵
- انٹرنیٹ کے ذریعہ تحریف قرآن کی سازش ۱۹
- شب قدر — انسانیت کی شب نجات ۲۳
- ہمدردی و غمگساری کا مہینہ ۲۷
- نیکیوں کی فصل بہار ۳۱
- صبر کی تربیت ۳۴
- رمضان المبارک کا پیغام ۳۸
- تقویٰ — روزہ کا اصل مقصد ۳۹
- عید کا پیغام — امت مسلمہ کے نام ۵۳
- اسلامی تہوار تہذیب و شائستگی کا نمونہ ۵۶
- غم کے زیر سایہ عید ۶۰
- اسوۂ ابراہیمی ۶۶
- ہجری کیلنڈر ۶۹
- اسوۂ حسینی ۷۵
- اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت ۸۲
- ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا ۸۹

○ بارش میں تاخیر کیوں	۹۳
○ نتیجہ اپنی خطا کا	۹۷
○ مانگے بچے، مانگے پھر گئے	۱۰۳
○ خشک سالی، نحوستِ اعمال	۱۰۹
○ بارش کی کمی، عبرت و موعظت کے چند پہلو	۱۱۳
○ زلزلہ ـــ خدائی تنبیہ	۱۱۸
○ گجرات کا زلزلہ اور ہمارا فریضہ	۱۲۳
○ اپنے عیال کو آگ سے بچائیے!	۱۲۶
○ اولاد کی فکر کیجئے	۱۳۵
○ ماضی کو یاد کیجئے	۱۴۰
○ سالِ نو ساعتِ سرمستی یا وقتِ احتساب؟	۱۴۴
○ لے گیا کیا تجھے صدی گئی	۱۴۸
○ تہذیبی ارتداد	۱۵۴
○ کیا اس ارتداد کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟	۱۶۱
○ اخوتِ اسلامی کا فقدان	۱۶۷
○ کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!	۱۷۳
○ بات کہنے کا سلیقہ چاہئے	۱۷۹
○ اسلام ـــ نسل پرستی کا علاج	۱۸۲
○ گناہ بے لذت	۱۸۸
○ فسادات کا سبق	۱۹۳
○ مرحوم سوویت ـــ انسانیت سوزی کا بدترین نمونہ	۱۹۹

- زندگی کی شمع ۲۰۵
- ایک مظلوم کا مقدمہ انصاف کی عدالت میں ۲۱۰
- دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۲۱۵
- تم صرف تیچے بے ہو ۲۲۰
- چشم عبرت ہو تو گھر ان آنکھ بھی ہے ۲۲۴
- پھر کسی صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے ۲۳۰
- تو جیرا زمانہ ہم قطرہ زمانہ میں! ۲۳۵
- کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟ ۲۴۱
- بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے ۲۴۷
- کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا ۲۵۲
- تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی ۲۵۹
- بیدار ہو کر جواں ۲۶۳
- چودھویں صدی کا سبق ۲۶۷
- اپنی تاریخ کو بچائیے ۲۸۳
- میرا ایک تجربہ ۲۸۸
- پروپیگنڈہ کا جواب عمل سے ۲۹۳
- دعوت دین — سب سے اہم فریضہ ۳۰۱
- ایک اہم فریضہ جس سے ہم غافل ہیں ۳۱۰
- مسلمانان ہند کا ایک اہم فریضہ ۳۱۵
- کاش! ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا ۳۲۱
- نہایت اہم کام ۳۲۷

- [illegible] ٣٣٢
- [illegible] ٣٣٨
- [illegible] ٣٤٥
- [illegible] ٣٥٢
- [illegible] ٣٥٧
- [illegible] ٣٦١

پیش لفظ

دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے اور واقعات وحادثات کی آماجگاہ ہے، شاید کوئی دن گذرتا ہو کہ کوئی خوش کن یا غم انگیز اور عبرتناک یا سبق آموز واقعہ پیش نہ آتا ہو، بعض واقعات ایمان و عقیدہ کا حصہ ہیں، بعض وہ ہیں جن کو تاریخ کے واسطے سے کانوں نے سنا ہے، اور بعض وہ ہیں، جنہیں سر کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے، عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ان واقعات میں عبرت و موعظت کے نقوش تلاش کئے جائیں، اور اپنی عملی زندگی میں رہنمائی حاصل کی جائے۔

چنانچہ راقم الحروف روزنامہ منصف کے کالم ''شمع فروزاں'' میں بعض اوقات اس پہلو سے بھی قلم اٹھاتا رہا ہے، ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ''نقوشِ موعظت'' کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے، یہ مضامین متنوع موضوعات پر ہیں، اور ان میں قدر مشترک یہی ہے کہ ہر واقعہ کو عبرت آمیز اور موعظت خیز نظر سے دیکھا جائے۔

اس سے پہلے ۱۹۹۸ء میں شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کا ایک مجموعہ ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، جس میں تمام مضامین ایک ساتھ شریک اشاعت ہیں، اب کئی سال کے مضامین جمع ہو گئے تھے، اور ان کی ضخامت بھی اچھی خاصی ہو گئی، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اسے ایک مشترک نام دیا جائے، کیوں کہ ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ عمل کی دعوت دی جائے اور اپنی عملی زندگی کا احتساب کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی مناسبت سے ان میں مختلف مجموعوں کی مستقل حیثیت بھی ہے۔

--- اس پہلے مجموعہ کی ترتیب عزیز گرامی مولانا شاہد علی قاسمی (استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) نے انجام دی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے اور اس کتاب کو لوگوں کے لئے نافع بنائے، نیز اس حقیر کے لئے ذخیرۂ آخرت فرمائے، واللہ ہو المستعان۔

۱۳/ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹/ ستمبر ۲۰۰۴ء

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرضِ مرتب

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو وجود بخشنے کے بعد جب حضرت انسان کو اس میں آباد کیا تو جہاں اس خاکی پیکر کی راحت و آرام اور اس کی جملہ ضروریات کا سامان فراہم کیا اور اس کے واسطے دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں رکھیں، وہیں ان کی ہدایت و رہنمائی کے ذرائع بھی پیدا فرمائے تاکہ انسان اپنے خالق و مالک کی مرضیات کے مطابق زندگی گذارے۔

ان ہی ہدایات اور عبرت و موعظت کی چیزوں میں ایک کائنات کا وسیع نظام، اس میں کارفرما قانونِ فطرت اور تکوینی اصول کے تحت پیش آنے والے واقعات و حوادث بھی ہیں، یہ وسیع کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات یقیناً ایک نظام کے تابع ہیں اور محض اتفاقی نہیں، غور کریں تو ان امور میں بھی بڑی حکمتیں اور انسان کے لئے ہدایتیں پوشیدہ ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیں اپنے خالق کی بندگی کرنے کی دعوت دیتا اور قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے، گویا زمین کے سینے پر اگنے والے برگ و بار، غنچہ و گل سراپا پیغام اور خاموش ہادی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اکثر جگہوں پر کائناتی نظام کے ذکر کے بعد اس سے سبق حاصل کرنے کا حکم دیا ہے: "فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

یہی حال دنیا میں رونما ہونے والے معمولی و غیر معمولی حوادث و واقعات کا ہے، یہ واقعات تکوینی انتظام کے تحت پیش آتے ہیں، لیکن ان کے اندر بھی ہمارے لئے بڑا پیغام ہوتا ہے، یہ ہماری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں، آئندہ ان سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور بعض واقعات تو اسی لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ خدا کی نافرمانی میں مشغول بندہ جاگے اور اپنے خالق کو یاد کرے، یہی ایک مسلمان کا

شعور پیدا ہونا چاہئے کہ وہ واقعات وحوادث کے ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ ان کے اصل عوامل کو دیکھے، آخرت سے سبق حاصل کرے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہو۔

جناب محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (اللہ ان کا سایہ تا دیر قائم رکھے) کئی سال سے اردو کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ "منصف" حیدرآباد کے اتوار کو ایڈیشن میں "شمع فروزاں" کے عنوان سے مستقل کالم لکھ رہے ہیں۔ آپ کا یہ کالم بڑے شوق و ذوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اس کی شہرت ومقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس دن کا اخبار دیگر ایام کے مقابلہ کہیں زیادہ شائع ہوتا ہے اور قارئین کی بڑی تعداد ان مضامین کی فائل بنا کر محفوظ رکھتی ہے۔ یہ مضامین متنوع ہوتے ہیں، ان میں مسلمانوں کی رہنمائی بھی ہوتی ہے اور ان کے مسائل کا تجزیہ بھی، معاشرتی مسائل پر اظہار خیال بھی اور نئے مسائل کا حل بھی، مسلمانوں کی پستی کے اسباب بھی بیان کئے جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کا راستہ بھی بتایا جاتا ہے۔

یہ کالم کے رنگارنگ اور قیمتی مضامین جو روزنامہ "منصف" کی فائلوں میں منتشر تھے، راقم نے انہی فائلوں سے یکجا کر کے یہاں جمع کیا ہے جو "نقوشِ موعظت" کے عنوان سے قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ مضامین شامل ہیں جو حالات و واقعات سے متعلق ہیں اور جنہیں استاذ محترم نے درسِ عبرت کی شکل میں پیش کیا ہے اور ان میں موجودہ دور میں موعظت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے، اسی طرح چند مضامین دعوت سے متعلق بھی ہیں جن میں غیر مسلموں میں دعوتی کام کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے اور اس اہم فریضہ کی ضرورت واہمیت بتاتے ہوئے اس کی طرف سے بے توجہی کے نقصانات کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ مضامین بہت اہم اور قیمتی ہیں، شستہ اور ادبی چاشنی سے بھرپور زبان کے ساتھ استاذ محترم کا سوزِ دروں اور اندرونی تڑپ بھی بین السطور سے جھلکتا نظر آتا ہے، امید ہے کہ قارئین اسے شوق کے ہاتھوں لیں گے اور حضرت الاستاذ مدظلہ کی دیگر کتابوں کی طرح یہ مجموعہ بھی مقبول عام وخاص ہوگا۔

۱۵/شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ

شاہد علی قاسمی

یکم/اکتوبر ۲۰۰۴ء

(استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

دو کردار

قرآن مجید ہدایت اور رہنمائی کی کتاب ہے۔ اس کے ہر لفظ کی تہہ میں ہدایت کا نور موجود ہے۔ اس نے دو اہم کردار پیش کئے ہیں۔ انسانیت کے باپ اور اللہ کے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کا اور شیاطین کے سردار ابلیس کا!

ابلیس بھی "جن" نامی مخلوق ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اللہ نے جب یہ حسین و جمیل اور آراستہ و پیراستہ دنیا بنائی تو پہلے اس کو جنوں سے بسایا، مگر انہوں نے خدا کے سامنے جھکنے کے بجائے سرکشی کا ثبوت دیا اور تکبر کی راہ اختیار کی، اس لئے خدا کے حکم سے جنوں کو الگ اور سرکش پہاڑوں اور جنگلوں میں قیام کا حکم دیا گیا، انہیں میں ابلیس تھا، یہ بظاہر اپنی قوم سے جدا گانہ مزاج رکھتا تھا۔ مطیع و فرمانبردار اور عبادت گزار، اللہ تعالیٰ گو اس کی باطنی کیفیت سے واقف تھے، لیکن ظاہری حالات کی رعایت سے اس کا درجہ بلند کیا گیا اور اسے عالم بالا میں جگہ دی گئی، اب یہ فرشتوں کا مصاحب تھا اور مقربین بارگاہ الٰہی کے ساتھ رہتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آب و خاک کی اس دنیا میں نئی بستی بسانے کی غرض سے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا۔ جہاں مٹی کو آپ کا مادہ تخلیق بنایا، وہیں علم و تحقیق کی صلاحیت حضرت انسان کی سرشت میں داخل فرمائی، پھر خالق کائنات کی طرف سے انسان کی عظمت اس طور ظاہر کی گئی کہ فرشتگانِ عالم بالا کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ ریز ہونے کا حکم فرمایا گیا، یہ حکم فرشتوں کو بھی ہوا اور شیطان کو بھی، فرشتے تو فوراً سر بسجود ہو گئے، لیکن ابلیس نے "انا" (جو اب تک بے نقاب نہ ہوئی تھی) کے باب اختیار کی، اس نے آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کبر پر اتر آیا۔ پھر جب اللہ کی طرف سے

وجود عطا کیا اور فرشتوں پر اس کا افتخار کھل کر آیا تو جب بھی اسے کوئی چیز پیش آتی ہوئی اور تکبر و ظلم نے احساس سے وہ اپنے آپ کو فارغ نہیں کر پایا۔ چنانچہ ایک حد تک اس نے باری تعالیٰ کو قصور وار قرار دینے کی جسارت کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا۔ اس سے مقرب ہے۔ اس لئے اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز کرنا اس کی تحقیر اور اہانت اور گویا اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس نے یہ نہ سمجھا کہ رب کائنات ہی تمام مخلوقات کا مالک ہے اور وہ جس کے لئے جو درجہ و مقام متعین کرے وہی اس کا صحیح اور اصل مقام ہے۔ یہ ایک کردار ہے جس میں کبر ہے۔ "انا" کی پرستاری ہے۔ اعتراف حقیقت سے پہلو تہی اور خسران و محرومی کے اسباب کو اپنے بجائے دوسروں میں تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

دوسرا کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اس اعزاز و اکرام کے بعد جنت میں رکھے گئے۔ جنت صرف راحتوں اور نعمتوں کی جگہ ہے۔ جہاں نہ غم امروز ہے اور نہ فکر فردا۔ لیکن انسان "انس" سے ماخوذ ہے۔ اس لئے وہ کسی "انیس" کے بغیر ہمیشہ بے سکون ہی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک "انیس" بھی عطا فرمایا۔ آپ کے وجود ہی سے آپ کے جوڑے حضرت حوا کی تخلیق فرمائی۔ اب اس مقدس جوڑے کو جنت میں اس جوڑے کو سب کچھ میسر تھا۔ وہ بھی جو چاہتے اور وہ بھی جو تصور سے بالاتر ہو۔ البتہ ایک پھل کھانے کی ممانعت تھی۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہو چکا تھا۔ وہ گو وہاں سے نکالا گیا تھا مگر اس کا وسوسہ بھی آسمان بلکہ جنت تک پہنچ سکتا تھا تو اس مقدس جوڑے انسانی جوڑے نے بھول کی اور وسوسہ شیطانی کا شکار ہو کر اس شجر ممنوعہ سے کھا لیا۔ پھر کیا تھا؟ پہلے لباس جنت اترا اور پھر "بڑے بے آبرو ہو کر تیری جنت سے ہم نکلے" کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام زمین پر اتارے گئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہندوستان ہی کے کسی علاقہ یا سری لنکا میں ہوا تھا۔ حدیث میں آیا کہ حضرت آدم کو اتارے جانے کے بعد اپنے خدا سے ... نکلے اور پیچھے ہاتھ پھیلایا اور بہت ہی نوحہ زاری اور گریہ کیا کہ تو بہ قبول ہو ... یہ بھی عرض کر تھے کہ ... یہ آپ کا قصور نہ تھا ... سب شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ ہے۔ لیکن

حضرت آدم پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ ان سے بڑھ کر خدا شناس کون ہو سکتا ہے اور بندگی کا مرتبہ شناس۔ حضرت آدم علیہ السلام نے دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں اللہ تعالیٰ کی ناخوشنودی کی وجہ کو تلاش کیا اور نہایت فروتنی سے عرض گزار ہوئے: ”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر خود ہی بڑا ظلم کیا ہے، اگر آپ ہمیں معاف نہ فرمادیں اور رحم و کرم کا معاملہ نہ فرمائیں تو ہم بے شبہ سخت نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔“ (الاعراف: ۲۳) غور کیجئے! اس دعا میں کس قدر عجز و انکسار اور قصور کا اعتراف ہے! سراپا اعتراف و اقرار، نہ ایک حرف شکوہ نہ کوئی کلمہ اصرار!!

یہ دو کردار صرف حضرت آدم اور ابلیس کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام انسان انہی دو میں سے ایک کردار ادا کرتے ہیں۔ جس شخص میں جتنی آدمیت جتنی زیادہ ہوگی، وہ حقیقتوں کے اعتراف میں اسی قدر وسیع الظرف ہوگا، عجز و فروتنی اس کے ایک ایک عمل سے نمایاں ہوگی، وہ ان کے بارے میں بھی انکسار کا مظہر ہوں گے۔ اس کی چال بھی شرافت اور بندگی کی شہادت دے گی، وہ دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا عادی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل و توجیہ کے بجائے اپنے آپ میں کمی کو تلاش کرنے کا عادی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل و توجیہ کے بجائے سیدھے سادے طریقے پر اعتراف کا مزاج رکھتا ہوگا، وہ اپنی خطاؤں پر نادم اور پشیمان ہوتا رہے گا، خطا [illegible] اس کو قبول کرتا رہے گا، خدا کے سامنے بھی اور مخلوق خدا کے سامنے بھی۔ جس شخص میں آدمیت کا عنصر جتنا کم ہوگا اور وہ شیطان کے مزاج سے جس قدر قریب ہوگا، اس میں ”انا“ کا جذبہ اتنا ہی زیادہ ہوگا، اسے اپنی غلطیوں کے اعتراف اور حقیقتوں کے اقرار کا حوصلہ نہ ہوگا، وہ ہمیشہ کسی واقعہ میں اپنی کوتاہی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے گا، اسے دوسروں کے سر منڈھنے میں ذوق اور حقیقت کا اعتراف کرنے میں عار ہوگی، اصولوں [illegible] میں اسے سبکی محسوس ہوگی، اس کی رفتار و گفتار سے ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو [illegible] سمجھتا ہے اور دوسروں کو حقیر جانتا ہے۔

اعتراف اور تواضع سے آدمی کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور وہ خدا اور خلق خدا دونوں

کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے، اور انکار و کبر کی وجہ سے کبھی اس کی شخصیت کی اصلاح نہیں ہوتی، خدا بھی اس سے ناراض ہوتا ہے، اور اگر خلق خدا وقتی طور پر کسی مجبوری کی وجہ سے زبان نہ کھولے، لیکن وہ اس کی نگاہ میں مغضوب ہی ہوتا ہے، ہر شخص ان دو کرداروں میں سے ایک سے قریب ہے۔ آیئے! ہم اپنا محاسبہ کریں کہ ہمارا رویہ حضرت آدم سے کتنی مطابقت رکھتا ہے اور اگر ہم اپنے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے اسوہ سے دور ہیں تو کیا ہم اپنی اصلاح کے لئے تیار ہیں؟؟

(۲۳ جنوری ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

قرآن مجید اور ہماری ذمہ داریاں

امام عبد اللہ بن مبارک اعلیٰ درجے کے فقیہ اور محدث ہیں، امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں ہیں، اور کتنے ہی محدثین وفقہاء کی چشم عقیدت کا سرمہ ہیں، انھوں نے اپنے آپ پر گزرا ہوا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جس کو بہاء الدین (م ۸۵۰ھ) نے اپنی معروف کتاب ''المستطرف'' (۱/۶۲۔۶۴) میں ذکر کیا ہے، یہ ایک بار حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے، واپسی میں راستہ میں ایک جگہ دور سے کوئی چیز نظر آئی، قریب پہنچے، اور پوچھا تو دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون ہیں جو اونی کرتے اور اونی دوپٹے میں ملبوس ہیں، امام عبد اللہ بن مبارک نے سلام کیا، خاتون نے سلام کا جواب ایک قرآنی فقرہ سے دیا ''سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ (یٰس: ۵۸) سلامتی ہو، یہ رب رحیم کی طرف سے ارشاد ہے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا: یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟ کہنے لگیں: مَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ (الاعراف: ۱۸۶) جسے اللہ راستہ نہ دکھائے اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔'' یعنی یہ راستہ بھٹک گئی ہیں، ابن مبارکؒ نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ کہنے لگیں: سبحان الذي أسرى بعبده ليلا من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى (الاسراء: ۱) ''یعنی یہ حج کر چکی ہیں اور بیت المقدس کا ارادہ ہے، ابن مبارکؒ نے استفسار کیا کہ کتنے دنوں سے آپ اس مقام پر پڑی ہوئی ہیں؟ خاتون نے کہا: ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (مریم: ۱۰) یعنی مسلسل تین راتوں سے، ابن مبارکؒ نے کہا: آپ کے پاس کھانے کا کچھ سامان نہیں ہے؟ خاتون نے جواب دیا: هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ (الشعراء: ۷۹) یعنی اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

پوچھا گیا کہ آپ وضو کس طرح کرتی ہیں جب کہ پانی بھی ساتھ نہیں ہے؟ فرمایا: فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا (النساء: ۴۳) یعنی قرآن کا حکم ہے کہ پانی نہ

سے تو تیمم کرو، اس پر عمل کر رہی ہوں۔ امام ابن مبارکؒ نے کھانے کی پیش کش کی تو کہنے لگیں: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (البقرۃ: ۱۸۷) یعنی میں روزہ کی حالت میں ہوں۔ ابن مبارکؒ نے کہا کہ یہ رمضان کا مہینہ تو ہے نہیں؟ فرمایا: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ: ۱۵۸) یعنی جو بطور نفل خیر کا عمل کرے تو اللہ تعالیٰ قدر دان ہے اور واقف ہے۔ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ سفر میں تو ویسے بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ: ۱۸۴) یعنی روزہ رکھ لینا بہرحال بہتر ہے۔

امام عبداللہ بن مبارکؒ کے حیرت و استعجاب میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آپ نے دریافت کیا کہ جس طرح میں آپ سے گفتگو کر رہا ہوں آپ بھی اس طرح کیوں نہیں کرتیں؟ جواب ملا: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق: ۱۸) یعنی جب بھی انسان کوئی بات کرتا ہے تو نگران فرشتہ اس پر موجود ہوتے ہیں، گویا بات خوب احتیاط اور تول کر کرنی چاہیے۔ ابن مبارکؒ نے دریافت کیا کہ آپ کا تعلق کس قبیلہ سے ہے؟ فرمایا: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء: ۳۶) کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، گویا ابن مبارکؒ کے اس سوال پر بوڑھی خاتون نے ناگواری ظاہر کی۔ امام عبداللہ نے معذرت کی اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ جواب ملا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ (یوسف: ۹۲) کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تم کو معاف کر دے۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں: میں نے دریافت کیا کہ کیا میں آپ کو اپنی اونٹنی پر سوار کر دوں تا کہ آپ اپنے قافلہ سے جا ملیں۔ کہنے لگیں: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (البقرۃ: ۱۹۷) جو بہتر کام کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔ ابن مبارکؒ نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا تا کہ وہ سوار ہوں، کہنے لگیں: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور: ۳۰) یعنی ابن مبارکؒ کو نگاہ پست کرنے کے بارے میں اشارہ فرمایا، چنانچہ آپ نے نگاہ پست کر لی اور کہا کہ سوار ہو جائیں۔ سوار ہونے لگیں تو اونٹنی بدک گئی اور اس خاتون کا کچھ کپڑا پھٹ گیا تو قرآن کی آیت پڑھی: وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ: ۳۰) یعنی جو

بھی مصیبت انسان کو پہنچتی ہے وہ اپنی شامت اعمال کی وجہ سے، امام عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیں، میں پہلے اونٹنی کو بٹھا دوں، خاتون نے کہا: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ (الانبیاء ۷۹) امام ابن مبارکؒ فرماتے ہیں میں نے اونٹنی کو بٹھا دیا اور ان سے کہا کہ سوار ہو جائیں، جب سوار ہو گئیں تو سواری کی دعا پڑھی جو قرآن مجید کی آیت ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (الزخرف ۱۳،۱۴)

اب سفر شروع ہوا، امام ابن مبارکؒ نے اونٹنی کی لگام تھامی، اور اونٹنی کو تیز چلانے کے لئے کسی قدر بلند آواز لگاتے ہوئے آگے بڑھے، خاتون نے کہا: وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (لقمان ۱۹) یعنی رفتار معتدل رکھو اور آواز پست۔ ابن مبارکؒ نے آہستہ آہستہ: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل ۲۰) پڑھا کہ آپ کو بڑا خیر عطا کیا گیا ہے، کہنے لگیں: وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (البقرۃ ۲۶۹) کہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں، امام ابن مبارکؒ نے کچھ آگے بڑھنے کے بعد دریافت کیا کہ کیا آپ کے شوہر ہیں؟ بڑی بی خاتون نے جواب دیا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدۃ ۱۰۱) اے ایمان والو! ایسی چیزوں کی بابت سوال نہ کرو جو تم پر ظاہر کیا جائے تو تمہیں ناگوار ہو۔ یعنی اپنے بیوہ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

امام ابن مبارکؒ نے پھر کوئی گفتگو نہیں کی، یہاں تک کہ قافلہ تک پہنچ گئے، پہنچنے کے بعد خاتون سے دریافت کیا کہ یہاں آپ کے کون لوگ ہیں؟ کہنے لگیں: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (الکہف ۴۶) یعنی اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ان کے بچے اور سامان اس قافلہ میں ہیں، میں نے دریافت کیا کہ حج میں ان کے بچے کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگیں: وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (النحل ۱۶) یعنی ان کے بچے حجاج کے قافلہ میں راستہ بتانے اور منزل کی رہنمائی کا کام کرنے پر مامور تھے۔ ابن مبارکؒ سواری خیموں تک لے گئے، اور استفسار کیا کہ یہ خیمے ہیں، آپ کے متعلقین کون ہیں؟ خاتون نے کہا: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا (النساء ۱۲۵) وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِیْمًا

(البقرہ: ۱۲۰)، یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (مریم: ۱۲)۔ یحییٰ، ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ میرے بچوں کے نام ہیں۔ ابن مبارکؒ نے ان ہی ناموں سے ندا لگائی، کہ تین نوجوان چاند کی طرح روشن دوڑتے آئے، اور جب بیٹھ گئے تو اس نے کہا: فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (الکہف: ۱۹) "اپنے میں سے کسی کو یہ پیسے لے کر شہر بھیج دو، دیکھے کہ کون پاک و صاف کھانا فروخت کرنے والا ہے، پھر وہ تم لوگوں کے پاس کھانے کی چیز لے کر آئے، چنانچہ بچوں میں سے ایک بازار گیا، کھانے کی کچھ چیز خرید کر لایا اور میرے سامنے رکھ دیا، کہنے لگیں: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (الحاقہ: ۲۴) "خوشگواری کے ساتھ کھاؤ پیو، اس عمل کے بدلے جو تم نے پچھلے دنوں میں کئے ہیں۔

امام عبداللہ ابن مبارکؒ نے ان خاتون کے صاحبزادوں سے کہا کہ جب تک تم ان خاتون کے بارے میں مجھے نہ بتاؤ، میں کھانا نہیں کھا سکتا، لڑکوں نے کہا: یہ ہماری والدہ ہیں، چالیس سال کے عرصے سے انہوں نے سوائے قرآن کے کوئی اور کلام اپنی زبان سے نہیں نکالا کہ کہیں اپنی طرف سے بولنے میں کچھ دروغ گوئی ہو جائے اور اللہ ناراض ہو جائے۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جسے چاہیں عطا فرمائیں، اور اللہ بڑے فضل والے ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الجمعہ: ۴) یہ واقعہ نشانِ عبرت اور حرفِ موعظت ہے کہ معمولی خاتون کو بھی قرآن سے کیسی مناسبت ہوتی تھی، اور قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے فہم کا کیسا اعلیٰ درجے کا ذوق حاصل ہوتا تھا، کاش ہم یہ اور اس طرح کے عبرت خیز واقعات کو اپنے لئے آئینہ بنائیں، اور اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں کہ قرآن مجید سے ہمارا کیا تعلق ہے؟

(۲۹/۱۱/۲۰۰۳ء)

انٹرنیٹ کے ذریعہ تحریفِ قرآن کی سازش

اللہ تعالیٰ نے جب اس وسیع کائنات میں انسانوں کی بستی بسائی تو جیسے ان کی مادی غذا کا سروسامان کیا، ویسے ہی اس کی روحانی غذا اور نشوونما کا بھی انتظام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے انسانوں ہی میں سے اپنے رسول بھیجے، حضرت آدم علیہ السلام جیسے پہلے انسان تھے ویسے ہی پہلے نبی بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنی کتابیں بھی اتاریں، لیکن انسان کی گنہگار طبیعت نے ہمیشہ اپنی ترمیموں اور اضافوں کے ذریعہ ان کتابوں کو گم کر دیا، نبوت اور نزولِ کتاب کا یہ مبارک سلسلہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اختتام کو پہنچا اور کتبِ ہدایت کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن مجید کی صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوا، چونکہ یہ خدا کی آخری کتاب ہے، اور انسان کو قیامت تک ہدایت کے لئے اس کتاب کی ضرورت ہے، اس لئے خالقِ کائنات نے خود ہی اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اور ارشاد ہوا: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: ۹) کہ ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، یہ خدائی وعدہ آج تک اتنے عظیم الشان طریقہ پر پورا ہو رہا ہے کہ کوئی بھی حقیقت پسند شخص اگر صرف حفاظتِ قرآن کے اس الٰہی نظام پر غور کرے تو شاید یہی اس کے ایمان کے لئے کافی ہو جائے۔

قرآن مجید جس دور میں نازل ہوا جو کاغذ اور پریس کا دور نہیں تھا، اور خاص کر عرب کا علاقہ تو اتنا غیر متمدن تھا کہ تحریر و کتابت کے ذوق سے قریب قریب بالکل ہی نا آشنا تھا، چند گنے چنے لوگ تحریر سے واقف تھے، عربی تحریر کا فن بھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا، بہت سے حروف ایسے تھے کہ ان کے درمیان باہم کوئی امتیاز نہیں تھا، حروف کی حرکات اور صوتی کیفیات کو ظاہر کرنے کی کوئی علامت نہیں تھی، عربی زبان کے قواعد بھی مرتب نہیں ہوئے تھے، قرآن مجید نہ صرف خدا کی آخری کتاب ہے، بلکہ یہ عربی زبان کی پہلی کتاب بھی ہے، قرآن سے پہلے

عربی زبان میں شعراء کے دیوان اور خطباء کے زریں اقوال سینہ بہ سینہ نقل ہوتے آرہے تھے، لیکن کسی باضابطہ تحریر کا کوئی رواج نہیں تھا۔

قرآن کے نازل ہونے کا سلسلہ جب شروع ہوا تو تحریر کا ذوق بڑھا اور ایسا بڑھا کہ آپ تئیس برس میں سے زیادہ تر مصحف کا تعین ہو چکا ملتا ہے۔ پھر جب قرآن عرب کی حدود سے نکل کر عجم کے علاقوں تک پہنچا تو حروف کی شناخت کے لئے نقطے ایجاد ہوئے، حرکات اور صوتی کیفیات کو ظاہر کرنے کے لئے زیر، زبر، پیش، سکون اور تشدید کی علامتیں قائم ہوئیں۔ وہ جو عرب زبان نہیں جانتے تھے ان کی آسانی کے لئے عربی گرامر کی ترتیب عمل میں آئی۔ یہ سب پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ڈیڑھ نصف صدی کے اندر ہی ایجاد پذیر ہوا، اور عربی خط کو یہ ارتقاء حاصل ہوا کہ جو آج عربی تحریر میں ہے، اور جو تحریر اس سے مختلف ہے، کسی اور زبان میں شاید اس کا کوئی فیصد بھی نہ ہو، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

پھر قرآن کی حفاظت بھی کس شان سے ہوئی، اگر ذرا غور سے کام لیجئے تو بے اختیار قدرت خداوندی پر حیرت و استعجاب کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں۔ حافظوں نے اس کے الفاظ کی حفاظت کی، آج آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، کتنے ہی حافظ قرآن آپ کو مل جائیں گے، ان میں بہت سے کم عمر بچے بھی ہوں گے، جو ڈھنگ کی گفتگو بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن کا ایک ایک حرف ان کے سینے میں محفوظ ہے، اگر کسی نماز میں حافظ نے قرآن پڑھنے میں غلطی کی تو پیچھے ہی سے کئی لقمہ دینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں، اور کسی بڑے مجمع میں قرآن پڑھنے میں غلطی ہوتی تو سیکڑوں آوازیں اصلاح کے لئے بلند ہو جاتی ہیں، اگر کسی شخص نے ایک لفظ کے چھوٹنے کی غلطی کی تو خطوط اور احتجاجات کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ معذرت چاہے بغیر چارہ نہیں۔

جیسے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا سرا ان حفاظ کے ذریعہ ہوا، اسی طرح قرآن کے لب و لہجہ اور اس کے اسلوب تلاوت کی حفاظت مجودین و قاریوں کے ذریعہ عمل میں آئی، تجوید نے یہ بتایا کہ اس طرز ادائیگی کو نقل و حکایت کیا جو صحیح طور پر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا، پھر قرآن کا خط بھی ایسا نہیں کہ جس میں ہم آزاد ہوں، بلکہ اس کا رسم الخط بھی توقیفی

ہے، اور اس خط کی بھی ابتدائی دور سے آج تک حفاظت ہوتی رہی ہے۔ محدثین اور مفسرین نے قرآن کے معنی کی حفاظت کا سامان بہم پہنچایا، اور کسی روایت کے بغیر ہر دور میں ہر طرح کے آزاد فکر اہلِ علم پر گہری نظر رکھی، اور معنوی اعتبار سے باطل کی آمیزش سے معانیِ قرآن کو محفوظ رکھا۔ عربی زبان اور عربی زبان کے اسلوب و لہجہ کا آج تک محفوظ رہنا جس میں قرآن مجید نازل ہوا، بجائے خود ایک بڑا معجزہ ہے۔

دنیا میں کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں کہ خود اس مذہب کے ماننے والے بھی اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ قرار دیں۔ ہندو بھائیوں کے یہاں سب سے معتبر کتابیں وید ہیں، لیکن ویدوں کی تعداد اور جن ویدوں کو آج کل معتبر مانا جاتا ہے، ان کے اشلوکوں کی تعداد میں بھی سخت اختلاف ہے، پھر یہ بھی متعین نہیں کہ یہ کتابیں ان کے عقیدہ کے مطابق کن شخصیتوں پر اتاری گئیں، پھر جن شخصیتوں کا نام لیا جاتا ہے، وہ نہ صرف تاریخ کے اعتبار سے تاریکی میں ہیں، بلکہ خاص ان کی کتابوں میں بھی اس اہمیت کے ساتھ ان کا ذکر نہیں ملتا۔ مسلمانوں کے سوا دنیا میں دو آسمانی مذاہب ہیں، ایک یہودی، دوسرے عیسائی، مجموعی طور پر یہ آج بائبل کو الہامی کتاب قرار دیتے ہیں، لیکن خود اہلِ مذہب کے نزدیک ان کتابوں کا تحریف شدہ ہونا قریب قریب ایک مسلّم امر ہے، اور اس سلسلہ میں اتنی تاریخی اور داخلی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، نیز یہ خود بھی معترف ہیں کہ یہ کتابیں جس زبان میں نازل ہوئیں، اب اس زبان میں ناپید ہیں، اور ان کا ترجمہ در ترجمہ نئی اصلاحات و ترمیمات کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفوں پر شائع ہوتا رہتا ہے۔

دنیا میں قرآن ہی ایک ایسی الہامی کتاب ہے، جو بالکل بے آمیز اور محفوظ ہے۔ قرآن مجید کا وہ نسخہ جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا اور شہادت کے وقت آپ اسے تلاوت کر رہے تھے، ٹوپ کاپی سرائے میوزیم استنبول (ترکی) میں ابھی تک محفوظ ہے، جو ہرن کی کھال پر ہے۔ اور اس میں سورۂ بقرہ کی آیت "فسیکفیکھم اللہ" پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ شہادت کی چھینٹیں موجود ہیں، اس نسخہ میں اور آج کے مروجہ نسخہ میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، اس چیز نے اسلام سے عقیدت رکھنے والی قوموں کو ہمیشہ سہارا دیا ہے، انہوں نے

کبھی قرآن کی صحت کو مشکوک کرنے کی کوشش کی ہے، کبھی متن میں لفظی تبدیلی کی اور کبھی الفاظ میں ملاوٹ و تحریف کی۔ شاید یہاں دانش ابھی اس واقعہ کو نہ بھولے ہوں کہ جب مصر میں جمال عبدالناصر حکمران تھے تو اسرائیل نے بڑی تعداد میں تحریف شدہ قرآن مجید طبع کیے اور اسے پھیلانے کی کوشش کی اور مقاصد ان کا بالکل قابل تعجب نہیں، کیونکہ انبیاء کی اہانت اور آسمانی کتابوں میں تحریف ہمیشہ ان کے آباء و اجداد کا قدیم شیوہ رہا ہے۔ اس موقع پر جمال عبد الناصر نے قرآن مجید کے درست نسخے بڑی تعداد میں چھپوا کر عالم اسلام اور عالم اسلام سے باہر بڑی تعداد میں شائع کیے، تاکہ اس کی تلافی ہو، جمال عبدالناصر کے تمام اعمال میں یہی ایک عمل خیر کا ہوگا اور اگر کوئی عمل ان کے لئے باعث مغفرت ہو سکتا ہے تو شاید وہ یہی عمل ہو۔

اب یہودی اور نصرانی قوموں کا بغض ایک نئی صورت میں سامنے آ رہا ہے، اور یہ کام نظر آنے والے ہاتھوں سے کرایا جا رہا ہے، اور یہ ہیں "انٹرنیٹ" کے ہاتھ۔ انٹرنیٹ کی ویب سائٹ WWW.E:ASPACE.DIAL.PIPES COM.TOWN/PARKGEO98/ORIGINAL پر قرآن کی سورتوں کے عنوان سے مختلف کئی عبارتیں درج ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے رکیک اور فکر و نظر کے اعتبار سے گری ہوئی عبارتیں آ رہی ہیں۔ اس وقت ایک دردمند بھائی کے بھیجے ہوئے فوٹو اسٹیٹ صفحات میرے سامنے ہیں، جن میں سورۃ الایمان، سورۃ المسلمون، سورۃ الوصایا، اور سورۃ التجسد کے عنوان سے عبارتیں ہیں، ان کو قرآنی اصطلاح "سورۃ" کہتے ہوئے دل خون ہوتا ہے، لیکن محض حکایت واقعہ کے طور پر یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ الایمان میں دس، المسلمون میں گیارہ، الوصایا میں سولہ اور التجسد میں چودہ فقرے ہیں۔ یہ قافیہ بند فقرے ہیں، اور قرآن کے اسلوب بیان کی رعایت کے ساتھ انہیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اور جگہ جگہ قرآنی کلمات کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان عبارتوں میں بار بار نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرزند الٰہ ہونے، ان کے بقول بشر کا کفارہ بن کر پھانسی پر چڑھ جانے، رسول اللہ ﷺ کے نعوذ باللہ تالیف قرآن میں دروغ گوئی سے کام لینے وغیرہ کا ذکر ہے، غرض یہ تمام بے ہودہ اور باطل افکار و خیالات کی ترجمانی ہے جو ان تحریف شدہ بیانات کا حصہ ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے، اس لئے

حاسدین کا مسئلہ، معاندین کی عناد اسے کسی قطار شمار میں نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن ایک تو اپنی اس نوجوان نسل کو سمجھنا قابلِ فکر ہے جس نے نہ اسلام کو پڑھا ہے اور نہ اسے بہت دینی ہے اور تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے تو مغرب کے اس غیر معیاری اور تنگ نظری پر مبنی لٹریچر کو جو کوتاہ علموں کو پالی نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں سراب کی سراب ہے۔ کہ قرآن کے نام پر ایسے بے ہودہ خیالات اس کے انگریزی تراجم اور ترجمہ و تشریح کے ساتھ ذریعہ سے مغالطہ انگیز حوالہ جات میں اس بے خبر نسل کو گمراہ کر رہے، دوسرے گمراہی کی تشہیر ... تحریروں کو رد کرنے کا کوئی ذریعہ اختیار کیا جائے تو خطرہ ہے کہ یہ آگ پھیل جائے۔ دونوں ملکوں کے لئے مذہبی تحریروں پر مشتمل لٹریچر فراہم کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

اس لئے مسلمانوں کا ایسے فتنوں سے باخبر اور ان کی سازشوں سے آگاہ ہونا بہت نہایت ضروری ہے، حکومت سے بھی نمائندگی کی ضرورت ہے کہ اس دل آزار اور گمراہ کن ویب سائٹ کو بند کیا جائے۔ اگر بروقت ایسے فتنوں کی خبر نہ لی جائے تو اس سے بڑے فتنوں کا اندیشہ ہے۔ قرآن یقیناً قیامت تک محفوظ رہے گا اور وہ اپنی حفاظت میں ہماری محتاج نہیں، لیکن ہم اپنی کوتاہی اور کمزوری کی وجہ سے اس کے گنہگار ہیں کہ ایسی معاندانہ سازشوں سے بے خبر یا بے شعور رہیں اور ان کے خلاف جدوجہد نہ کریں۔ حفاظتِ قرآن کے عظیم نظم کا ایک حصہ بنیں، اور خدا کے دربار میں ہمارا شمار بھی ان بندوں میں ہو جنہوں نے اس کتاب کی حفاظت کے لئے کچھ نہ کچھ کاوش کی ہے۔

{۳، مارچ ۲۰۰۱ء}

شبِ قدر ــــ انسانیت کی شبِ نجات

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی بات ہے، دنیا ظلم وجور کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ کوئی برائی نہ تھی جس سے انسانی معاشرہ محفوظ ہو، پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور سیاروں، چاند، سورج اور ستاروں، یہاں تک کہ انسان کے اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے بتوں اور مورتیوں جیسی بے جان چیزوں کے سامنے بھی انسان اپنی جبینِ احترام کو خم کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا، ہمارے ملک میں ہر طبقے نے اپنے لئے خداؤں کی ایک فوج تیار کی ہوئی تھی۔ اسی شرک وبت پرستی نے لوگوں کو توہم پرست بنادیا تھا، اور ہر چیز میں "نحس" کے تصور نے انسان کو ارادہ وعمل کی قوت اور تحقیق واکتشاف کے حوصلے سے محروم کردیا تھا، لیکن ظاہر ہے جو انسان کائنات کی ہر چیز کو مقدس خیال کرنے لگے، بلکہ اس کی عبادت وبندگی کرنے لگے وہ تحقیق وتفتیش کا عمل کس طرح جاری رکھ سکتا ہے؟

باہمی ظلم وجور اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ راستے بھی شہر باہر کے افراد وقافلوں کے لئے خطرہ تھے، مسافروں کی نہ جان محفوظ تھی، نہ مال محفوظ تھا اور نہ عزت وآبرو، بڑے بڑے قافلوں کی رفاقت کے بغیر کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جاسکتا تھا، لوگوں نے بطور خود انسانیت کو مختلف طبقات میں بانٹ رکھا تھا، پیدائشی طور پر کچھ لوگ باعزت تصور کئے جاتے تھے اور کچھ لوگ بالکل محروم، اسی فرق نے سب سے زیادہ جہاں اپنا رنگ جمایا وہ ہمارا ملک ہندوستان ہے، یہاں انسانیت چار ذاتوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، برہمن سب سے اونچے خیال کئے جاتے تھے، ان کے بارے میں تصور تھا کہ وہ خدا کے سر سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ان کے بعد چھتری کو تھا جن کے ذمہ ملک کے دفاع کا کام تھا، تیسرا درجہ ویش کا تھا جو ملک کی تجارت وزراعت اور صنعت سے وابستہ تھا۔

سب سے کمتر وہ لوگ تھے جو "شودر" کہلاتے تھے، ان پر تعلیم کا دروازہ بند تھا، ان

کے لئے مخصوص تھے۔ اگر وید کی عبارت بھی کان میں پڑ جاتی تو ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ یہ نیچی ذات کے لوگوں کے سامنے برابری اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ جس جرم پر اونچی ذات کے لوگوں کو معمولی سزائیں دی جاتی تھیں اسی جرم پر شودر قتل کے حقدار سمجھے جاتے۔ ایران میں شاہی خاندان کو خدا کا مظہر تصور کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور امراء و پیر علاوہ دوسروں کے مال سے اپنے سر کو زینت دیتے اور ایران کے کسان اور مزدور سرکاری ٹیکسوں کے بوجھ سے پریشان ہو کر جنگلات کی پناہ لیتے۔ عرب میں عربی اور عجمی نسل کی تقسیم تھی۔ غیر عرب کو حقارت اور ذلت سے دیکھا جاتا تھا۔ غلام اور عورتیں دنیا میں سب سے زیادہ پسماندہ طبقات تھے۔ عرب کا یہ حال تھا کہ غلاموں کو باندھ کر ان پر نشانہ لگاتے۔ یورپ میں بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں درندوں کو غلاموں سے مقابلہ کرایا جاتا اور ان کی ہلاکت کا تماشہ دیکھا جاتا۔ یہ کھیل "سپانی" کہلاتا اور بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا۔ عورتوں کا حال یہ تھا کہ ایران کے علماء و فلاسفرز کے یہاں یہ بحث جاری تھی کہ کیا عورت میں وہی روح ہے جو مردوں میں ہے؟ یونان میں عورتوں کو گناہ کا دروازہ قرار دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں بیوی شوہر کی ملکیت تھی اور وہ شوہر کے ساتھ نذر آتش کر دی جاتی تھی۔ وہ کسی جائیداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی اور نہ میراث کی حقدار تھی۔ پوری دنیا میں عورتوں کا حال اس سے مختلف نہیں تھا۔

جب انسانی تمدن پوری طرح تنزل رسیدہ ہو چکا اور جہالت کی گھٹا دنیا کے افق پر پوری طرح چھا گئی تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، رات کا وقت اور غار حرا میں تاریخ کائنات پر رحمت کی گھٹا چھائی، اور جبرئیل امین "حرا" کی سمت اترا، پیغمبر اسلام محمد ﷺ پر پہلی وحی اتری۔ یہ خدا کا آخری پیغام تھا اور قیامت تک کے لئے تھا۔ اس کتاب نے سب سے پہلے انسانیت کو جس بات کی دعوت دی وہ تھی پڑھنے کی، علم کی، لکھنے کی، قلم پکڑنے کی۔ کہ جب علم کی شمع روشن ہوگی اور فکر و نظر کا چراغ جلے گا تو خود بخود اندھیریاں چھٹ جائیں گی اور جہالت کے تمام پردے چاک ہوں گے، ظلم و ناانصافی کا دروازہ بھی بند ہوگا، شر کے ہر دروازے کا بھی خاتمہ ہوگا اور انسانیت کو امن و شانتی، سکون قلب، سلامتی فکر و نظر، اخوت و بھائی چارگی، محبت و الفت اور انسانیت کی متاع گراں مایہ ہاتھ آئے گی۔

چنانچہ قرآن مجید نے ایسا بھاری ترین انقلاب دنیا کو عطا کیا کہ جو اسلام سے پہلے پورے مکہ میں صرف تین یا اس سے کچھ زیادہ افراد تھے جو لکھنا جانتے تھے، یا وقت آیا کہ مکتبوں کا بان دانوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی، تحقیق کائنات اور سائنسی انداز سے غور و فکر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسلام کے اس تصور سے کہ پوری کائنات انسان کی خادم ہے، کائنات کی ہر شے کے بارے میں تحقیق و تفتیش کا حوصلہ پیدا ہوا، انسانی مساوات و برابری کے عقیدہ نے اتنا اثر و رسوخ حاصل کیا کہ طبقاتی تقسیم اور تفریق کے تصور نے پوری دنیا میں منہ چھپانا شروع کر دیا، عورتوں کو اسلام کی تاریخ میں پہلی بار عزت و احترام کا مقام حاصل ہوا اور ہر شعبۂ زندگی میں ایسا متوازن قانون عطا ہوا کہ آج آئین عالم اس کی خوشہ چینی سے چارہ نہیں پاتے، غلاموں کو انسانوں کا درجہ عطا کیا گیا اور چند صدیوں میں بتدریج غلاموں کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا، یہاں تک کہ جانوروں اور چرند و پرند کے بھی حقوق متعین ہوئے اور ان کے بارے میں بھی انسان کو بے قید نہیں رکھا گیا۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ بنیادی طور پر اس کتاب نے دو باتوں کی دعوت دی۔ وحدت الٰہ اور وحدت انسان۔ یعنی خدا ایک ہے، اللہ کے سوا کوئی نہیں جو عبادت کے لائق ہو، اور انسانیت بھی ایک ہے، نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیاد پر ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے، حکمراں ہو یا رعایا، دولت مند ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، خالق کائنات کی نگاہ میں یہ سب برابر ہیں، البتہ ہر انسان کے عمل اور اس کی نیکیوں کے اعتبار سے خدا کے یہاں اس کا درجہ متعین ہوگا، شب قدر در اصل اسی عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اور شب قدر کی عبادت اسی انعام خداوندی پر اللہ کا شکر بجالانا ہے، اس لئے یہ صرف دعا کی قبولیت ہی کی رات نہیں، بلکہ تمام انسانیت کے لئے شب نجات ہے، اوہام سے نجات کی رات، انسانی غلامی سے نجات کی رات، طبقاتی ظلم و جور سے نجات کی رات اور جہل و گمراہی سے نجات کی رات۔

(۲۶/جنوری ۱۹۹۸ء)

ہمدردی و غم گساری کا مہینہ

ایک بار ایک صاحب خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، وہ بھوکے تھے، آپ ﷺ سے فاقہ کشی کا ذکر کیا اور کھانے کے خواستگار ہوئے، آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے یہاں خبر بھیجی، قاصد ایک ایک کے یہاں گیا، اور واپس آیا کہ حرمِ نبوت میں کسی کے یہاں سوائے پانی کے کھانے کی کوئی اور چیز نہیں، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے خواہش کی کہ کوئی ان کی مہمان نوازی کرے، ایک صحابیؓ اپنے ساتھ لے گئے، گھر جا کر احوال معلوم کئے، بیوی نے بتایا کہ گھر میں صرف بچوں کی ضرورت کے مطابق کھانے کا سامان ہے، اتنا بھی نہیں کہ ہم لوگوں کے لئے گنجائش نکل پائے، فرمایا: کچھ حرج نہیں، بچوں کو سلا دو، جب بیٹھے سوجا ئیں تو کھانا تیار کرو، کھانا لاکر رکھو اور چراغ درست کرنے کے بہانے چراغ بجھا دو، مہمان خیال کریں کہ ہم لوگ بھی کھانے میں شریک ہیں، حالانکہ ہم لوگ کھانے میں شریک نہ ہوں، چنانچہ خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کی خواستگار اور شوہر کی اطاعت گزار بیوی نے ایسا ہی کیا، مہمانِ رسول ﷺ نے سیر ہو کر کھانا، میزبان خود بھی بھوکے رہے، اور ان کے بچے بھی، اور مہمان پر یہ ظاہر بھی نہ ہونے دیا کہ وہ دوسروں کو بھوکے رکھ کر خود آسودہ ہو رہے ہیں: صبح کو جب میزبان صحابیؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آج شب تم پر ضے اتم سے خوش ہوئے اور یہ آیت نازل فرمائی کہ کچھ لوگ ہیں جو باوجود خود فاقہ کشی سے دوچار ہونے کے اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اور جو شخص بخل سے بچا لیا جائے وہی کامیاب ہے۔ (بخاری، [illegible])

یہ کوئی معمولی کردار نہیں، لیکن اسلام کے عہدِ اول میں ہر جگہ ایسے تابندہ نقوش ملتے ہیں، محبت و غم گساری کے ایثار، ہمدردی اور انسانیت کی غم خواری کے، اور خود یہ

کر دوسروں کو نفع پہونچانے کے، اس کی وجہ یہ تھی کہ توحید اور خدا کی بندگی کے بعد آپ ﷺ سب سے زیادہ جس بات پر زور دیتے تھے، وہ تھی انسانی ہمدردی اور غم گساری ہے، آپ ﷺ کوئی موقع اس کا ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، رمضان المبارک کو آپ ﷺ نے خاص طور پر غم گساری اور مساوات کا مہینہ قرار دیا، اس مہینہ میں انفاق اور اللہ کے بندوں کی اعانت و مدد کی خاص کر تاکید فرمائی، خود آپ ﷺ کے بارے میں روایت ہے کہ اس ماہ مبارک میں انفاق اس قدر بڑھ جاتا کہ گویا تیز ہوا ہو، رمضان المبارک میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد اور اعانت کی خصوصی تاکید وا اہتمام کی وجہ ظاہر ہے، مسلمان غریب ہو یا مالدار، روزہ ہر ایک کو رکھنا ہے، اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے بھوک و پیاس سہنی ہے، یہ بھوک و پیاس اپنے غریب بھائیوں کی فاقہ مستی کی تلخ کامیوں کا احساس دلاتی ہے، جب انسان خود اس راہ سے گزرتا ہے تو ان سے لوگوں کی مشقتیں اس کے لئے ایک " ذاتی تجربہ " بن جاتی ہیں، جن کو بار بار اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور آپ بیتی انسان پر جگ بیتی سے زیادہ اثر ڈالتی ہے، اسی کو کلیم عاجز نے کہا ہے:

پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے
پریشانی ہماری کا کُل محبوب جانے ہے

مواسات و غم گساری کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور ہر شخص کے لئے اس کی حیثیت کے لحاظ سے ہے، تاجر ہو تو گاہک کا خیر خواہ ہو، اسے دھوکہ نہ دے، مناسب سے زیادہ قیمت نہ لے، ڈاکٹر اور معالج ہو تو مریض کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے، علاج کرتے ہوئے خدمتِ خلق کے جذبات کو بھی دل کا رفیق بنائے رہے، غریب مریضوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے، اور تندرستی بیماروں کو سب، پڑوسی ہو تو دیکھے کہ اس کے پڑوسی پر کیا گزر رہی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص جو خود آسودہ ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا۔ اس طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں، جس کا پڑوسی اس

کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ پاتا ہو، یتیموں کی خبرگیری، اور ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنا، بیواؤں اور بے کسوں کی مدد کے لئے آگے بڑھنا، بوڑھوں کو سہارا دینا، اور مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار، یہ سب "مواسات" میں داخل ہے، غرض انسان کی خدمت کو خدا کی عبادت کا سا درجہ دیا ہے، غور فرمائیے! اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھ سکتا تو ہر روزہ کے بدلے ایک محتاج کو دن اور رات کا کھانا کھلاتا ہے، اگر جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ایک روزہ کا کفارہ ساٹھ روزہ رکھنا ہے، اور روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ محتاج شخص کو دو وقت کا کھانا کھلاتا ہے، گویا روزہ جیسی عبادت کو ایک غریب شخص کی مدد کے ہم پلہ رکھا گیا۔

اللہ کی محبت سے اللہ کی مخلوق کی محبت جڑی ہے، اور انسان کو غریبوں کی جھونپڑیوں اور بے کسوں کے غربت کدوں میں اللہ کو "پانے" کا یقین پیدا ہوتا ہے، وہ دوسروں کی ضرورتوں کے مقابلہ اپنی ضرورت کو بھول جاتا ہے، اسے لگتا ہے کہ اپنے دوسرے بھائی کی مدد کی راہ میں کھو دینا پانے سے زیادہ لذیذ ہے، مکہ سے جب اہل ایمان کا لٹا پٹا قافلہ مدینہ پہونچا تو ان کے پاس کچھ نہ تھا، نہ گھر، نہ در، نہ مال و متاع، نہ سامان و اسباب، اہل مدینہ بھی کچھ بہت اہل ثروت نہیں تھے، کچھ باغات اور معمولی سی کھیتیاں، بہتوں کا گزر اوقات مزدوری پر تھا، لیکن آپ ﷺ کی مبارک تعلیمات اور مسعود صحبتوں سے تنگ دستی کے باوجود دل کشادہ رکھتے تھے، اور مواسات و ایثار گویا ان کی جبلتوں میں داخل ہو گیا تھا، اس لئے "غریب بناؤ" مہم چلانے کی حاجت نہ پڑی اور مدینہ کے حوصلہ مندوں نے اپنی پوری کائنات آپ ﷺ کے قدموں میں رکھ دی، اس لئے "انصار" کے لقب سے نوازے گئے، اور نصرت و اعانت کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ شاید ہی اس زمین کے سینہ اور آسمان کے سایہ میں اس کی کوئی اور مثال مل سکے۔

"روزہ" اگر سحر و افطار کا اہتمام پیدا کر دے، چند دنوں کسی قدر ترکی رغبت بھی

ہو جائے، عید کے نئے کپڑے سلائے اور پہنے جائیں، لیکن مواسات، غم خواری کا جذبہ پیدا نہ ہو، بھوکوں، پیاسوں کے دکھ سے دل میں کوئی ٹیس نہ اٹھے، غریبوں اور محتاجوں کی محبت کی کوئی لہر موجزن نہ ہونے پائے اور پریشان حال بھائیوں اور حاجت کے مارے، کچلے لوگوں کے لئے دل دکھی اور آنکھیں اشکبار ہوتا نہ دیکھیں، تو شاید روزے خدا کی ترازو میں ناتمام ہی سمجھے جائیں!!

(۸/نومبر ۲۰۰۲ء)

نیکیوں کی فصلِ بہار

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، جو نیکیوں کی فصلِ بہار ہے اور جس میں دامانِ عمل کو بقدرِ توفیق اس فصلِ گل سے استفادہ کا موقع فراہم کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو اس ماہِ مبارک کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کی آمد سے پہلے ہی آپ ﷺ لوگوں کو اس ماہ کی برکتوں اور سعادتوں کے بارے میں خبردار فرماتے اور عبادت کی طرف خاص طور پر انھیں متوجہ کرتے۔ اس ماہ کا اصل اور بنیادی عمل روزہ ہے، یعنی صبح طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے پینے اور دوسرے نفسانی تقاضوں سے اپنے آپ کو باز رکھنا، یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے، انسان کے لئے گھنٹے دو گھنٹے بھی بھوکا پیاسا دشوار ہو جاتا ہے، بیمار ہو تو پھر مشکل ہو جاتا ہے، دنیا کی ساری لذتیں انہی خواہشات سے متعلق ہیں، آدمی بطورِ خود اپنے آپ کو ان سے روک لے، حالانکہ اس کو روکنے کے لئے نہ کوئی چوکیدار ہو، نہ کوئی قانونی پہرہ دار اور نہ جسمانی مضرت و نقصان کا اندیشہ۔

یہ انسان کی تربیت کا نہایت مؤثر اور بے مثال طریقہ ہے، جس سے محض روحانی مقاصد کے تحت اپنے آپ پر قابو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لئے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ نفس کے گھوڑے کی لگام کو اپنے ہاتھ میں رکھے، جو شخص نفس کی تقاضوں کو دبانے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت حاصل کرلے اس کے لئے کسی بھی گناہ سے بچنا چنداں دشوار نہیں، اسی لئے روزہ کو تقویٰ کا باعث قرار دیا گیا اور رمضان کے مہینہ کو صبر کا مہینہ فرمایا گیا۔

لیکن دنیا کی ہر چیز میں صورت اور حقیقت کا ایک فرق پایا جاتا ہے، شیر کی تصویر میں شیر کی طاقت اور آگ کی تصویر میں آگ کی حرارت نہیں، مٹی کے شیر کی خوفناک اور بھیانک شکلوں سے دن رات بچے کھیلتے ہیں اور آگ کی تصویر سے لوگ اپنے گھر

ہوتے ہیں، لیکن اگر یہاں یہ لپ زندہ شیر بھی ہو تو اچھے اچھے بہادر بھی قریب جانے کی ہمت نہیں پاتے اور آگ کی ایک چنگاری بھی ہو تو پورے مکان کو سلگانے کے لئے کافی ہے۔

بالکل عبادات میں بھی صورت اور حقیقت کا فرق ہے، محض بھوکا پیاسا رہنا روزہ کی صورت ہے نہ کہ حقیقت، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو جھوٹ بولے اس کا روزہ نہیں، جو غیبت کرے اس کا روزہ نہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزہ داروں کو روزہ سے بھوک و پیاس کے سوا کوئی چیز حاصل نہیں، یہ روزہ کی صورتیں ہیں، ایسی صورت جو روح اور زندگی سے خالی ہیں، روزہ تو اس لئے ہے کہ انسان کا سینہ خدا کی محبت سے معمور ہو جائے، اس کا دل سب کچھ کھو کر خدا کو پانے کے جذبہ سے لبریز ہو اور گناہوں کی نفرت اس کے دل میں سما جائے، اس کی نگاہ ایک پاک دامن نگاہ ہو، اس کی زبان فحش و بیہودہ باتوں سے نا آشنا اور ہر طرح کی بدگوئی سے محفوظ ہو، اس کے اعضاء و جوارح کو نیکی سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا ایک عاشق ہے جو اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لئے بھوکا، پیاسا اور دنیا کی لذتوں سے بیگانہ بنا ہوا ہے، اگر روزہ اس کیفیت کے ساتھ رکھا جائے تو یقیناً اس سے نفس کی تربیت ہوگی، انسان کے اندر برائی سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور انسان اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہو سکے گا، یہ تربیتی نظام اسے آئندہ گیارہ مہینوں میں بھی خدا کی مرضیات پر قائم رکھے گا، اس لئے روزہ کو حقیقت کی سطح پر رکھنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ یہ خدا کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنے کا ایک عنوان ہے!

اسی ماہ مبارک میں رسول اللہ ﷺ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید کے ایک ختم کا آپ ﷺ سے مذاکرہ فرماتے، جس سال وفات ہوئی اس سال آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دو دور فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس ماہ کو قرآن مجید سے ایک خاص مناسبت ہے، اسی لئے اس مہینہ میں خاص طور پر تلاوت کی تاکید کی گئی کہ اس

میں پورا قرآن مجید ختم کیا جائے، تہجد میں بھی زیادہ طویل قیام اور اسی نسبت سے قراءت کا معمول مبارک تھا، اسی لئے سلف صالحین کے یہاں اس ماہ میں قرآن مجید کی تلاوت کا بھی خاص اہتمام رہا ہے۔ اس لئے جہاں رمضان کے دن روزہ کے نور سے منور ہوں، وہیں رمضان کی راتیں تلاوت قرآن سے آباد ہونی چاہئے۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ خدا کی آخری اور کائنات میں موجود واحد سچی کتاب اس امت کے پاس ہے، جس کا حق یہ تھا کہ مسلمان کا کوئی دن اس کی تلاوت سے خالی نہ ہو، لیکن صورت حال یہ ہے کہ پورا سال گذر جاتا ہے اور بہت سے بے توفیقوں کو قرآن مجید کے ایک ختم کی توفیق بھی میسر نہیں آتی، اس لئے یوں تو پورے سال تلاوت قرآن کا اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم رمضان کو تو ضائع نہ ہونے دیا جائے، عام طور پر بیس منٹ میں ایک پارہ مکمل ہو جاتا ہے، اگر روزانہ صرف ایک گھنٹہ تلاوت کا وقت رکھا جائے تو بآسانی ہر دس دن میں ایک ختم ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کسی وقت ایک گھنٹہ قرآن کے ترجمہ و تفسیر کے مطالعہ کے لئے بھی رکھ لیا جائے تو یہ کیا کہنا ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ سال بھر ترجمہ و تفسیر کے مطالعہ کا اہتمام ہو، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے، تو کم سے کم رمضان میں کسی ایک بڑی سورت، یا منتخب سورتوں ہی کا مطالعہ کر لیا جائے، تاکہ بندہ یہ جان سکے کہ اس کا خدا اس سے کیا کہہ رہا ہے، یہ کیسی محرومی ہے کہ ہمارا خدا ہم سے مخاطب ہو اور ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہوں؟ وہ ہم سے بات کرے اور ہم اپنے کان بند کر لیں، اس کا کلام اپنی جلوہ فرمائیوں کے ساتھ ہم پر آشکار ہو اور ہم اپنی آنکھیں موند لیں، کیا اس سے زیادہ حق ناشناسی کی بھی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟

رمضان المبارک کا تیسرا اہم عمل دعاء ہے، یہ دعا کی قبولیت کا مہینہ ہے، رمضان کی راتوں میں اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو پکارتا ہے، کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں، کوئی ہے رزق کا خواستگار کہ میں اسے روزی دوں، ہے کوئی ضرورت مند کہ میں اس کی حاجت روائی کروں؟ اس سے زیادہ کم نصیبی کیا

ہوگی۔ کہ داتا خود سائل کو طلب کرے، اور سائل اپنا دست سوال نہ پھیلائے، تہجد کا وقت دعا کی قبولیت کا ہے، افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ جس میں شب قدر کا امکان ہے، دعا کی قبولیت کی خاص ساعتوں پر مشتمل ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ پوری ملت اسلامیہ ظلم سے چور ہے اور پورا عالم اسلام یہود و نصاریٰ کے پنجۂ استبداد سے کراہ رہا ہے، خود ہندوستان میں مسلمانوں کے گرد فرقہ پرست تنظیمیں گھیرا تنگ کرتی جارہی ہیں، ان حالات میں دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، مگر بدقسمتی سے افطار کے لئے ایک سے ایک کھانے کا انتخاب اور دسترخوان کو خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن یہ وقت دعا کی قبولیت اور اللہ سے مانگنے اور اپنے خالق کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا ہے، اسی کو فراموش کر دیا جاتا ہے، اس لئے ہم اس ماہ کو دعا کا مہینہ بنالیں، خدا سے مانگنے اور خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا مہینہ۔

رسول اللہ ﷺ نے اس ماہ کو غمگساری کا مہینہ (شہر المواساۃ) بھی فرمایا ہے، یعنی جیسے یہ خدا کو راضی کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کا مہینہ ہے، اسی طرح یہ خدا کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر برتاؤ کا مہینہ بھی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سخاوت اس ماہ میں تیز ہوا سے بھی بڑھ جاتی تھی، اسی لئے بعض صحابہؓ اسی ماہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے اور آج کل بھی لوگ خاص طور پر اسی مہینہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن زکوٰۃ تو ایک لازمی فریضہ ہے اور انفاق کا وہ کم سے کم درجہ ہے جس سے انسان جوابدہی سے بچ سکتا ہے، لیکن جیسے رمضان میں فرائض کے ساتھ نوافل کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کے ساتھ عمومی انفاق پر بھی توجہ ہونی چاہئے، بہت سے لوگ آج ضرورت مند ہوتے ہیں، لیکن زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوتے، بہت سے ملی کام ایسے ہیں جن میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، ایسے مواقع پر عمومی انفاق امت کے لئے ایک ضرورت ہے اور اصحاب ثروت کو محسوس کرنا چاہئے کہ یہ بھی ان پر ایک حق ہے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا دوسرے حقوق بھی ہیں۔ ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ۔

آیئے ہم عہد کریں کہ ایمان و عمل کی اس فصلِ بہار سے ہم اس کے تقاضے کے مطابق فائدہ اٹھائیں گے اور اپنی عملی زندگی کو اس کی خوشبو سے معطر کریں گے!

(۱۶ نومبر ۲۰۰۱ء)

صبر کی تربیت

"صبر" کے اصل معنی عربی زبان میں "رکنا" اور "روکنے" کے ہیں۔ (القاموس المحیط ۲/۸۰۲) اسی مناسبت سے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنے کو بھی "صبر" کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں اکثر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں کسی فرد، جماعت یا قوم کے لئے قوت برداشت، تحمل اور صبر کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے ۷۰ مواقع پر مختلف انداز سے صبر کی تلقین یا تعریف کی ہے، یا کم سے کم اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید نے ایک موقع پر اللہ سے مدد لینے کا دو نکاتی طریقہ بتایا ہے، ان میں ایک نماز ہے، جو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا عنوان ہے اور دوسرا "صبر" ہے، پھر صبر کی مزید تاکید اور اہمیت کے اظہار کے لئے آگے ارشاد ہوا کہ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔"

"صبر" کا ایک سادہ سا اور مفہوم ہے، جو سماج میں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی شخصی زندگی میں بعض اوقات دل دکھانے والے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ کسی عزیز کی موت، کسی کی بیماری، مالی نقصان ۔ ایسے واقعات پر آہ وزاری کرنے کے بجائے فیصلہ خداوندی سمجھ کر اس پر خاموشی اختیار کرنا یقیناً یہ بھی صبر ہے، لیکن صبر صرف اسی کا نام نہیں، صبر یہ بھی ہے کہ خدا کا حکم بجا لانے میں اگر کوئی بات خلاف طبع ہے تو اس کو خوشی سے برداشت کیا جائے۔ جو لوگ نماز کے عادی نہ ہوں، ان کے لئے پنج وقتہ نماز کا اہتمام بھی دشوار ہوتا ہے، گرما میں تپش سے گذر کر ظہر کی نماز میں مسجد پہنچنا اور ٹھنڈک میں خنک ہواؤں کو برداشت کرتے ہوئے نماز فجر کا اہتمام کرنا خدا کی محبت کے بغیر آسان نہیں، صبر یہ بھی ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنا طبیعت پر گراں گذرتا ہو اور اپنی خو سے باز آنے کو دل تیار نہ ہو، لیکن انسان اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب رکھے

سیکھ لے اور رضائے خدا وندی کی قربان گاہ پر اپنی چاہتوں کو بھینٹ چڑھا دے۔ کوئی شخص شراب کا عادی ہے، اس بری عادت کو چھوڑنا طبیعت نہیں مانتی، ایسے مواقع پر اپنی طبیعت پر قابو پانا اور شریعت کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنا صبر میں داخل ہے۔ اسلام نے نکاح کو سادہ اور آسان رکھا ہے، نہ گانا بجانا، نہ رقص و سرود، تکلفات اور تقریبات سے خالی و عاری، لیکن دوستوں کی، بزرگوں کی، عورتوں کی، بچوں کی اور کسی نہ کسی کی اپنی خواہش گدگدا رہی ہے کہ آج بھی نغمہ و رقص کی محفل نہ سجائی گئی، قمقموں اور روشنیوں کا دریا نہ بہایا گیا، پٹاخوں سے فضا گرمائی نہ گئی اور دکھاوا نہ ہوا، دولت و ثروت کے نقوش دل و ذہن پر قائم نہ ہوئے تو یہ بھی کچھ شادی ہوئی؟! ایسے موقع پر دل خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جائے کہ تیری خواہش ہر خواہش سے بالا ہے اور تیری رضا جوئی پر ساری آرزوئیں قربان ہیں، یہ بھی صبر کے امتحان کا ایک کٹھن موقع ہے اور کم پاک نفوس ہیں جو اس امتحان میں پورے اتر جائیں!

"صبر" اس وقت بڑا صبر آزما ہو جاتا ہے جب اس کا رشتہ بندوں کے حقوق سے ہو، کسی بھائی نے زیادتی ہوگی، انتقام کی آگ رگ و پے میں سلگ رہی ہے، انتقام پر قدرت بھی ہے، خدا جو قادر مطلق ہے اور جو ہر وقت اپنے گنہگار بندوں کی خطاؤں سے درگذر کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ صبر و حلم کی شبنم سے اس شعلۂ غضب کو بجھا دے، تا کہ تم بھی بارگاہِ خداوندی میں اسی سلوک کے مستحق ٹھہرائے جاؤ، اس وقت غصہ کو پی جانا اور عفو و در گذر کی راہ اختیار کرنا "صبر" ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص طاقتور ہے، اثر و رسوخ رکھتا ہے، بے دردی کسی کا حق دبائے ہوئے ہے، مظلوم کو نہ طاقت و قوت حاصل ہے، نہ عدالت تک رسائی ہے، اس کے باوجود انسان یہ سمجھے کہ اسے اپنے ظلم کا حساب دینا ہوگا اور آج وہ جتنا طاقتور ہے خدا کے سامنے کل وہ اتنا ہی کمزور ہوگا، یہ تصور اسے لرزا دے، اس کا دل کانپ اٹھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوسرے کا حق اس کے حوالہ کر دے، یہ بھی "صبر" میں داخل ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے جذبات و خواہشات پر روک لگائی ہے اور اپنے مفادات سے محرومی گوارا کیا ہے۔

"صبر" کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی مسائل سے بھی ہے۔ بعض واقعات جذبات کو بھڑکانے والے ہوتے ہیں۔ متقاضی ہوتے ہیں کہ آپ مشتعل ہوں، لیکن جو قوم بات بات پر مشتعل ہوتی رہتی ہے، وہ کوئی ٹھوس اور تعمیری کام نہیں کرسکتی اور ہمیشہ طویل المدت منصوبہ بندی سے محروم رہتی ہے، وہ اپنی پوری قوت لاحاصل مسائل میں صرف کرنے کی عادی ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کو اہل مکہ نے مشتعل کرنے کی کتنی کوشش کی، مدینہ میں یہودیوں نے براہ راست بھی اور منافقین کے واسطے سے بھی اشتعال پیدا کرنے اور بھڑکانے کا سامان کیا، لیکن آپ ﷺ نے کبھی ایسی حرکتوں کو "مسئلہ" نہیں بنایا اور اپنی اور مسلمانوں کی بہترین صلاحیت کو ان مسائل میں صرف نہیں ہونے دیا، بلکہ خاموشی سے اسلام کی دعوت کو دور دور تک پہنچانے، مسلمانوں کی فکری اور عملی تربیت کرنے اور طویل المدت اور دوررس منصوبہ بندی کے ذریعہ اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کا سدباب کرنے میں مشغول رہے، جس نے بالآخر مسلمانوں کو فتح مندی سے سرفراز کیا۔ سیرتِ نبوی ﷺ میں اس کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں اور سب سے بڑی مثال خود "صلح حدیبیہ" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی سطح پر بھی آج مسلمانوں میں "صبر" کی صلاحیت پیدا کرنا بہت بڑی ضرورت ہے اور یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بزدلی اور فرار دوسری چیز ہے اور خوش تدبیری اور وقتی اعراض ایک دوسری چیز، صبر بزدلی نہیں بلکہ خوش تدبیری سے عبارت ہے۔

رمضان المبارک کو آپ ﷺ نے صبر کا مہینہ قرار دیا (بیہقی عن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ) یعنی یہ مہینہ اس لئے ہے کہ آدمی صبر کرنا سیکھے۔ دن بھر کھانے پینے اور دوسری انسانی ضرورتوں سے اپنے آپ کو روکے رکھنے میں صبر کی تربیت ہے۔ روزہ سے انسان میں صبر کی جو کیفیت مطلوب ہے، اس کو آپ ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا کہ روزہ دار فحش گوئی نہ کرے، بری بات نہ بولے، شور نہ کرے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اسے برا کہے، گالی دے یا اس پر ہاتھ اٹھائے تو کہہ دے کہ میں برائی کا جواب برائی سے نہیں دے سکتا، کیوں کہ میں

روزہ سے ہوں "فإن سابه أحد أو قاتله فليقل إني صائم" (بخاری عن ابی ہریرۃ) یعنی میں صبر کی تربیت پا رہا ہوں اور برائی کا جواب بھلائی سے دینے اور جاہلانہ رویہ کو برداشت کرنے کی مشق کر رہا ہوں۔ اس لئے اس وقت کسی ردعمل کا اظہار ہمارے اس کاز کے خلاف ہے جس میں ہم مصروف ہیں۔

(۱۷ دسمبر ۱۹۹۹ء)

رمضان المبارک کا پیغام

رمضان المبارک اپنی تمام رعنائیوں اور بہاروں کے ساتھ گذرنے کو ہے، آئیے! پھر ایک بار ہم رمضان کا سبق تازہ کریں۔ ماہِ مبارک سے ہمیں کیا کیا سبق ملتا ہے؟ اس ماہ کے تقاضے کیا تھے؟ اور ہماری زندگی میں ان کا کیا اثر ہونا چاہئے؟ آئیے ہم اپنا احتساب کریں، اور اپنی عملی زندگی کو اس آئینے میں دیکھ کر اسے سنوارنے کی کوشش کریں۔

رمضان ہمیں مجاہدہ کی تربیت دیتا ہے، مجاہدہ سے مراد مشقتوں اور خلافِ طبیعت باتوں کو برداشت کرنا ہے، بھوک، پیاس، دوسری خواہشات سے اجتناب، زبان کی حفاظت، رات میں عام معمول سے زیادہ تراویح کی بیس رکعتوں کی ادائیگی، وہ بھی طویل قیام و قراءت کے ساتھ، دن بھر کی فاقہ کشی کے بعد کھانا کھانے کے بعد نماز، نماز کے بعد تھوڑی دیر سو کر پھر اٹھ جانا، اللہ توفیق دے تو چند رکعات تہجد ورنہ کم از کم سحری، یہ سب قرآن مجید کی دعوت، یہ معمولات کا ایسا سلسلہ ہے جو یقیناً انسان کو تھکا دینے والا اور اس کے عام مزاج و مذاق کے خلاف ہے، اس سے ہماری تربیت ہوتی ہے کہ ہم اپنے اندر خلافِ طبیعت باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں، ہم بلند مقاصد کے لئے آبلہ پائی کریں، طوفان ہمارے حوصلے پست نہ کریں، آندھیاں ہمارے قدموں کو کم ہمت نہ بنا دیں، ناسازگار حالات ہمارے لئے زنجیر پا نہ بن جائیں، بلکہ اگر ہمارے سفر کی سمت صحیح ہو تو ہم اس کے لئے ہر طرح کی مشکلات اور ناگواریوں کو جھیلنے کے لئے تیار رہیں، یہ حوصلہ مندی اور آبلہ پائی ہماری شخصی زندگی کے لئے بھی ضروری ہے اور قومی زندگی کے لئے بھی، افراد و اشخاص کے لئے بھی ضروری ہے، اور جماعتوں اور تنظیموں کے لئے بھی، کامیابی کسی دنیوی مقصد کو حاصل کر لینے کا نام نہیں، بلکہ خدا کی خوشنودی کی راہ پر چلنے کا نام ہے، اس راہ میں کھونا بھی

پانا اور اسی راہ میں مرنا بھی جینا ہے۔

رمضان المبارک ہمیں قرآن مجید سے وابستگی کا سبق دیتا ہے، اس ماہ میں قرآن نازل ہوا، تراویح نزولِ قرآن ہی کی یادگار ہے، شبِ قدر اور اعتکاف کا مقصد بھی نزولِ قرآن کی مبارک شب کو پانا ہے، عید الفطر اسی نزولِ قرآن کا جشنِ عام ہے، پس یہ مہینہ قدم قدم پر ہمیں قرآن مجید سے مربوط کرتا ہے، قرآن محض ایصالِ ثواب اور مردوں کے لئے بخشش و مغفرت کی کتاب نہیں، بلکہ یہ آئینۂ حیات ہے، جس میں ہم اپنی عملی زندگی کی صورت گری کریں، اور اس کے خط و خال درست کریں، ہم اپنا جائزہ لیں کہ قرآن سے ہمارا تعلق کس قدر کمزور ہو چکا ہے، ہم تلاوتِ قرآن کے ذوق سے محروم، قرآن ہم سے کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے، اس کے جاننے کی خواہش سے عاری، عملی زندگی میں قرآن کی پیروی کرنے کے بجائے، ہماری خواہشات اور مفادات ہماری رہبر ہیں، قرآن پوری انسانیت کے لئے امانتِ خداوندی ہے، اس کا حق تھا کہ ایک ایک بندۂ خدا تک اس کتاب کو پہونچایا جاتا، لیکن ہم نے صدیوں اس ملک میں رہنے کے باوجود اپنے برادرانِ وطن تک ان کی اس امانت کو پہونچانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، غرض کہ ہم تو حاملانِ قرآن ہیں، لیکن نہ تالیِ قرآن اور نہ عاملِ قرآن، نہ عالمِ قرآن اور نہ مبلغِ قرآن، اس سے بڑھ کر اس کتاب کے ساتھ کیا ناانصافی ہوگی!

ہمیں چاہئے کہ ہم یہ عہد کریں کہ خود قرآن مجید کی تلاوت کا معمول رکھیں گے، اپنے بچوں اور متعلقین کو تلاوتِ قرآن کا پابند کریں گے، کوشش کریں گے کہ خاندان میں کوئی نہ کوئی شخص حفظِ قرآن مجید کی سعادت حاصل کرے، ہم اپنی عملی زندگی کو قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر استوار کریں گے، اور اپنی خواہشات اور وقتی مفاد پر اللہ کی خوشنودی کو غالب رکھیں گے، قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں گے، اگر ہم عربی زبان سے واقف نہیں ہوں تو قرآن کے تراجم اور تفسیروں کے ذریعہ جاننے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں ہم سے کیا فرمایا ہے، پھر ہم اس بات کا بھی عزم کریں کہ اپنے اہلِ تعلق غیر مسلم بھائیوں تک قرآن مجید کے تراجم پہونچائیں، تا کہ ہم دعوت کی

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں، جو اللہ تعالیٰ نے خیرِ امت ہونے کی حیثیت سے ہم سے متعلق فرمائی ہے۔

رمضان المبارک سے ہمیں مواسات اور غم خواری کا سبق ملتا ہے، جب انسان خود بھوکا رہے تو وہ بھوک کی تکلیف کو محسوس کر سکتا ہے، اور اپنے ان بھائیوں کے دکھ کو سمجھ سکتا ہے، جو فاقہ مستی جن کے لئے معمولات کے درجہ میں ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس مہینے کو "شہر المواساۃ" یعنی غم خواری کا مہینہ قرار دیا ہے، اور اس مہینے کے ختم پر صدقۃ الفطر واجب قرار دیا گیا ہے، تاکہ اہلِ ثروت مسلمان اپنے غریب بھائیوں کو اپنی مسرت و شادمانی میں شریک کر سکیں، یہ سبق سال بھر یاد رکھنے اور یہ عمل ہر دن دہرانے کا ہے، کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے کام آئے، وہ اس کی مصیبت و پریشانی کو اپنی مصیبت و پریشانی سمجھے، وہ اس وقت تک اپنی خوشی کو نامکمل سمجھے جب تک کہ اس کا بھائی بھی اس خوشی میں شریک نہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری عملی زندگی، اسلامی اخوت کے اس تصور سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے، اہلِ دولت اپنی دولت کے نشہ میں سرشار ہیں، امت کے محتاج اور ضرورت مند لوگوں کا انہیں کوئی خیال نہیں۔ بلکہ ان کی عیش پرستی، غریب مسلمانوں کے لئے پریشانیوں کا موجب ہے، شادی بیاہ کی فضول رسمیں، اور اس میں ہونے والی فضول خرچیاں اصل میں ہمارے مالدار طبقے ہی کی دین ہیں، بیچارے کم آمدنی والے لوگ ان شاہ خرچیوں کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں، غریب خاندانوں میں پیدا ہونے والے بہت سے ذہین بچے مجبوراً تعلیم کو چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ بڑھتی ہوئی رشوت ستانیوں کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے، یہ رشوت کا بازار قوم کے دولت مند طبقے ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو کچھ معاشی فراغت دی ہو وہ اپنے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں اور انہیں اونچا اٹھانے کی کوشش کریں۔

رمضان ہمیں اوقات کی پابندی اور اس کے انضباط کا بھی سبق دیتا ہے، یوں تو اسلام

میں تمام عبادتیں وقت سے مربوط ہیں، لیکن روزہ میں تو بہت زیادہ انضباطِ وقت کی ضرورت پڑتی ہے، رات کے آخری پہر میں بیدار ہونا، اور صبح صادق سے پہلے پہلے سحری کھانا، اگر اس میں ذرا بھی تاخیر ہو اور صبح طلوع ہونے کے بعد ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا، پھر غروبِ آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کرنا ہے، اگر پہلے افطار کرلیں تو روزہ درست نہ ہو، اور دیر سے افطار کریں تو کراہت ہے، روزہ افطار کرنے اور مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھا کر فارغ ہوئے کہ عشاء کا وقت شروع ہوا، اب نمازِ عشاء پڑھنا، پھر اس کے بعد تراویح پڑھنی ہے، اگر اللہ توفیق دے تو پھر سو کر اٹھنے کے بعد نمازِ تہجد ادا کرنی ہے، یہ پورا نظامِ عمل اس قدر مشغول اور مربوط ہے کہ انضباطِ وقت کے بغیر ان کو انجام نہیں دیا جا سکتا۔

یہ وقت کی حفاظت کا بہت بڑا سبق ہے، وقت ایک قیمتی چیز ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، وقت کی قدردانی میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ اور وقت کی ناقدری میں دونوں کا نقصان۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہماری تقریبات نہ وقت پر شروع ہوتی ہیں، نہ وقت پر ختم، یہاں تک کہ ہماری مذہبی تقریبات اور جلسے وغیرہ بھی وقت پر شروع نہیں ہوتے، نہ متعینہ وقت پر ان کو ختم کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، بعض دفعہ رات کے دو ڈھائی بجے تک ہماری تقریروں کا جوار بھاٹا جاری رہتا ہے، ایسی صورت میں کیسے امید رکھی جا سکتی ہے کہ ہمارے بھولے بھالے سامعین فجر کی نماز ادا کر سکیں گے؟ یہ وقت کے معاملہ میں فضول خرچی اور اسراف ہے، اور یہ مال و دولت کے اسراف سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔

روزہ ہمیں اس بات کا عادی بناتا ہے کہ ہم اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب کرسکیں، بھوک و پیاس انسان کی ایسی خواہش ہے کہ ان کو چند گھنٹے بھی روکنا دشوار ہے، جب چاہے کوئی شے کھا سکے، بظاہر کوئی طاقت روکنے والی نہیں، کوئی زبان ٹوکنے والی نہیں، اس کے باوجود انسان کھانے پینے سے رکا رہتا ہے، اس سے بڑھ کر اپنی خواہش کو خدا کی مرضی کے تابع کرنے کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ یہ ایک روز کا عمل نہیں بلکہ تیس دن کا

ہے۔ یہ عمل گو ایک ماہ کے لیے فرض ہے لیکن یہ اپنی روح اور مقصد کے اعتبار سے ایک ماہ میں محدود نہیں، بلکہ مسلسل ہے۔ یہ کیفیت ہر مسلمان کی زندگی میں سال بھر قائم رہے۔ ورنہ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ روزہ دار نے صرف روزہ کی صورت کو پایا ہے، نہ کہ روزہ کی حقیقت کو۔ اس نے روزہ کے قالب کو حاصل کیا ہے نہ کہ اس روح کو۔ اور رسول اللہ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان کے مطابق اس نے بھوک و پیاس برداشت کی ہے، حقیقی معنوں میں روزہ نہیں رکھا ہے۔

ہم اپنی عملی زندگی میں بار بار ان امتحانات سے گزرتے ہیں کہ ہمیں خدا کی فرماں برداری عزیز ہے یا نفس کی تابع داری، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی مطلوب ہے یا اپنی شہرت اور ناموری۔ نکاح کی تقریبات میں کتنی ہی خلافِ شرع باتوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ فوٹوگرافی، ویڈیو گرافی، بے پردگی، مرد و عورت کا اختلاط، فضول خرچی، لڑکے اور اس کے خاندان کی طرف سے مختلف مطالبات، دعوتوں میں بے جا اسراف، یہ تمام امور یہ سارے گناہ سماجی عزت، جھوٹی شہرت اور متعلقین کی خوشنودی کے لئے کئے جاتے ہیں، گویا خدا کی ناراضگی کی قیمت پر خلقِ خدا کی خوشنودی خریدی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر روزہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ مومن نے خدا کی خوشنودی کے بدلے اپنی خوشنودی کا سودا کر لیا ہے، اس لئے اس کو یہ بات قطعاً زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی مرضی اور اپنے جیسے انسانوں کی مرضی پر چل کر خدا کو ناراض کرے۔

قرآن نے سود کے حرام ہونے کا اعلان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہایت سختی کے ساتھ نہ صرف شراب پینے بلکہ شراب سے متعلق ہر طرح کے تعاون کو منع فرمایا ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی ثروت سے کافی بڑی رقم بینکوں میں رکھتے اور اس کا سود حاصل کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی آخری زندگی اسی سود پر گزارتے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بڑھاپے میں نماز پڑھنے والے لگتے ہیں، مسجد سے جڑ آ جاتے ہیں، اور توبہ کی راہ اختیار کرتے ہیں، لیکن یہ ایسے محروم القسمت ہیں کہ زندگی بھر محنت کی حلال کمائی کھا کر آخری وقت سود خواری میں گزارتے ہیں۔ جس شخص کا یقین اللہ

کی برتری پر ہو اور نفس کی خوشنودی پر خدا کی خوشنودی کو غالب رکھنے کی لذت اور حلاوت سے آشنا ہو وہ بھلا آخر عمر میں اس سود خواری کو کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ یہی مواقع ہیں جن میں انسان کی ضبطِ نفس کی قوت کا امتحان ہوتا ہے۔ کیا روزوں نے صرف اسے بھوکا پیاسا رکھا ہے یا اس میں روحانی اور اخلاقی انقلاب بھی پیدا کیا ہے؟

(۱۴ردسمبر ۲۰۰۱ء)

تقویٰ ـــــ روزہ کا اصل مقصود

اسلام نے جتنی عبادتیں فرض کی ہیں ان میں انسان کی تربیت اور اصلاح کا پہلو بھی ملحوظ ہے، روزہ بھی ان ہی عبادتوں میں سے ایک ہے، جس میں نفس کی تربیت اور تزکیہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم پر روزہ اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۱۸۳)

''تقویٰ'' کا لفظ عربی زبان میں ''وقایۃ'' سے ماخوذ ہے، وقایہ کے معنی انتہائی درجہ حفاظت کے ہیں، الوقایۃ لفرط الصیانۃ (تفسیر کبیر ۱/۲۸۷) تقویٰ کے معنی جہاں بچنے کے ہیں وہیں خوف اور خشیت کے بھی ہیں، اور قرآن مجید میں مختلف مواقع پر یہ لفظ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: النساء ۱، الشوریٰ ۲۶، آل عمران ۱۰۲) گویا محض اللہ تعالیٰ کے خوف سے آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

اسی کو سلف صالحین نے مختلف الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، خود حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جب تک بندہ گناہ کی باتوں سے بچنے کے لئے از راہ احتیاط بعض جائز باتوں سے بھی اجتناب نہ کرے متقیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ (تفسیر کبیر ۱/۲۸۷) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حضرت ابیؓ سے تقویٰ کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت ابیؓ نے ایک مثال کے ذریعہ تقویٰ کو سمجھایا، حضرت ابیؓ نے عرض کیا کہ کیا آپؓ کبھی کسی خاردار راستہ سے گذرے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں، حضرت ابیؓ نے دریافت کیا کہ اس موقعہ سے آپؓ نے کیا کیا؟ فرمایا: میں نے بچنے کے لئے اور احتیاط سے کام لیا۔ ''تشمرت و حذرت'' حضرت ابیؓ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے، (تفسیر قرطبی ۱/۱۶۲) گویا دنیا ایک رہگذر ہے جو گناہ کی جھاڑیوں سے گھری

ہوئی ہے، یہ جھاڑیاں خواہشات اور گناہوں کی ہیں، جو انسان کے دامن عمل سے لپٹ جاتا جاتی ہیں، متقی شخص وہ ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے دامن کو خدا کی نافرمانیوں اور عصیان شعاریوں سے بچا کر دنیا کا یہ سفر طے کر لے۔

اس طرح تقویٰ ایک جامع لفظ ہے۔ جو خیر کی تمام باتوں کو شامل ہے۔ (قرطبی: ۱/۱۶۱)

چنانچہ مشہور بزرگ شیخ ابو یزید بسطامی نے فرمایا کہ متقی وہ ہے کہ جو کچھ کہے اللہ کے لئے کہے، اور جو کچھ کرے اللہ تعالیٰ کے لئے کرے۔ من اذا قال قال للّٰہ و من اذا عمل عمل للّٰہ (حوالہ سابق: ۱/۱۶۱) تقویٰ کے اسی وسیع مفہوم کو قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان فرمایا ہے کہ:

> متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل فرمائی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ (البقرۃ: ۲-۴)

اس سے معلوم ہوا کہ تین باتوں کو تقویٰ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان میں پہلی چیز عقیدہ و ایمان کی اصلاح ہے۔ یہ اسلام کی خشتِ اوّل ہے، اور اسی پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہے، ایمان کا حاصل یہ ہے کہ خدا اور رسول کی بتائی ہوئی ان دیکھی باتوں پر اس کا یقین ایسا ہو جیسا انسان کو دیکھی ہوئی باتوں کا یقین ہوتا ہے "یقین" بظاہر ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت کسی بات کا یقین انسان کی زندگی میں بہت بڑے انقلاب کا داعی ہوتا ہے، اگر لوگوں کے مجمع میں پلاسٹک کا مصنوعی سانپ لا کر رکھ دیا جائے یا کسی عجائب خانہ میں شیر کا بھیانک مجسمہ بنا ہوا ہو تو کتنے ہی بڑے اور چھوٹے، بچے اور جوان مرد اور عورت اس کو ہاتھ لگاتے ہیں، اس سے کھیلتے ہیں اور بعض منچلے تو اس کی سواری کرنے سے بھی نہیں چوکتے، لیکن اگر لوگوں کے مجمع میں اس سے بہت چھوٹا حقیقی اور زندہ شیر آ جائے یا سانپ نکل آئے تو ہر شخص کا خوف سے بُرا حال ہوگا، اچھے اچھے

بہادروں کو بھی راہِ فرار مطلوب ہوگی۔ نہ تحمل ہوگا نہ تشویش ہوگی، نہ ٹھہرنے کی ہمت ہوگی۔ یہ "یقین" کا فرق ہے۔ حالانکہ شکل و صورت کے اعتبار سے دونوں شیر اور سانپ ہیں لیکن آدمی جس چیز کے بارے میں شیر اور سانپ ہونے کا یقین نہ رکھتا ہو تو خواہ بظاہر وہ کتنا ہی بھیانک نظر آئے اس سے کوئی خوف اور دہشت نہیں ہوتا ہے اور جب شیر ہونے کا یقین ہو جائے تو سوچ کے انداز ہی بدل جاتے ہیں۔

"ایمان" ایسے ہی انقلاب انگیز یقین کا نام ہے۔ جو دلوں کی دنیا میں ہلچل پیدا کردے اور فکر و نظر کی کائنات میں انقلاب کا پیغام بن جائے۔ خدا پر ایمان انسان میں ایسی کیفیت پیدا کردے کہ گویا وہ اپنے خالق کے سامنے کھڑا ہے اور اس کے دامن کو تھامے ہوا ہے۔ خدا کی محبت اس کے دل سے امنڈنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر عمل کر کے وہ اتنا خوش ہو کہ گویا اس نے سب سے بڑی نعمت پالی ہے۔ خدا کے عذاب کا خوف اس کو لرزا دے اور اس کی آنکھوں کو اشکبار کیے بغیر نہ رہے۔ اسے ایسا لگے کہ جیسے جنت اور دوزخ اس کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ خدا کی کتاب پر اس کو اس درجہ کا یقین حاصل ہو کہ آنکھوں دیکھی باتوں پر بھی آدمی کو اس درجہ اطمینان نہیں ہوتا، اسے یوں لگے کہ جیسے یہ کتاب اسی کو مخاطب کر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام اور سرگوشی ہے۔ اس کیفیت کے بغیر ہمارا ایمان ناقص اور نا تمام ہے۔ ایک بے روح ایمان جو نہ گناہوں سے ہمارے قدموں کو روک سکے اور نہ نیکیوں کی طرف ہمیں لے جا سکے تقویٰ کے لئے یہ پہلا زینہ ہے!

دوسری چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا "اقامت صلوٰۃ" یعنی نمازوں کا قائم کرنا ہے۔ نماز کیا ہے؟ اپنے آپ کو خدا کے آگے بچھا دینا اور سر سے پاؤں تک اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے سانچے میں ڈھال لینا! زبان خدا کے ذکر سے تر ہے، ہاتھ نیاز مندانہ خدا کے سامنے بندھے ہوئے ہیں، آنکھیں ایک غلام کی طرح جھکی ہیں، جسم بے حرکت کھڑا ہے، پھر جب نمازی رکوع میں جاتا ہے تو فروتنی اور بڑھ جاتی ہے، پشت خمیدہ، سر افگندہ، زبان پر تسبیح۔ اب سجدہ کی منزل ہے جو عجز و انکسار اور بے بسی کا نقطۂ عروج ہے۔ سر، پیشانی اور ناک انسان کے عزت و وقار کا سب سے بڑا مظہر ہیں، لیکن خدا کے سامنے یہ

سب زمین پر خاک آلود ہیں۔ ہاتھ بچھے ہوئے ہیں، جسم کا ایک ایک حصہ سے خود سپردگی اور غلامی و بندگی ظاہر ہے، قدم بقدم پر خدا کی کبریائی کا نعرہ ہے، اس کی حمد و ثنا کا زمزمہ ہے، الحاح و التجا ہے، تضرع اور دعا ہے، اپنی گنہگاری کا اقرار و اعتراف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نماز خدا کی بندگی کا ایسا فطری اور اثر انگیز طریقہ ہے کہ اس کی ایک ایک کیفیت سے روح وجد میں آنے اور انسان کو خدا سے اپنی قربت کا احساس ہونے لگے۔ اس کو یوں محسوس ہونے لگے جیسے وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

پس یہ نماز ایک عنوان ہے، اور اس کے ذریعہ انسان کو ان تمام اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنا ہے۔ خدا کا کوئی حکم مسلمان سے نہ چھوٹنے پائے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی خواہشات اور ضرورتوں کا ایسا دیوانہ ہو جائے کہ اللہ کی مرضیات اور اس کی چاہتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ خدا کے حکم کو ہر حکم پر مقدم رکھے۔ اور جہاں نفس کو گراں گزرے وہاں بھی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو اپنے آپ پر نافذ کرے۔

متقیوں کی تیسری صفت "انفاق" ہے۔ انفاق کے معنی خرچ کرنے کے ہیں قرآن کے بیان کے مطابق تقویٰ والوں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی کم و بیش عطا ہوتا ہے، وہ اس کا ایک حصہ اپنے غریب بھائیوں پر خرچ کرتا ہے۔ دراصل دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ انسان کو نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال و دولت ہے۔ اس کی حرص زدگی خدا سے بے توجہ کرتی ہے۔ پھر دولت و ثروت کا نشہ دل و دماغ پر چڑھتا ہے اور کبر و غرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ یہی کبر وہ اخلاق کے لئے سم قاتل ہے۔ اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، اور وہ لوگوں کے حقوق کو ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ "انفاق" اسی کا علاج ہے۔ گو یہ انفاق سے صرف دوسرے انسانوں کی مالی اعانت ہی مراد نہیں ہے بلکہ یہ "حقوق العباد" کے لئے ایک عنوان کے درجہ میں ہے کہ جیسے انسان خدا کے حقوق ادا کرے اسی طرح خدا کی مخلوق کے حقوق کی بھی رعایت کرے۔ اس لئے کہ خدا کا حق اپنی ضرورت سمجھ کر ادا کرے اسی طرح خدا کی مخلوق

کے حقوق کی بھی رعایت کرے۔ اس لئے کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنا ہے، خود انسان کی عبادت اور بندگی کا محتاج نہیں۔ اور لوگوں کے حقوق کا ادا کرنا لوگوں کی ضرورت کے پیشِ نظر ہے کہ انسان محتاج اور ضرورت مند ہے۔ اسی لئے بعض وجوہ سے حقوق الناس کی اہمیت حقوق اللہ سے بھی زیادہ ہے۔

اس طرح تقویٰ تین باتوں کو شامل ہے، دل میں ایمان و یقین کی حقیقی کیفیت کو پیدا کرنا۔ ایسا یقین جو دل کی دنیا کو بدل دے، اور خدا کی مرضیات کو بجالانے میں اسے لطف آنے لگے، دوسرے وہ اللہ کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو، فرائض و واجبات کو پورا کرتا ہو اور گناہوں سے بچتا ہو، تیسرے وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو، مال کے ذریعہ بھی غریب بھائیوں کا تعاون کرتا ہو، اور اپنی زبان سے بھی لوگوں کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھتا ہو، اس طرح تقویٰ پوری انسانی زندگی کو شامل ہے، اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔

انسان کو چاہئے کہ جیسے وہ اپنی جسمانی بیماریوں کو تلاش کرتا ہے، اسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کو بھی تلاش کرے، اور ان کے علاج کی طرف متوجہ ہو، کسی کی بیماری ایمان وعقیدہ میں چھپی ہوئی ہے، وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، لیکن توہمات کا شکار ہے اور خدا سے نفع ونقصان کے بجائے دنیا کی چیزوں سے نفع ونقصان کا یقین اپنے دل میں بٹھائے ہوئے رہتا ہے، خدا کے خزانۂ غیب سے زیادہ دنیا کے اسباب پر اس کا یقین ہے، تو اس کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی اصلاح کرے۔ اگر ایک شخص نیکیوں کے تمام کام کرتا ہو لیکن نماز کی توفیق سے محروم ہو تو نماز کا اہتمام ہی اس کے لئے تقویٰ کی کسوٹی ہے، عبادت کا اہتمام کرتا ہو لیکن لوگوں کے حقوق میں غافل ہو، غریب بھائیوں پر خرچ کرنا اس کی ڈکشنری میں نہ ہو تو اس کے لئے تقویٰ کا معیار "انفاق" ہے، اگر نماز و روزہ کی بھی توفیق ہو، اللہ کے راستہ میں خرچ بھی کرتا ہو، لیکن اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں، اس کی زبان لوگوں کی عزت ریزی پر کمربستہ رہتی ہو، اس کا سینہ کینوں اور کدورتوں سے معمور ہو، لوگ اس کی ترش روئی سے گھبراتے اور اس کی تند کلامی سے خوف کھاتے ہوں تو اخلاق

میں اس کا تقویٰ چھپا ہوا ہے، اگر وہ اس کی اصلاح کر لے تو ''متقی'' ہے۔

غرض تقویٰ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے، اور تقویٰ کی منزل تک پہنچنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان اپنی روحانی بیماری کی شناخت کرے، اور جہاں گناہ کا عیب ہے وہیں اصلاح کا نشتر لگائے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ نیکیوں کی توفیق فرمائی تو اس سے دھوکہ نہ کھائے کہ کسی مریض کے لئے اس سے زیادہ نقصان دہ کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے آپ کو صحت مند تصور کرنے لگے۔ روزہ کا مقصد ایک مسلمان کو تقویٰ کی منزل تک پہونچانا ہے۔ اب کہ رمضان المبارک کے آخری ایام ہیں، ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں، اور احتساب کا آئینہ اپنے رخِ زندگی کے سامنے کر دیں اور دیکھیں کہ کیا ہم نے تقویٰ کی طرف سفر شروع کر دیا ہے، اور اگر شروع نہیں کیا تو کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا؟؟

(جنوری ۱۹۹۹ء)

عید کا پیغام امت مسلمہ کے نام

آج عید کا دن ہے، خوشیوں اور مسرتوں کا دن۔ نئے خوبصورت رنگا رنگ کپڑوں نے ایک سماں باندھ دیا ہے، بڑے چھوٹے، جوان بوڑھے، معصوم بچے، مرد اور عورت ہر ایک چہرے کھلے ہوئے، ایک دوسرے کو مسکراہٹوں کی سوغات پیش کرتے ہوئے، سیوئی اور شیر خورمہ کی تو گویا برسات آگئی، بڑے ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں اور ننھے منے بچے گلی کوچوں میں بلبل کی طرح چہچہا رہے ہیں اور رنگین و خوب صورت تتلیوں کی طرح اڑتے پھر رہے ہیں۔ لیکن عید کا حاصل کیا صرف یہی ہے؟ کیا عید محض ایک ساعت مسرت ہے جو آئے اور گذر جائے؟ شاید ایسا نہیں! اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر شئی سے پیغام دیتا ہے، عبرت و موعظت کے پہلوؤں کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے اور زندگی کے ہر واقعہ کو مشعل راہ بنا دیتا ہے، جس کی روشنی سے اندھے بھی دیکھنے لگیں اور بہرے بھی سننے لگیں، عبادت و بندگی ہو یا لوگوں کے باہمی معاملات، اسلام کا ہر طریقہ ایک "بولتا ہوا" عمل ہے جو کبھی بھی ان کو سوچنے سے محروم نہ رہنے دیتا۔

عید بھی سراپا "پیغام" ہے، دعوت ہے، عید سب سے پہلے ہمیں اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کو خوشی اور مسرت کے لمحات کس طرح گذارنے چاہئیں۔ غور کیجئے کہ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی دن نہیں، لیکن نہ رقص و سرود ہے، نہ غیر مہذب بے راہ روی، نہ شراب، نہ ناچ گانوں کی محفل؛ نہ نعروں کا شور و غوغا، نہ آتش بازیوں کا ہنگامہ، بلکہ ہر مسلمان صبح سویرے اٹھتا ہے، نماز فجر ادا کرتا ہے، پھر نہاتا ہے، صاف ستھرے اور میسر ہوں تو نئے کپڑے پہنتا ہے اور خوشبو لگاتا ہے، عید کے لئے نکلتا ہے، آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور زبان پر اللہ کی بڑائی اور حمد و ثنا کے کلمات، عید گاہ پہنچ کر دو گانہ شکرانہ ادا کرتا ہے

اور اپنی پیشانی خدا کے سامنے مٹی پر رکھ کر اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔ خوشی کے مواقع پر آدمی میں کسی قدر کبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے بار بار اپنی بڑائی کی نفی اور خدا کی بڑائی کا اقرار و اعتراف کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اصل صاحبِ ایمان وہ ہے جو خوشی و مسرت کے وقت اترانے نہ لگے، اس کی گردن مارے کبر کے اونچی نہ ہو، اس کی زبان پر اپنی بڑائی کا کلمہ نہ ہو، بلکہ وہ خدا کے سامنے جھکتا ہوا ہو، خوشی نے اس کے تواضع و انکسار کو بڑھایا اور اپنی بڑائی کے احساس کو گھٹایا ہو اور اس وقت بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو اور اس کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم۔ شادی بیاہ ہو، بچہ کی پیدائش ہو، نیا مکان خدا نے دیا ہو، دکان اور روزگار کا سامان میسر آیا ہو، کوئی بات خوشی کی پیش آئی ہو تو مسرت کے اظہار کا وہی طریقہ اللہ کو پسند ہے کہ مومن کا سر شکر کے جذبے سے سرشار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائے اور اس کی زبان اللہ کے ذکر اور حمد و ثنا سے تر ہو۔ عید مسلمانوں کے لئے اجتماعیت اور وحدت کا بھی پیغام ہے، مالدار ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، فرمانروا ہو یا رعایا، سماج کا معزز اور معروف شخص ہو یا کوئی معمولی اور غیر معروف آدمی، گورا ہو یا کالا اور عربی ہو یا عجمی، ایک ساتھ شانہ بشانہ خدا کے حضور کھڑے ہیں اور اس کے کرم کے سوالی ہیں۔ یہاں کوئی امتیاز نہیں، خدا کے دربار میں سب برابر ہیں، علامہ اقبال کے الفاظ میں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے وحدت کا اور کیا پیغام ہوگا؟؟ یہ سب مسلمان ہیں، کلمۂ توحید پڑھنے والے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ نبوت سے وابستہ، آخرت پر سب کا یقین، قرآن مجید پر ایمان رکھنے والے بھی اور ہر ایک قبیلے کے حامل فکر و نظر کا کچھ اختلاف ضرور ہے، لیکن اس کے باوجود آج شانہ بشانہ اور قدم بقدم کھڑے ہیں، کاش دوسرے دنوں میں بھی اس وحدت کو محسوس کریں اور سوچیں کہ کس

قدروں کی بنیادی باتوں میں ان کے درمیان اشتراک و اتفاق ہے اور اگر کچھ اختلاف ہے تو اس لائق ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کے ساتھ ان کو برداشت کیا جائے۔

”عید“ ہمیں اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ وہ خوشی، خوشی نہیں جس میں پورے سماج کو شامل نہ کیا جائے، آپ کے گھر میں مسرت کا چراغ جلے، بلکہ چراغاں ہو اور آپ کا پڑوسی غم کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہو، اس سے زیادہ نامبارک کوئی مسرت نہیں ہوسکتی۔ اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید الفطر کے ساتھ ساتھ ”صدقۃ الفطر“ کا بھی حکم دیا ہے کہ ہر صاحب گنجائش مسلمان اپنی اور اپنے زیر پرورش لوگوں کی طرف سے گیہوں کی ایک خاص مقدار یا اس کی قیمت اپنے غریب بھائی کو پہنچائے اور عید سے پہلے پہلے پہنچا دینے کی کوشش کرے، تاکہ سماج کے غریب اور پریشان حال لوگ بھی عید کی خوشی میں شامل ہوسکیں۔ ”صدقۃ الفطر“ ایک علامتی عمل ہے، یہ صرف عید ہی کے دن کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ہر خوشی میں سماج کے غریب بھائیوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ وہ خوشی ادھوری اور ناکام ہے جو اپنے گھر تک محدود ہے اور جس میں اپنے ان پڑوسیوں کو شامل نہ کیا گیا ہو جن کو خدا نے آپ کی نگاہ لطف کا محتاج بنایا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچہ کی پیدائش کے ساتھ ”عقیقہ“ اور شادی کے موقع سے ”ولیمہ“ رکھا گیا ہے اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین ولیمہ وہ ہے جس میں سماج کے غریب لوگوں کو شریک نہ رکھا جائے۔ مسلمان وہ ہے کہ جسے دوسروں کی فکر تڑپاتی ہو، جس کو دوسروں کی پریشانی بے قرار کردیتی ہو، جس کے لئے دوسروں کا غم اپنا غم بن جاتا ہے، جو دوسرے بھائیوں کے درد کی کسک اپنے دل میں پاتا ہو، اسے اپنی لڑکیوں کے ساتھ دوسرے غریب بھائیوں کی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بھی متفکر رکھتا ہو، اسے اپنے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم کے دوسرے بچوں کی تعلیم کی فکر بھی بے چین رکھتی ہو، جو ان

بیواؤں، یتیموں اور بیماروں کے لئے بھی اپنے دل کو بے سکون پاتا ہو جن کے یہاں فاقوں سے تندرستی ہے اور جو اپنی بیماری، غذا اور دوا کے لئے کسی کی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔ سیدا آپ ''زبانِ بے زبانی'' سے ہر شخص کو یہ پیغام دیتی ہے۔ کاش! ہم دل کے کانوں سے سن سکیں:

(   )

اسلامی تہوار —— تہذیب و شائستگی کا نمونہ

۲۴ دسمبر کو ہمارے ہندو بھائیوں کی گنیش پوجا کا اختتامی پروگرام تھا، جو حسب روایت بہت بڑے جلوس کی صورت میں اختتام پذیر ہوا، یہ اس عظیم الشان جلوس کا تیسواں سال تھا، جہاں یہ جلوس اپنے شرکاء کی کثرت کے اعتبار سے غالباً ملک بھر میں مثالی جلوس ہے، وہیں نقض امن، شور شرابہ اور مار دھاڑ بھی اس کی روایت میں داخل ہے، جس کا مظاہرہ اس سال بھی ہوا، اور خوب ہوا، ہر سال کی طرح اس سال بھی "عظیم جاہی مارکیٹ" پر گنیش جلوس کا استقبال کیا گیا۔ ودّ آر۔ ایس۔ ایس کے سہ پرمکھ سرسنگھ راؤ جوشی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس جلوس سے خطاب کیا۔ آر۔ ایس۔ ایس کے قائدین میں حقائق کو قبول کرنے اور واقعات کا اعتراف کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ کیونکہ جو جماعت منفی مقاصد اور منفی اغراض کے لئے قائم ہوتی ہے، اور کام کرتی ہے۔ وہ مثبت حقائق کو قبول نہیں کر سکتی لیکن بعض اوقات غیر شعوری طور پر سچائی زبان تک آجاتی ہے، اور انسان "ان کہی" کو بھی کہہ جاتا ہے۔

اس کی مثال جوشی صاحب کا وہ خطاب ہے جو انہوں نے اس موقع سے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "ہندو دھرم میں فیشن کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ خواتین اور نوعمر بچے ہماری مذہبی تقاریب میں شرکت کرنے سے گریز کرتے ہیں"۔ یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے، اور اگر گنیش تہوار کی حقیقت پر غور کیجئے تو یہ خود کس قدر مضحکہ خیز ہے، بدن انسان کا اور سر کا حصہ ہاتھی کا، یہ ظرافت اور پاکیزگی خیال سے خالی افسانوی کہانی تو ہو سکتی ہے، عقل و دانش کبھی اسے باور نہیں کر سکتی، ایک مہذب قوم سے متعلق دیومالائی کہانی پر تہوار کی بنیاد ہے۔ پھر اس کو منانے کا طور و طریق بھی کتنا عجیب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ تہوار قومی وحدت کی برقراری اور مذہبی وابستگی کے اظہار کا ایک

بہترین موقع ہے۔ انسان اپنی انفرادی شخصیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی بھی چاہتا ہے، اور یہ ایک طرح سے انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے، اسی لئے دنیا کی کوئی قوم نہیں، جو تہواروں، میلوں، بازاروں اور قومی دنوں کی صورت میں اجتماعی تقریبات منعقد نہ کرتی ہو، یہ تقریبات جہاں اجتماعیت کا مظہر اور اپنے مذہب سے وابستگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں، وہیں اس مذہب کے مزاج و مذاق اور اس کے افکار و تصورات کی عکاسی بھی ہوتی ہیں، اسلام سے پہلے بھی عربوں میں بعض تہوار ہوا کرتے تھے، ایران میں موسم بہار کی آمد اور اسی کے وقت، بہت گرم جوشی تقریبات منعقد ہوتی تھیں، بعض اہل مدینہ نے بھی آپ ﷺ سے ان ایرانی تقریبات نیروز اور مہرجان کے منانے کی اجازت چاہی، لیکن آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی اور اس کے بجائے مسلمانوں کے لئے دو عیدیں مقرر فرمائیں ایک عید الفطر اور دوسرے عید الاضحی، اسلام میں یہی دو تہوار ہیں۔

اسلامی تہواروں کی کچھ خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے مذاہب کی تقریبات سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں پہلی چیز معقول بنیاد و اساس پر اس کا وجود ہے، رمضان المبارک کے تیس روزے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں رکھے جاتے ہیں، اسی ماہ میں پیغمبر اسلام ﷺ پر نزول قرآن کا آغاز ہوا، عید الفطر کا مقصد کتاب الٰہی کے حاصل ہونے اور خدا کا ایک حکم بجالانے کی توفیق میسر ہونے پر اظہار شکر ہے۔ اسی طرح بقر عید اللہ کے ایک پیغمبر کی طرف سے رضاء الٰہی کی خاطر قربانی کا، اپنے بیٹے کو بھینٹ چڑھا دینے کی کوشش کی یادگار ہے، اور اللہ تعالیٰ سے عہد وفا کی تجدید ہے کہ وہ اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے، غرض ان دو تہواروں کی بنیاد پاکیزہ اور عقل و دانش سے ہم آہنگ واقعات پر ہے، نہ کہ توہم اور خلاف عقل افسانوں پر۔

دوسری خصوصیت اسلامی تہواروں کی فضول خرچی سے اجتناب اور ان اخراجات کو اپنے غریب بھائیوں کی مدد میں استعمال کرنا ہے، عید الفطر کے موقعہ پر صاحب استطاعت مسلمان پر صدقۂ فطر واجب ہے، جس کا مقصد اپنی خوشی میں اپنے غریب بھائیوں کو شریک کرنا ہے، اسی طرح ہر صاحب حیثیت مسلمان پر اس کی دولت میں ڈھائی فیصد

زکوٰۃ واجب ہے۔ جو عام طور پر رمضان المبارک ہی میں نکالی جاتی ہے۔ اسی لئے عیدالفطر میں غریب سے غریب گھرانا بھی نئے کپڑے سلاتا ہے۔ اور چند ثانیہ کی آسودہ ہو کر کھاتا پیتا ہے۔ بقر عید سے قربانی متعلق کی گئی ہے۔ قربانی بھی خوش حال مسلمانوں پر واجب ہے۔ قربانی کے گوشت کا ایک حصہ غربا پر اور ایک حصہ اپنے اقربا اور رشتہ داروں پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر جانوروں کی کھال فروخت کر کے اس کی قیمت بھی غریب لوگوں ہی پر صرف کی جاتی ہے۔ یہ اسلامی طریقہ پر اگر عیدین کو منایا جائے تو اس میں فضول خرچی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ غریبوں کی اعانت خوشی کے ہر موقعہ پر ملحوظ ہے، غور فرمائیے کہ لاکھوں کی تعداد میں مورتیاں بنانے پر کتنے اخراجات آتے ہوں گے؟ پھر زیبائش و آرائش، روشنی اور گانے بجانے پر کس قدر خرچ ہوتا ہے؟ پوجا کے منتظمین اس کے لئے دکانداروں سے جبراً بھاری رقوم وصول کرتے ہیں، جگہ جگہ راہ گیروں سے چندہ وصول کیا جاتا ہے۔ غریب مزدوروں تک کو نہیں چھوڑا جاتا، اس کے لئے جھگڑے بھی ہوتے ہیں، اور ایسا بھی ہوا ہے کہ اس جھگڑے نے قتل و قتال کی صورت اختیار کر لی۔ پھر یہ کروڑوں روپے چند دنوں کے بعد پانی کی نذر کر دیئے جاتے ہیں، نہ خود چندہ دینے والوں کو اس سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے، اور نہ سماج کے غریب لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ پہونچتا ہے۔ حالانکہ ان بھاری رقوم سے لاکھوں غریب انسانوں کو کئی دنوں بھوک سے بچایا جا سکتا تھا، اور ان کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

اسلامی تہواروں کا سب سے بڑا امتیاز نظم و ڈسپلن اور تہذیب و شائستگی ہے، نہ جلوس ہے، نہ ریلی، نہ تلوار کی نمائش ہے نہ لاٹھی کی، نہ پٹاخے ہیں نہ آتش بازی، نہ دلوں کو دہلا دینے والا شور و ہنگامہ اور نہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو گھبرا دینے والا اشتعال انگیز نعرہ، بلکہ ہر مسلمان صبح سویرے نہا دھو کر، سفید کپڑے پہن کر، خوشبو لگا کر گھر سے عیدگاہ کی طرف نکلتا ہے، زبان پر تکبیر کے بول ہیں، اس میں بھی نہ اپنی بڑائی، نہ کسی کو للکار، بلکہ خدا کی کبریائی اور حمد و ثنا، عیدگاہ پہونچے، دو رکعت نماز ادا کی، پہلے گردن جھکائی، پھر پیشانی زمین پر رکھی۔ دوگانہ شکر ادا کر کے دعائیں اور خطبہ سنا، ایک دوسرے کو مبارکباد

دی، کیا امیر کیا غریب، کیا بڑے اور کیا چھوٹے، سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اور خوشی کا یہ اثر ایسا چھایا کہ اس کی لو غریب پڑوسیوں کے گھر بھی پہنچی۔ نہ کسی کے خلاف نعرہ بازی، اور نہ کسی سے معرکہ آرائی، بوڑھے، جوان، بچے، عورت، مرد، اور سب اس تقریب میں شریک ہیں، بے خوف اور مطمئن، بے خطر اور محفوظ۔ کتنی شائستگی ہے ان تہواروں میں! اور کتنی شرافت کی مظہر ہیں یہ تقریبات! گویا نور کا ایک سمندر ہے، جو فرحاں و شاداں خدا کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے، اپنی ''انا'' کا انکار کرتے ہوئے، جھکتا ہے، خوب جھکتا ہے، اور اپنی جبین بندگی کو خاک آلود کرتا ہے۔ اخوت و بھائی چارگی اور وحدت و اجتماعیت اس کے ایک ایک منظر سے نمایاں ہے۔

ہمارے برادرانِ وطن نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، قومی اخوت، اتحاد، ذات پات کے تصور کی مخالفت، اپنی مذہبی وابستگی کا احساس، تہذیب و ثقافت، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا سلیقہ، اور نہ جانے کیا کیا؟ کاش وہ مسلمانوں سے مذہبی تقریبات کا سبق بھی سیکھتے! تو نہ ہندو تہواروں سے قبل دنگا فساد برپا ہوتا، اور نہ دیوالی میں آتش بازیوں کی صورت لوگوں کی گاڑھی کمائی جل کر خاکستر ہوتی، اور نہ تہواروں کے نام پر بے حیائی اور بے شرمی کے مناظر دیکھنے میں آتے۔ لیکن دوسروں سے کیا شکوہ، اور غیروں سے کیا گلہ! کیا یہ حقیقت نہیں کہ خود مسلمانوں نے اپنے مہذب اور شائستہ طور طریق کو خیرآباد کہہ کر غیر مہذب اور ناشائستہ طریقے اختیار کر رکھے ہیں؟ کیا ہم شب برأت میں پٹاخے اور آتش بازیاں دیوالی سے کم کرتے ہیں؟ کیا بے مقصد جلوس اور ریلی ہم نے غیروں سے نہ لئے؟ کیا شور شرابے کے ساتھ ہم نے بھی بعض تقریبات دیوالی نہیں کر لی ہیں؟ مقام فکر ہے کہ دوسری قومیں اپنے ناشائستہ طور طریق پر شرمائیں اور ہم ان کی طریقوں کو دیکھ کر اپنے لئے جائز تصور کریں!!

(۲۶/ مارچ ۱۹۹۹ء)

غم کے زیر سایہ عید

کیوں نہ کہوں کہ آج عید سعید کا دن ہے؟ عید دامن مراد کو بھرتی ہے، عید خوشیوں کی سوغات ساتھ لاتی ہے، عید سے مسرت کے غنچے کھلتے اور غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، عید تو قصر شاہی سے لے کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک ہر جگہ خوشیاں بانٹتی ہے اور پروانۂ شادمانی لے کر کاشانوں سے آشیانوں تک ہر جا پہنچتی ہے، مگر کیا ہے کہ آج کی اس عید پر غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، آج آنکھیں خوشی کے آنسوؤں کے بجائے، افسوس ہائے غم کا بھیگی ہوئی ہیں، زبان پر قہقہۂ مسرت کے بجائے نالۂ و غم آیا چاہتا ہے، دل میں خوشی و مسرت کی جھلک نہیں، بلکہ صدمہ و افسوس کے انگارے سلگ رہے ہیں، چمن خداوندی کی جن کیاریوں میں گل و سمن مہکتے اور خوبصورت پھول سے زیب تن ہیں، لیکن یہی باغباں جس پر نگاہیں تو ٹکی رہتی تھیں، آج منہ چڑا رہی ہیں اور محرومئ قسمت کا مذاق اڑا رہی ہیں۔

آہ! یہ کیسی سرزمین ہے جہاں عرب کے بادیہ نشیں سلامتی کا پیام محبت لے کر آئے، کوئی قافلہ مالابار کے ساحل پر اترا اور کوئی سندھ کے صحراؤں میں خیمہ زن ہوا، اس نے اس ملک کو انسانی وحدت کا پیغام سنایا، انسانوں اور انسانوں کے درمیان جس تفریق کو روا رکھا گیا تھا، اسے مٹایا، دبے کچلے لوگوں کو اوپر اٹھایا، عورتوں کو حیا کی چادر دی اور عزت و احترام دیا، ستی کی رسم قبیح کی، اونچ نیچ کے خلاف آواز بلند کی، وحدت خداوندی کی صدا لگائی، انسانوں کو مخلوق کے سامنے جبین بندگی خم کرنے کی ذلت سے آزاد کرنے کی سعی کی، وہ جہاں گئے محبت کے موتی بکھیر گئے، ظلم کو روکا، جور و ستم سے بچایا، تمام لوگوں کو مذہبی آزادی دی، کسی کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے اس ملک کے چپے چپے کو اپنے سجدوں سے آباد کیا اور اخلاق و محبت کے چراغ ہر قدم جلائے، اپنے عدل و انصاف کے ذریعہ دشمنوں کو دوست بنایا اور جس کو دوست بنا لیا، الغرض مسلمانوں نے شاہی کے جذبات سے پ

رہے تھے وہی ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کم و بیش آٹھ سو سال اس ملک پر اس طرح گذرے کہ ہر صبح سورج ان کی ظفر مندی اور اولوالعزمی کا پیام لے کر طلوع ہوتا تھا۔ اگر یہ قوم دشمن کو تہ تیغ کرنے کا مزاج رکھتی تو مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود اس سرزمین کو تکنے کے لیے بھی شاید باقی نہیں رہتا، اگر مسلمان جبر و قہر کے ساتھ دوسری قوموں کو مسلمان بنانے کے قائل ہوتے تو چند نسلیں ہی اس ملک کی قسمت بدلنے کے لیے کافی ہوتیں، اور اتنے طویل عرصے کے بعد بھی اکثریت و اقلیت کا جھگڑا باقی نہیں رہتا، مسلمانوں نے سیاست و جنگ کے میدان میں جتنی طالع آزمائی کی، اگر انھوں نے اس کی ایک چوتھائی، بلکہ اس سے بھی کم محنت دعوتِ اسلام کے لیے صرف کی ہوتی تو یقیناً یہ ملک گلشنِ اسلام بن کر پوری دنیا کو معطر کرنے کے موقف میں ہوتا، لیکن مسلمانوں نے نہ جبر و ظلم اور جبر و اکراہ کی وہ راہ اختیار کی جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے اور جو یقیناً مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں اور نہ دعوتِ دین کے اس فریضہ کی طرف توجہ دی جو اس کا منصبی فریضہ اور اس کی اساسی ذمہ داری ہے۔

اس طویل عرصۂ حکمرانی میں انھوں نے وسیع تر متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، عربوں کی فراخ دلی و سادگی کو عجم کی نزاکت اور لطافت عطا کی، ثقافت و تہذیب کے سبق دیے، معاشی استحکام بخشا اور اسے سونے کی چڑیا بنایا، پھر اس چڑیے کے بال و پر نوچنے کے بجائے اسے سنوارتے اور نکھارتے رہے، اس ملک کے چپے چپے کو حسین و جمیل عمارتوں، پرشکوہ قلعوں، فلک بوس میناروں اور سبزہ زار باغیچوں کے تحفوں سے سجایا اور اس کی عزت و شہرت کو دوچند کیا، لیکن چوں کہ اس بار آور سرزمین پر ایمان کی تخم ریزی نہیں کی گئی اور اس گلشن کو گلہائے ہدایت سے سنوارنے کی کوشش نہیں ہوئی، اس لیے بالآخر بلند اقبالی و ظفر مندی کے سورج نے اپنا منہ پھیر لیا اور غلامی کی زنجیر نے پورے ملک کو پابہ جولاں کرکے رکھ دیا۔

اس عہد غلامی میں انگریز دشمنوں نے اس ملک کے اصل باشندوں کے درمیان نفرت کی کھیتی لگائی اور ایک ایسی تاریخ رقم کرنی شروع کی جو بے دلیل و ثبوت تھی اور جس کا

مقصد انگریزوں کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کرنا تھا۔ اس جھوٹی تاریخ کا ایک حصہ بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے مندر کو منہدم کرکے مسجد تعمیر کیا تھا، لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابلِ یقین ہے، کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا گیا تھا۔ جو بابر نے خود ترکی زبان میں "بابر نامہ" تحریر کیا ہے، نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ بابر نامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۷۲ میل دور ٹھہرا ہوا تھا، چنانچہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں کہ بابر یا اس کے نائب ایودھیا آئے ہوں۔ (بابر ۹۳) پروفیسر آر۔ ناتھ (یونیورسٹی آف راجستھان جے پور) نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا۔ (بابر ۹۶)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہے اس کی صداقت کو پرکھنے کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج، مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے۔ اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ بابر شدید مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا۔ منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ ایشوری پرساد نے اپنی کتاب ''آئینہ تاریخ نما'' کے پہلے حصے میں بابر کے عدل و انصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کے دور میں نظم حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے۔ وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا تھا۔ پروفیسر آر ناتھ کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جاسکے۔ پروفیسر شری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم روا رکھا ہو۔ پروفیسر رائے چودھری لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا۔ (بابر ۹۰)

مشہور محقق سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی

رواداری کی بڑی عالی ظرفی اور حسن سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر شرما جی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ برتاؤ اور کسی عہد میں ہندوؤں کے قتل ہونے کا ذکر نہیں ہے اور اس کی طرف منسوب مندروں اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے۔ اور پروفیسر سری واستو نے اپنی پوری تحقیق سے واضح کیا ہے۔ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے تطبیق میل نہیں کھاتے۔ (بابر:۹۲) یہاں تک کہ بابر نے بیٹے وصیت نامہ میں گاؤ کشی سے منع کیا ہے تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے:

''میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں ... رام چرت مانس یا تلسی داس کے کسی دوسرے سنجے میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر مسجد بنائی گئی ہو۔ ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ہے کہ رام چندر جی کے جنم استھان پر بابری مسجد بنائی گئی ہو۔ رام چندر جی کی جنم استھلی اور اس جگہ میں فرق ہے جہاں بابری مسجد تھی۔''

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی ہے کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کرکے بنائی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی جوڑ دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔ میر باقی چونکہ وحدت ادیان کا مجنون سا تھا، اس لیے اس نے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی بٹھا دی تھی۔ ۱۹۳۴ء سے پہلے تک بابری مسجد کے کسی حق کے سلسلہ میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے۔ مارچ ۱۸۸۵ء میں جب پہلی مرتبہ یہ مقدمہ عدالت میں گیا اس وقت مہنت رگھوبر داس نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کی مورتی کو سردی گرمی اور برسات سے بچانے کے لیے چبوترے کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے، لیکن ۲۴/دسمبر ۱۸۸۵ء کو عدالت نے یہ عرضی رد کر دی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود

ہندو بھائیوں کے یہاں بھی مندر کے انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے سے نہیں پایا جاتا تھا۔

ان سب کے باوجود سنگھ پریوار نے اس مسئلہ کو لے کر نفرت کی آگ سلگائی اور اس کے شعلے خوب بھڑکائے، یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ظلماً شہید کردی گئی اور اس کے بعد جو فسادات پھوٹ پڑے ان میں ہزاروں مسلمان شہادت سے سرفراز ہوئے۔ آج بھی یہ حادثہ ہندوستان کے سیکولرزم کے لئے ایک امتحان بنا ہوا ہے۔ ایسے موقع پر ایک طرف ہمیں تمام جائز تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، دوسری طرف اللہ سے رجوع کرنا چاہئے کہ مؤمن کی کامیابی و سرخروئی کا اصل راستہ خدا کی مدد ہے، اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ''اے ایمان والو! صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو'' یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ (بقرہ: ۱۵۳) صلوٰۃ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے رجوع اور انابت کا عملی عنوان! بے قراروں کے قرار کا سامان کرتے ہوئے قرآن نے کیا خوب کہا ہے

''اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔'' (نمل: ۶۲)

''کون ہے جو بے قرار کی التجا سنتا ہے، جب کہ وہ اس سے دعا کرتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے، نیز کون ہے جو تم کو زمین میں اگلوں کا جانشین بناتا ہے؟''

پس آیئے! اس آن قبولیت اور استجابت کی ہر گھڑی میں اللہ کے سامنے دست سوال پھیلائیں، اس سے اپنی عجز و درماندگی کا اظہار کریں، اسی کے دربار میں آنسوؤں سے وضو کریں، اس کی چوکھٹ پر سر رکھ کر التجا کریں کہ الٰہی! ہمارے گناہ بہت ہیں، ہماری کوتاہیاں بے شمار ہیں، لیکن آپ کے عفو و درگذر کا دامن اس سے بھی وسیع ہے، ہماری کوتاہیاں اپنی جگہ، لیکن ہم آپ ہی کی طرف منسوب ہیں اور اسی نسبت سے مارے جاتے ہیں اور ستائے جاتے ہیں، بے آبرو کیے جاتے ہیں اور جرم بے گناہی کی پاداش میں بدنام کیے جاتے ہیں، خداوندا! اس نسبت کا خیال فرما! اور مظلوموں کے حق میں گرفتاران وحشت کے

سفینہ کو ساحلِ مراد تک پہنچایا! عجبا! عید کے دن جو انعام (جائزہ) کا دن ہے، اس نے پوری امت کو خوشیوں سے ہمکنار فرمایا! جو امت ذلت و رسوائی کے دن دیکھتے دیکھتے اور اپنی بے توقیری کی خبریں سنتے سنتے بوڑھی ہو رہی تھی، جو بے بسی کے دور سے گذر رہی ہے، اسے فتح مبین سے سرفراز فرمایا! اور اس نئے سال کو اس کے لیے برکت و سعادت، فتح و نصرت، استجابت و عزت و وقار کا سال بنادے! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. آمین یا رب العالمین!

(۶ دسمبر ۲۰۰۲ء)

اسوۂ ابراہیمی

[illegible]

کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ یہ حج کی قربانی اسی ذبحِ عظیم کی یادگار ہے۔ جس میں آپ پیغمبر نے اپنے لختِ دل کو اپنے محبوب خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ جمرات کی کنکریاں عزمِ ابراہیمی اور وسوسۂ شیطانی سے بچنے کی آمادگی کا اظہار ہے۔

یہی اسوۂ ابراہیمی ہے کہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی خاطر قربان ہو جائے۔ اپنی اور اپنوں کی خواہش، دوستوں اور قرابت داروں کی خوشی۔ انسانی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں کہ خدا کا حکم اور ہوتا ہے، انسان کی خواہش کچھ اور۔ نفس چاہتا ہے کہ حلال و حرام شریعت اسے ناروا قرار دیتی ہیں، یہی وقت ہے امتحان کا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرنے کا۔ شادی بیاہ کا موقع ہو، دیکھئے تو شریعت کی طرف سے سادگی کا مطالبہ ہے، نوشہ کے والدین کی خواہش ہے کہ جہیز خوب سے خوب تر آئے اور اچھا خاصا انتظام ہو، نوشہ کی والدہ کی طرف سے زیورات کی طلب ہے، سماج بضد ہے کہ جہیز کی کوئی چیز باقی نہ رہ جائے، احباب چاہتے ہیں کہ اس موقع سے خوشی منائیں اور دعوت کی تقریب میں بالکل آتش بازی ہو، اور اس طرح کی مرضی ان سب سے مختلف ہے۔ شریعت اس کو اسراف و فضول خرچی قرار دیتی ہے، یہ نکاح سنت ہے جو خوشی کا موقع ہے، یہ موقع خدا کا شکر بجا لانے کا ہے، اس سے بڑھ کر سمجھنے کا ہے، خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کا ہے۔ یہی وقت ہے کہ انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرے کہ کیا وہ اپنے جذبات و خواہشات کو خدا کی مرضی پر قربان کرے اور اپنے متعلقین کی خواہش کو خدا اور رسول کی خوشنودی کے لئے بھینٹ چڑھا سکتا ہے؟

انسان کے لئے بڑے امتحان کا موقع کسبِ معاش کے مراحل ہیں، جن میں حلال و حرام کا امتیاز برتنا ہی دراصل تقویٰ کی اصل روح ہے۔ امام محمد سے کسی نے عرض کیا کہ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، زہد و تقویٰ پر کوئی تصنیف آپ نے قلم بند نہیں فرمائی؟ امام محمد نے اپنی اس کتاب کا حوالہ دیا جس میں معاملات اور کسبِ معاش کے احکام ہیں اور فرمایا کہ یہی زہد و تقویٰ کی کتاب ہے۔ کیونکہ معاش کے معاملہ میں اپنے آپ کو حلال کی حدود میں قائم رکھنا اور حرام سے بچائے رکھنا ہی انسان کی حقیقی آزمائش ہے

بے زبان میں اپنے آپ کو حکم شریعت کا پابند بنا لینا اصل تقویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات انسان کے لئے نماز روزہ کا اہتمام آسان ہوتا ہے، آدمی حسب توفیق کچھ ذکر و تسبیح بھی کر لیتا ہے، لیکن اپنے آپ کو اس نفع سے دست کش رکھنا دشوار ہوتا ہے جس کو شریعت جائز نہ رکھتی ہو اور جس کو آج کا سودی نظام حلال کئے ہوئے ہے۔ یہ مواقع ہیں کہ جہاں اسوۂ ابراہیمی ایک صاحب ایمان کے سامنے آئینہ بن کر آجاتا ہے، وہ اس میں اپنے ایمان، حکم خداوندی کے سامنے تسلیم و رضا اور شریعت الٰہی کے سامنے سرافگندگی کی تصویر دیکھے اور خود اپنے آپ کو تولے کہ اس نے جانور کی قربانی کر کے علامتی طور پر خدا سے خود سپردگی کا جو وعدہ کیا تھا، کیا وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس وعدہ کو وفا کر رہا ہے؟؟

[۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء]

ہجری کیلنڈر

لیجئے! کیلنڈر نے ایک اور صفحہ الٹ دیا، اب ۱۴۱۸ھ کے بجائے ۱۴۱۹ھ ہے۔ اسلامی کیلنڈر "ہجری کیلنڈر" کہلاتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے واقعۂ ہجرت کی طرف اس کی نسبت ہے، عربی زبان میں "ہجر" کے معنی چھوڑنے کے ہیں، اسی سے ہجرت کا لفظ ماخوذ ہے، ہجرت ایک اسلامی اصطلاح ہے، ایمان کی حفاظت یا دین کی اشاعت کی غرض سے ترکِ وطن کرنے کو "ہجرت" کہتے ہیں۔ "تارکینِ وطن" آج کل ایک بین قومی اصطلاح ہے، ہر ملک میں تارکینِ وطن موجود ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، یہ وہ تارکینِ وطن ہیں جنہوں نے معاشی اور سیاسی مقاصد کے تحت اپنا وطن چھوڑا ہے، ان کو مہاجرین کہنا "ہجرت" کے مقدس لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

ہجرت دراصل پیغمبروں کی سنت ہے۔ شاید ہی کوئی پیغمبر ہوں جس کو ہجرت نہ کرنی پڑی ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام وغیرہ کی ہجرت کے واقعات تو خود قرآن مجید میں مذکور ہیں، لیکن تاریخ میں ہجرت کے نام سے جو شہرہ آپ ﷺ کی ہجرت کو ہوا، کسی اور پیغمبر کی ہجرت کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے اور ٹھیک ۴۰ سال کی عمر یعنی ۶۱۱ء میں آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، آپ ﷺ کی صداقت و دیانت اور اخلاقی خوبیوں کا پورے مکہ میں چرچا تھا، آپ ﷺ نے اپنا بچپن اور جوانی اسی مکہ میں گزارا، نبوت کے بعد آپ ﷺ کے خلاف لوگوں نے ہر طرح کی ایذا رسانی کا راستہ اختیار کیا، لیکن کوئی انگلی نہ تھی جو آپ ﷺ کے کردار پر اٹھے اور کوئی زبان نہ تھی جو آپ ﷺ کی دیانت و پاکیزگی پر کھلے۔

۱۳ سال آپ ﷺ نے مکہ میں دعوتِ دین کی جدوجہد فرمائی۔ یہ ۱۳ سال ایسے گزرے کہ شب و روز آپ ﷺ بے قرار رہتے کہ کسی طرح لوگ شرک سے توبہ کر کے اللہ کو پالیں اور

تک ہر راستے کی طرف آجاتیں، پورا دن آپ ﷺ گھاٹیوں، کوچوں اور بازاروں میں گھوم گھوم کر دعوت دینے میں گزارتے، ایک ایک دروازہ پر پہنچتے اور دروازوں پر دستک دیتے، ایک ایک شخص سے ملتے اور اس کی خوشامد فرماتے لیکن بہت کم لوگ تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ حق کی روشنی ان کے سامنے دوپہر کی دھوپ کی طرح کھل کر آگئی مگر ہٹ دھرمی اور بے دینی کو چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں تھے، کیوں کہ یہی ان کے آباء واجداد کا مذہب تھا۔ اس درمیان کوئی تکلیف نہ تھی جو آپ ﷺ کو پہنچائی نہ گئی ہو، آپ ﷺ کا پورے خاندان سمیت بائیکاٹ کیا گیا، مسلمان فقر وفاقہ کرتے تھے اور آپ ﷺ اپنے اہل خاندان کے ساتھ درخت کے پتے اور چھال تک کھانے پر مجبور تھے، جسم اقدس پر دوحت کی اوجھ اور غلاظت ڈالی دی گئی، گلے میں پھندہ ڈال کر جان لینے کی کوشش کی گئی، راستہ میں کانٹے بچھائے گئے، جملے کسے گئے اور تالیاں بجائی گئیں، آپ ﷺ کو قتل کا احتمال اور ہجرت پر مجبور کیا گیا۔

نبوت کے سال آپ ﷺ نے طائف کا رخ کیا، شاید ان کو قبول اسلام کی توفیق ہو، لیکن طائف کی زمین مکہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ آپ ﷺ کے پیچھے اوباش لڑکوں کو بھی لگا دیا، آپ ﷺ پر پتھر پھینکتے، مذاق اڑاتے، ہنستے اور تمسخر کرتے، جسم لہولہان ہوگیا، نعلین مبارک میں خون جم گئے، گھٹنے زخمی ہوگئے، آپ ﷺ بیٹھ جاتے تو یہ آپ ﷺ کو کھڑا کر دیتے، حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو کاندھوں پر اٹھالیا اور ایک باغ کی چہار دیواری ٹوٹے ہوئے دل اور اشکبار آنکھوں سے آپ ﷺ خدا کی طرف متوجہ ہوئے، جب مطمئن ہوگئے تو بڑی پر درد دعا فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا:

> ”الٰہی! اپنے ضعف و بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں، آپ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، درماندہ بے کسوں کے پروردگار آپ ہی ہیں، آپ ہی میرے مالک ہیں، آخر آپ مجھے کس کے حوالے کررہے

ہیں؟ کیا اس حریف بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی روا رکھتا ہے یا ایسے دشمن کے حوالے، جسے میرے معاملہ پر قابو دے رکھا ہے؟! لیکن اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں، بس آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ وسعت رکھتی ہے، میں اس بات کے مقابلہ میں کہ آپ کا غضب مجھ پر پڑے یا آپ کا عذاب مجھ پر نازل ہو آپ ہی کے نورِ جمال کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے تمام معاملات سنور جاتے ہیں، مجھے تو آپ کی رضامندی اور خوشنودی مطلوب ہے، آپ کے سوا کہیں سے کوئی قوت و طاقت نہیں مل سکتی۔"

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایمان اور اسلام کی جو تخم آپ ﷺ نے مکہ اور طائف کی سرزمین میں بوئی تھی، اللہ اس سے اہل مدینہ کے دلوں کو بارآور فرما رہا تھا، بارش کہیں اور ہو رہی تھی اور اس کا آبِ حیات کہیں اور جمع ہو رہا تھا، حج کے موسم سے مدینہ کے جن مکہ آنے والوں کے کان آپ ﷺ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے، وہ مخلص اور حق کے متلاشی تھے، چند اور آئے تھے، اس سے فوراً ہی کافی ... وہاں تک کا فاصلہ طے ہوا، ایمان لانے اور اہل ایمان کو پناہ دینے کا عہد بھی کیا گیا، مکہ میں تو حضرات اہل ایمان پر ستم سے تنگی روز افزوں ہوتی جاتی تھی، بعض مسلمانوں کو گلے میں پھندا ڈال کر سڑکوں پر گھسیٹا جاتا، بعضوں کو دہکتے ہوئے شعلوں پر لٹایا جاتا اور ان کے زخم سے بہنے والے لہو سے آگ بجھائی جاتی، کسی کو دھوئیں کی دھونی دی جاتی، بعضے تو بے رحمی سے شہید کر دیئے گئے۔

لیکن مجال نہ تھی کہ یہ دامن مسلمانوں سے چھوٹ جائے، مرضی خداوندی کے بغیر وہ اپنے طور سے فیصلہ کریں۔ آخر خود خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آ جائیں، مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ نکلے اور صرف وہی مکہ میں رہ گئے، جو یہاں سے جا نہیں سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ ابھی تک مکہ ہی میں مقیم تھے، اور اپنے بارے میں حکم خداوندی کے منتظر، مکہ کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا، ہر قبیلہ سے ایک

ایک نے خود سے آگے بڑھ کر دولت کو حاصل کرنا چاہا اور خدائی طرف سے صورتحال نے آپ ﷺ کو بچا لیا۔ آپ ﷺ پورے اطمینان کے ساتھ قرآن کی آیتیں پڑھتے ہوئے اور ایک مدت غار کی صورت میں رہ کر پہنچتے ہوئے باہر نکل آئے اور چھپتے چھپاتے کچھ دنوں میں مدینہ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ کے سر پر انعام مقرر ہوا، پیچھا کرنے والوں نے پیچھا کیا، واپس چلے گئے، آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر کی جان لینے کی کوشش میں کوئی کسر نہ رکھی، مگر خدائی تدبیر کے سامنے ساری تدبیریں اکارت گئیں اور نبوت کا جو آفتاب مکہ میں طلوع ہوا تھا، مدینہ میں بدرِ تمام بن کر روشن ہوا۔

آپ ﷺ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو جشن کا سماں تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت، آقا اور غلام، بڑے اور چھوٹے، دل اور آنکھیں بچھائے پروانہ وار کھڑے تھے، زبان پر استقبالیہ نغمے، نگاہیں شوق سے بے تاب، یا تو مکہ کی سرزمین مسلمانوں پر تنگ تھی یا پھر مدینہ نے دل و جگر راہوں میں بچھا رکھے تھے۔ مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کو اہلِ مدینہ نے اپنے یہاں جگہ دی، گھر دیا، دولت دی، محبت اور مساوات کے تحفے دیئے اور سب سے بڑھ کر اخوت و محبت اور پیار کی سوغات دی۔ اہلِ مدینہ نے جو ایثار کیا، شاید ہی انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ اہلِ مکہ کی قربانیاں بھی کچھ کم نہیں، گھر چھوڑا، وطن چھوڑا، وطن کی فضاؤں کو خیرباد کہا، اعزہ و اقارب کی محبت قربان کی اور اپنا پیارا شہر چھوڑ کر ایک اجنبی منزل کو چل پڑے جس کا انجام نہ معلوم تھا اور مستقبل دونوں مجہول تھا، اس لئے آپ ﷺ نے مکہ سے ترکِ وطن کرنے والوں کو مہاجرین اور مدینہ کے رہنے والوں کو انصار کا نام دیا، مہاجرین کے معنی ہیں "دین کے لئے ترکِ وطن کرنے والا" اور انصار کے معنی ہیں "اپنا جان و مال نثار کرنے والا" مسلمانوں میں ان دونوں طبقوں نے ساتھ
[illegible]
[illegible]

ہجرت کا یہ واقعہ ایک طرف مسلمانوں کی قربانی اور دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے رفقاء عالی مقام کے ایثار و فداکاری کی یادگار ہے، وہ دوسری طرف آئندہ اسلام کو جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا مقدمہ۔ یہ محض مکہ سے مدینہ کی طرف سفر نہیں تھا، بلکہ مغلوبیت سے غلبہ و ظہور کی طرف اور مقہوریت سے طاقت و شوکت کی طرف سفر تھا، بظاہر مسلمانوں پر زمین تنگ ہو رہی تھی، لیکن خدا نے اسی تنگی میں آفاق کی وسعت کو سمو رکھا تھا، یہ واقعہ ناامیدیوں میں امید کی کرن سے روشناس کرتا ہے اور حوصلہ شکن حالات میں امید و حوصلہ کا چراغ جلاتا ہے اور اس بات کو بھی یاد دلاتا ہے کہ کیسی کیسی قربانیوں اور جاں نثاریوں سے خدا نے اس دین کو سر بلند کیا ہے اور کس قدر خون و لہو کے ذریعہ حق و صداقت کے اس شجرۂ طوبیٰ کی آبیاری فرمائی گئی ہے؟

حضرت عمرؓ کے سامنے بحیثیت خلیفہ ایک فائل آئی، جس میں تاریخ درج تھی، سال درج نہ تھا، آپؓ کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا اپنا کیلنڈر ہونا چاہئے۔ آپؓ نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز رکھی اور غالباً حضرت علیؓ کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ اسلامی کیلنڈر واقعۂ ہجرت پر مبنی ہونا چاہئے، چنانچہ مہینوں کی ترتیب وہی قائم رہی جو اسلام سے پہلے عربوں میں مروج تھی، محرم سے آغاز اور ذوالحجہ پر اختتام، اور سال کا آغاز واقعۂ ہجرت کے سال سے مانا گیا۔ اس طرح ۱۴۱۴ھ کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے واقعۂ ہجرت کو اتنے سال گزر چکے۔

کیلنڈر بھی کسی قوم کی اپنی ثقافت ہوتی ہے، اس سے قوم و ملت کی تاریخ وابستہ ہوتی ہے، ہجری کیلنڈر پر غور کر جائیے، اس میں اکثر مہینوں کے نام وہ ہیں جو اسلامی عبادات اور مسلمانوں کی مذہبی روایات کی نشاندہی کرتے ہیں اور نام ہی سے ان مہینوں سے متعلق عبادات اور واقعات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، دوسری قوموں کے جو کیلنڈر مروج ہیں، وہ بھی ان کے مذہبی افکار و روایات کا مظہر ہیں، یہی حال مہینوں اور ہفتوں کے نام کا ہے، مثلاً sunday اور Monday کے الفاظ ہی پر غور کیجئے، ان کے معنی ہیں

سورج کے دن اور چاند کے دن۔ چونکہ اہلِ یونان کے یہاں ایک دن سورج کی پرستش کے لئے مقرر تھا اور ایک دن چاند کی پرستش کے لئے، اسی لئے مختلف دیوتاؤں کے نام سے بتوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ کچھ اسی طرح کا سٹی مہینوں کے نام کے پیچھے بھی کارفرما ہے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے ان کیلنڈروں کو قبول نہیں فرمایا، جو اس زمانہ میں مروج تھے۔

ہجری اسلامی کیلنڈر مسلمانوں کی اپنی ایک پہچان ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس کیلنڈر کو رواج دیں اور آنے والی نسلوں کو اس کے پس منظر اور اس کی دینی و ملی حیثیت سے واقف کرائیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ ہجری کیلنڈر کے چلن کو باقی رکھنا اور اس کی ترویج کی سعی کرنا فرضِ کفایہ یعنی امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ کیلنڈر ہمیں ہمارا آغاز یاد دلاتا ہے اور ہجرت کے عبرت آمیز اور موعظت انگیز واقعہ کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

(کلیم رحمتی، ۱۹۹۸ء)

اسوۂ حسنین رضی اللہ عنہما

رسول اللہ ﷺ اللہ کی جانب سے مصطفیٰ اور مجتبیٰ یعنی چنے ہوئے تھے۔ اللہ نے نبوت کے لئے آپ ﷺ کا انتخاب فرمایا تھا، جیسے اللہ نے آپ ﷺ کو نبوت جیسی عظیم ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا، اسی طرح آپ ﷺ کی رفاقت اور صحبت کے لئے بھی انسانیت کے منتخب اور برگزیدہ اشخاص کا انتخاب ہوا، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کی صحابیت کے لئے منتخب فرمایا ہے'': اختارهم الله لصحبة نبيه ، اسی طرح اللہ کی جانب سے آپ ﷺ کے اہل بیت اور پاک بیویاں بھی سرورِ اکرم کی رفاقت اور امت کے لئے خانگی اور نجی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے منتخب تھے۔ ان ہی اہل بیت میں آپ ﷺ کی صاحبزادیاں تھیں، اور ان صاحبزادیوں میں آپ کی چہیتی اور چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ نے خواتین جنت کی سردار قرار دیا، اور جن کے بارے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی گواہی ہے کہ آپ ﷺ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت فاطمہؓ سے تھی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں حضور سے بہت زیادہ مشابہ تھیں اور آپ پر حیاء کا اس قدر غلبہ تھا کہ عہد صحابہ میں بھی شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔

حضرت فاطمہؓ کے شوہر تھے خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ تھے۔ جو حضور ﷺ سے نسبی اعتبار سے قریب ترین تعلق رکھنے کے علاوہ اسلام میں سبقت سے مشرف تھے، اور حضور ﷺ کی نگاہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں جس کا دوست ہوں، علی اس کے دوست ہیں، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعلق اور محبت کو آپ نے اپنی محبت کا معیار بنایا، اہل سنت والجماعت کے معتبر علماء کا اس

بات پائی جاتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو یہودیوں کی سازش سے جو فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین کو حدیث میں "فئۃ باغیہ" (باغی گروہ) قرار دیا گیا۔ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے اور جو باحیات رہے، اور ان ہی دونوں حضرات سے رسول اللہ ﷺ کی مبارک نسل کا سلسلہ آگے بڑھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے نوجوانانِ جنت کا سردار قرار دیا، یہ روایت اہل سنت کے یہاں کثرت سے منقول ہے، رسول اللہ ﷺ ان دونوں کو پکڑتے، اور کہتے: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان دونوں سے محبت کیجئے (بخاری، حدیث نمبر: ۳۷۴۷) ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کو مجھ سے محبت ہوگی، وہ ان دونوں سے محبت رکھے گا۔ (مجمع الزوائد عن ابی ہریرۃ ۹/۱۸۰) عجیب بات ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ظاہری صورت سے بھی رسول پاک ﷺ سے بڑی مماثلت تھی، چنانچہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو صحابہؓ اور صالحین کو ناقابلِ بیان صدمہ ہوا، حضرت ام سلمہؓ کو جب اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع پہنچی، تو اہل عراق پر لعنت بھیجی اور ان کے لئے ہلاکت کی دعا فرمائی۔ (مجمع الزوائد ۹/۱۹۴) امام ابراہیم نخعیؒ نے خوب فرمایا کہ اگر میں ان قاتلانِ حسین میں سے ہوتا اور میری مغفرت ہو بھی جاتی اور میں جنت میں داخل کیا جاتا، تب بھی مجھے حضور ﷺ کا سامنا کرنے سے شرم محسوس ہوتی۔ (حوالہ سابق ۹/۱۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ اہل بیت سے محبت کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، وہ آل مصطفی ہیں، اور جس کو رسول اللہ ﷺ سے محبت کا کوئی درجہ حاصل ہو سکتا ہے، یہاں کا سبب ہے کہ یہ وہ حضرات ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھنے والے اور آپ کی محبت پانے والے تھے، اس لئے اہل بیت سے ان کا خاص تعلق تھا، بنی امیہ کا عمر بن عبدالعزیز ایک بار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ جب سے مجھے آپ کی رفاقت حاصل ہوئی ہے، مجھے آپ کی کسی بات سے ناگواری نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ آپ حسن و حسین سے محبت رکھتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سمٹ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، ایک جگہ حضور نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے رونے کی آواز سنی، حضرت فاطمہ بھی ساتھ تھیں۔ آپ تیز تیز چل کر وہاں پہنچے اور فرمایا کہ ہمارے بیٹوں کو کیا ہوا ہے؟ حضرت فاطمہ نے عرض کیا کہ پیاسے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے مشکیزے میں دیکھا تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سفر سے پانی کے بارے میں فرمایا تو تمام ہی لوگ پانی کے برتنوں کی طرف لپکے، لیکن اتفاق کہ کسی کے پاس پانی موجود نہیں، تو آپ ﷺ نے باری باری حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی زبان مبارک کو چسایا، جب انہیں سکون ہوا، تو آپ ﷺ کو اطمینان ہوا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسی لئے میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں۔ (طبرانی، مجمع الزوائد: ۹/ ۱۸۰) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ گلشن محمدی ﷺ کے ان غنچوں سے کس قدر اور کس بلا کی محبت رکھتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کا خوف بھی اس کے اظہار میں مانع نہ ہوتا تھا۔

لیکن کیا حضرات حسنین سے امت کی یہ محبت اور دربار رسالت مآب میں ان کا یہ درجہ و مقام صرف اسی وجہ سے تھا کہ یہ حضور ﷺ کے نواسے تھے؟ ___ یقیناً یہ نسبت بھی اس محبت میں کارفرما ہے، لیکن اس سے بڑھ کر حضرات حسنین کا اسوہ اور ان کا کردار ہے، جو قیامت تک کے لئے مشعل راہ ہے۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ منبر اقدس پر تھے، اور آپ ﷺ کے پہلو میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ تھے، آپ ایک دفعہ لوگوں کی طرف دیکھتے، اور ایک دفعہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف، اور ارشاد فرماتے: میرا یہ بیٹا سید (سردار امت) ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائیں گے۔

(بخاری حدیث نمبر ۲۷۰۴)

رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی اس وقت حرف بہ حرف پوری ہوئی جب خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہل شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں آگے بڑھے، اور ادھر اہل حجاز اور اہل عراق حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، عددی برتری بھی تھی اور اکابر تابعین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان کے موقف کے مؤید تھے، اور بقول حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پہاڑوں کی طرح لشکر جرار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رکاب میں تھا، اور ایسے جوان تیار کھڑے تھے کہ بظاہر ان کا پشت دکھا کر بھاگنا ہرگز متوقع نہیں تھا، بظاہر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غالب آنے کی توقع زیادہ تھی، لیکن جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلح کی پیشکش ہوئی تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے بہت سے رفقاء کی مخالفت یا دل گیر ہونے اور طعن و تشنیع کے باوجود اس پیشکش کو قبول کیا اور اپنا ہاتھ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے کر مسلمانوں کی خونریزی روک دی اور امت کو ایک جھنڈے کے نیچے لا کھڑا کیا، اس طرح وہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی جو رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں فرمائی تھی، یہ بہت بڑی قربانی تھی، اور اسی قربانی نے اسلام کی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عظمت منارۂ نور کی طرح روشن کر دی، علمائے اسلام نے تحقیق کیا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید ان کو یہ مقام حاصل نہ ہوتا، اور دونوں کے درمیان کی جنگ کی انتہا نہ ہوتی۔

چنانچہ ایک دفعہ پھر پورا عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے آگیا، اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں مسلمان فتوحات کی طرف بڑھنے لگے، اس سے حقیقت پسند مؤرخین یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس عمل کا سہرا سب سے زیادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ایثار کا حصہ ہے!

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں دستبردار ہونا اس لئے نہیں تھا کہ آپ حکومت کی دھن میں رہتے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ تو شروع سے زہد و تقویٰ کی نسبت کے

جو شرف حاصل تھا، اس پر ہزار حکومتیں قربان اور نچھاور تھیں۔ بلکہ حسن یہ ہے کہ اسلام جس دور میں آیا، وہ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کا دور تھا، اس وقت کی معلوم دنیا میں جہاں بھی چھوٹی بڑی حکومت تھی، ان کی اساس خاندانی بادشاہت پر تھی، اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح کی، وہیں نظام سیاست کی بھی اصلاح کی، اور خلافت کا تصور دیا۔

خلافت میں دو چیزیں اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اس منصب کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے، جو اخلاق و کردار کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہو، دوسرے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے اس کا انتخاب کیا ہو، اسی اصول پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ رکنی کمیٹی بنادی، اور ان حضرات نے عام مسلمانوں سے مشورہ اور باہمی تبادلہ خیال کے ذریعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد اہل مدینہ اور اکابر صحابہ نے بااصرار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جن صحابہ کو اختلاف تھا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے بارے میں تھا، ورنہ ان کی لیاقت کے بارے میں کسی کو کلام نہیں تھا، اور اسی لئے تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک وہی خلیفہ برحق تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی آپ اپنی خلافت کا اعلان نہیں فرمایا، بلکہ اس عہد کے ارباب حل وعقد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جس تیس سالہ خلافت راشدہ کی پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے چھ ماہ عہد خلافت پر مکمل ہو جاتی ہے۔

یزید کی حکمرانی سے ایک نئے طریقہ کا آغاز ہوا، بعض ایسے لوگ جو اس سلسلہ میں اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھے، اور ان کو براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل نہیں تھی، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو آمادہ کیا کہ متحدہ کے لئے یزید کو خلیفہ نامزد کر دیا جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اور اکابر صحابہؓ جو اس وقت موجود تھے، ان کو حکمرانی کے اس نئے طریقہ سے اس قدر اختلاف تھا، جتنا حضرت حسین ؓ کو، لیکن بعض صحابہؓ نے فتنہ کے اندیشہ سے خاموشی اختیار کی، اور بعض نے امت کو اختلاف سے بچانے کے لئے بکراہت خاطر اس تجویز کو قبول کر لیا۔ اب اگر تمام صحابہؓ اس صورت حال پر یہی رویہ اختیار کرتے اور کسی کی طرف سے مزاحمت پیش نہ آتی تو آئندہ یہ بات بھی چل جاتی کہ اسلام میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ ساتھ عام چالیت کی مروجہ ملوکیت کی بھی گنجائش ہے۔ چنانچہ حضرت حسین ؓ نے اس کی مزاحمت کو ضروری سمجھا۔ یہاں تک کہ اپنے رفقاء اور اہل خاندان کے ساتھ نہایت بے دردی سے شہید کر دیئے گئے، اور قاتلان حسین نے جہاں آخرت میں اپنے لئے اللہ کے عذاب اور ابدی خسران کو مقدر کر لیا وہیں دنیا میں بھی قیامت تک کے لئے اہل ایمان کی نگاہ میں ملعون و مغضوب قرار پائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت حسین ؓ کی یہ مہم بظاہر کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی، لیکن حضرت حسین ؓ کو معنوی فتح حاصل ہوئی۔ چنانچہ امت کے علماء و فقہاء اور ارباب فکر آج اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام جس نظام حکمرانی کا داعی ہے، وہ خلافت ہے نہ کہ خاندانی بادشاہت۔ حالانکہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ اسی بادشاہت کا ہے، لیکن اس کے باوجود آج اسے اسلامی فکر کے خلاف کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور کیوں اس رویہ کو قبول نہیں کیا گیا؟ یقیناً اس میں بڑا حصہ حضرت حسین ؓ اور آپ کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کی مزاحمت اور اسی راہ میں شہادت کا ہے۔ ورنہ بعد کے لوگ سمجھتے کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہو چکا ہے۔

پس حضرت حسن ؓ کا اسوہ یہ ہے کہ امت کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لئے اپنے اقتدار کی قربانی گوارا کیا جائے، اور ایثار سے کام لیا جائے، اور حضرت حسین ؓ کا اسوہ یہ ہے کہ جب دین میں کوئی طاقت کجی پیدا کرنا چاہے اور

اسلام کی صحیح تصویر کو مسخ کرنے کے در پے ہو تو چاہے اس کے لئے اپنی رگ گلو کٹانی پڑے لیکن بہر قیمت اللہ کے دین اور شریعت کی فکری سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ آج کے حالات میں یہ دونوں نمونے امت کے لئے مشعل راہ ہیں: امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے عہدہ و جاہ کا ایثار، اور دین کی حفاظت و صیانت کے لئے اپنی جان عزیز تک کی قربانی!!

{۹؍اپریل ۲۰۰۱ء}

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

انسانی معاشرے میں کچھ لوگوں کو دولت مند اور کچھ کا غریب ضرورت مند ہونا نظامِ قدرت اور تقاضۂ فطرت ہے۔ اس لئے ہر سماج کی ضرورت ہے کہ اس کے خوش حال اور اصحابِ ثروت اپنے ضرورت مند اور غریب بھائیوں کی مدد اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنی دولت کا کچھ حصہ اسی مقصد کے لئے نکالیں۔ اس لئے پچھلے آسمانی مذاہب میں بھی زکوٰۃ و صدقات کا حکم فرمایا گیا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے اہل و عیال کو زکوٰۃ دینے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم: ۵۵) بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا ان میں نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی تھا۔ (بقرہ: ۸۳) حضرت مسیح نے بھی اعلان فرمایا کہ مجھے زندگی بھر اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کی ہدایت کی گئی ہے: وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم: ۳۱)

ہر چند کہ بائبل میں انسانی ہاتھوں اور دماغوں نے بہت کچھ تحریف کی ہے، لیکن اب بھی اس میں کہیں مبہم اور کہیں واضح ہدایت صدقہ و انفاق کی ملتی ہے۔ تورات غلہ اور جانوروں میں دسواں حصہ واجب قرار دیتا ہے

> اور زمین کی پیداوار کی ساری دہ یکی (دسویں حصہ) خواہ وہ زمین کے بیج کی یا درخت کے پھل کی ہو خداوند کی ہے اور خداوند کے لئے پاک ہے۔ اور گائے بیل اور بھیڑ بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گزرتا ہو ان کی دہ یکی یعنی دس پیچھے ایک ایک جانور خداوند کے لئے پاک ٹھہرے۔ (احبار ۲۷: ۳۰-۳۲)

فی کس آدھ مثقال اس کے علاوہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو ہدایات دی گئیں

ان میں ایک یہ بھی تھی کہ

دولت مند نصف مثقال سے زیادہ نہ دے اور نہ غریب اس سے کم دے (خروج ۳۰/۱۵) دوسرے مذاہب میں بھی نذر، قربانی اور دان کا تصور موجود ہے، غرض انسانی خدمت، غریبوں کی مدد اور حاجت مندوں کی حاجت برآری مذاہب عالم اور انسانی فطرت سلیمہ کا ایک مشترک ورثہ ہے، جسے اسلام نے نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اس کو خدا کی بندگی کا اہم درجہ بنا دیا اور اس کی اہمیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو اس کا ایک مرتب نظام عطا فرمایا۔

اسلامی تعلیمات کا اولین اور مستند ترین سرچشمہ قرآن مجید ہے، قرآن مجید نے زکوٰۃ کو جو اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے تیس مقامات پر زکوٰۃ کو اسلام کے رکن اول نماز کے دوش بدوش ذکر کیا ہے، بتیس مقامات پر صریحاً زکوٰۃ کا اور چند دوسرے مقامات پر صدقہ کا ذکر آیا ہے، مختلف سیاق میں رحمت خداوندی کا حق دار ہونے کے لئے ایمان و تقویٰ کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کو بھی شرط قرار دیا گیا (اعراف ۱۵۶) اور فرمایا گیا کہ زکوٰۃ تمہارے مال میں کمی کا سبب نہیں بلکہ برکت و اضافہ کا باعث ہے، وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (روم: ۳۹) آخرت میں اس کا جو ثواب ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال اس دانے کی ہے جس میں سات بالیاں نکل آئیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اللہ جس کے لئے چاہتے ہیں، دو چند کر دیتے ہیں، اور وہ وسعت والے اور علم والے ہیں (البقرہ: ۲۶۱)

جو لوگ زکوٰۃ ادا نہ کریں اور غریبوں کے اس حق سے پہلو تہی برتیں، ان کے لئے اسی درجہ عبرت ناک سزا ہے۔

جس دن سونا چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر

اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اب اس کا مزہ چکھو۔

(توبہ: ۳۵)

یعنی قیامت کے دن اس مال کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا (آل عمران: ۱۸۰) واقعہ یہ ہے کہ [illegible] نماز کے بعد جس تاکید واہتمام اور کثرت وتکرار کے ساتھ قرآن مجید نے زکوٰۃ وصدقات، انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی ہے [illegible] اس کی اس اہمیت کے ساتھ زندگی [illegible] گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کو ارکان اسلام میں نماز کے بعد رکھا ہے۔ بعض اوقات آپ ﷺ نے جن دو تین چیزوں پر بیعت لی ان میں زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمایا (بخاری، کتاب الزکوٰۃ ۱۸۸) آخرت میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر آپ ﷺ کی وعیدیں بڑی ہی ہولناک اور دل دہلانے والی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہوگی وہ قیامت کے دن گنجے سانپ کی صورت اختیار کر لے گا جو طوق بن جائے گا اور [illegible] (بخاری، [illegible]) [illegible] جن چاندی سونے کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہوگی وہ اس سے [illegible] دو خواتین خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم پسند کرو گی کہ آگ کے کنگن تم کو پہنائے جائیں؟ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی (ترمذی ۱/۱۳۸، باب ما جاء فی زکوٰۃ الحلی)

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے دنیا میں بھی زکوٰۃ ادا کرنے پر خوش خبری اور تعاون کرنے پر اللہ کی مدد کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً صدقہ برے خاتمہ سے بچاتا ہے (ترمذی ۱/۱۴۴، [illegible]) صدقہ مصیبتوں کے دروازے بند کرتا ہے ([illegible]) اور صدقہ کی وجہ سے کمی نہیں آتی، قال علیہ السلام: ما نقصت صدقة من مال (مشکوٰۃ ۱/۱۶۷) جس مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے [illegible]

ہلاک و ضائع ہو جاتا ہے (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ) یعنی صدقہ و خیرات میں برکت نہیں رہتی بلکہ اللہ کی طرف سے تھوڑا عذاب آتا ہے (الترغیب والترہیب) اور دنیا میں انسان کی بد اعمالیوں کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ نے اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی اثر انگیز روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے جماعت مہاجرین! پانچ گناہ ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے، (مصیبتوں میں پڑو گے) اور میں اس بات سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، کہ تم ان گناہوں میں مبتلا ہو، جس قوم میں کھلے عام بدکاریاں ہونے لگیں ان میں طاعون اور ایسی تکلیف دہ بیماریاں پیدا ہوں گی، جو پہلے کے لوگوں میں نہیں ہوئی، ناپ تول میں کمی کریں گے تو قحط، تنگ حالی اور حکمرانوں کا جور و ظلم ان پر ہوگا، جو زکوٰۃ ادا نہ کریں گے بارش سے محروم کر دیے جائیں گے، اور (اس بستی میں) جانور نہ ہوں تو شاید ان پر بالکل ہی بارش نہ ہو، خدا اور رسول کے پیمان کو توڑیں گے تو دشمنوں کو جو کفار ہوں گے ان پر مسلط کر دے گا، اور وہ ان کے قبضے سے بعض چیزیں چھین لیں گے، اور مسلمانوں کے حکمران قرآن مجید کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے، اور احکامِ الٰہی کو ترجیح نہ دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی قوت کو باہم ہی ٹکرا دے گا۔"

(ابن ماجہ عن ابن عمر، ۴۰۱۹، باب العقوبات)

غور کیا جائے تو آج اس حدیث کی تصدیق ہر سمت سے دیکھی جا سکتی ہے، اقوامِ مغرب میں بدکاریاں، ایسے امراض کا وجود کہ جن سے کان والے کبھی نا آشنا تھے، حکمرانوں کا ظلم و جور، قحط و خشک سالی، مسلمانوں پر ان کے دشمنوں کا غلبہ و تسلط اور باہم آویزش، یہ ساری چیزیں روز روشن کی طرح سامنے ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی تنگ حالی اور بدامنی کا ایک اہم سبب اس امت کا فریضہ زکوٰۃ سے غفلت و

بے حجابی ہے۔

غور کیجئے تو مذاہب کی تعلیم کا خلاصہ اللہ سے تعلق اور محبت ہے، راہبوں کی رہبانیت اور جوگیوں کے لمبے قیام، معبدوں میں بتوں کے سامنے سجود و نیاز، آتش کدوں میں آتش اعتقاد کو سلگا لینا اور مسلسل روشن رکھنا، ان سب کا اپنے اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق خدا سے تعلق کے اظہار کے سوا اور کیا ہے؟ اسلام نے اسی مقصد کے لئے نماز کا نہایت پاکیزہ و اثر انگیز عمل رکھا، جس میں زبان اور آنکھیں ہاتھ اور پاؤں اور جسم کا ایک ایک حصہ خدا کی بارگاہ میں حاضر اور متوجہ رہتا ہے، عجز و فروتنی کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنی پیشانی تک خاک پر رکھ دیتا ہے۔

لیکن تعلق مع اللہ اسی وقت اوج کمال کو پہونچ سکتا ہے، جب کہ غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو، دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ انسان کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال و دولت ہے، اسی کی وجہ سے انسان خدا سے بے توجہی کرتا ہے، پھر دولت و ثروت کا نشہ دل و دماغ پر چڑھتا ہے، اور کبر و غرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے، یہی ''کبر'' دین و اخلاق کے لئے سم قاتل ہے، اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے، بخل کا جذبہ مستحکم ہوتا ہے، لوگوں کے حقوق کو وہ احسان سمجھنے لگتا ہے، اپنی دولت کے لئے خود اپنی قوت بازو کا ثمرہ ہونے کا خیال جڑ پکڑتا ہے۔

''زکوٰۃ'' اسی مال کی محبت کو کم کرتی ہے، ''نماز'' خدا سے تعلق کا سامان تھا، اور ''زکوٰۃ'' غیر اللہ سے بے تعلقی کا عنوان ہے، اسی کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے، اس سے توحید کا اظہار ہوتا ہے، ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، زکوٰۃ کا عمل بندہ کے اس یقین کو ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ ہے خدا کا عطیہ ہے، اس میں خود اس کی قوت و قدرت کو دخل نہیں، یہ اس بات کا اقرار ہے کہ خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر وہ دولت دنیا کو قربان کرنے کے لئے تیار ہے، یہ ایمان کی تازگی ہے، دولت و دنیا کی تحقیر ہے، عقیدہ اور باطن کی صفائی ہے اور اعمال کی پاکی ہے، اسی لئے اس کا نام ہی ''زکوٰۃ'' رکھا گیا، جس کے معنی ہی پاکی کے ہیں، قرآن نے زکوٰۃ میں پائے جانے والی تربیت اخلاق اور تزکیہ باطن کی خاص

صلاحیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ (توبہ ۱۰۳) ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے، اس کے ذریعہ آپ انہیں پاک وصاف کر دیں گے۔

یہ تو زکوٰۃ کا اخلاقی اور روحانی پہلو ہے، اس کے مادی و معاشی فوائد ظاہر ہیں، کوئی بھی سماج دولت مند اور غریب طبقہ سے خالی نہیں ہو سکتا، زکوٰۃ سماج کے غریب طبقہ کو تحفظ وضمانت عطا کرتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر تمام لوگ زکوٰۃ ادا کریں تو کسی کو غذا اور لباس سے محروم ہونا نہ پڑے۔

> اللہ نے اہلِ دولت پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے، وہ اتنی مقدار ہے کہ فقراء کے لئے کافی ہو جائے، اگر یہ بھوکے، بے لباس اور پریشان رہیں تو یہ اغنیاء کے فریضۂ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کا محاسبہ کریں اور ان کو اس پر عذاب دیں۔

یقین ہے کہ اگر دولت کے اعتبار سے تین درجات کئے جائیں، ایک وہ لوگ جن پر زکوٰۃ واجب ہے، دوسرے وہ جو زکوٰۃ کے حقدار ہیں، پھر ان لوگوں کی دولت اور اس کی شرح زکوٰۃ کا حساب کیا جائے جن پر زکوٰۃ واجب ہے، اور ان لوگوں کی غربت کو ملحوظ رکھ کر ان کی ضروریات کا حساب لگایا جائے تو ضرور زکوٰۃ تمام غرباء کی ضرورت پوری کر دے گی، کاش اعداد وشمار کی مدد سے اس کی تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی ایمان وعقیدہ کی آنکھوں سے نہیں بلکہ سر کی آنکھوں سے دیکھی جا سکے گی۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کا خود اہلِ ثروت کو یہ فائدہ ہوگا کہ غرباء طبقہ، جس کی محبت اور جفا کشی ہی ہر چراغِ عیش میں شعلہ زن ہے اور جن کے دم سے ہی عشرت کدۂ حیات کی ساری بہار قائم ہے، میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے اور وہ ان کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھیں گے، مغربی سرمایہ داری میں زکوٰۃ کے لئے تو کیا جگہ ہوتی؟ سود

نے غربا اور مزدوروں کی محرومی بڑھا دی ہے۔ یہ صورت حال محنت کش طبقہ میں اہل دولت کے خلاف مخالف جذبات کو ابھار دیتا ہے اور بھڑکاتا ہے۔ کمیونسٹ تحریک اسی رد عمل میں پیدا ہوئی۔ اسلام نے زکوۃ کے ذریعہ اس کا علاج کیا ہے اور دولت میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲۳ نومبر ۲۰۰۲)

اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف خلیفہ اور فرماں روا ہی نہ تھے، بلکہ ایک مشفق مربی اور مزاج شناس مصلح بھی تھے اور اسی نسبت سے وقتاً فوقتاً اپنے رفقاء کا امتحان بھی لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ مالک الداری سے مروی ہے کہ ایک بار چار سو دینار لیا اسے ایک تھیلی میں رکھا اور ایک لڑکے سے کہا کہ اسے ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کو لے جا کر دے دو اور دینے کے بعد تھوڑی دیر گھر میں ٹھہرنا اور دیکھنا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ لڑکا گیا اور اس نے کہا کہ امیر المؤمنین کہتے ہیں کہ اسے اپنی بعض ضروریات میں خرچ کر لیجئے، چار سو دینار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی جبکہ دینار سونا ساڑھے سات تولے کے برابر ہوتا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں کچھ دعائیہ کلمات کہے، پھر باندی کو آواز دی اور فرمایا کہ یہ سات دینار فلاں کو دے آؤ، یہ پانچ فلاں کو اور یہ پانچ فلاں کو، اسی طرح اسی مجلس میں پائی پائی تقسیم کر دیا۔ وہ لڑکا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا اور یہ واقعہ ان سے نقل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار کی ایک اور تھیلی تیار کی اور کہا کہ اسے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس لے جاؤ، وہاں بھی تھوڑی دیر رک کر دیکھنا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ لڑکے نے ان کے پاس بھی تھیلی پہنچائی اور کہا کہ امیر المؤمنین نے فرمایا ہے کہ اسے اپنی ضرورت میں خرچ کریں۔ انہوں نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے دعا کے کلمات کہے، پھر ایک لڑکی کو بلایا اور تقسیم شروع کی۔ فلاں کے گھر اتنا پہنچاؤ، اور فلاں کے گھر اتنا۔ جب دینار ختم ہونے کے قریب آئے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بیوی نے جھانک کر دیکھا اور عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم لوگ بھی مسکین و محتاج ہیں، کچھ تو ہمیں بھی عطا فرمایئے۔ نحن واللہ مساکین فاعطنا۔ تھیلی میں صرف دو دینار رہ گئے تھے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف پھینک دیا۔ قاصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا اور تفصیل

دیکھا حال سنایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ سب بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے مزاج پر ہیں۔" انهم اخوة بعضهم من بعض "(مجمع الزوائد ۳/۱۲۵)

اسی طرح کا ایک امتحان حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک اور معتمد رفیق حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ وہ اپنے گھر میں کچھ جمع کر کے نہیں رکھتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے دس ہزار درہم بھیجے، سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے پاس جوں ہی رقم پہنچی اس رقم کی مختلف تھیلیاں بنا کر مختلف لوگوں کے پاس پہنچانے لگے، شریکِ حیات نے پوچھا کہ یہ کہاں لے جا رہے ہو؟ فرمایا: اس کے پاس جو ہمیں اس کا نفع دے، چنانچہ اس طرح پورے پیسے تقسیم کر دیئے، تھوڑی سی رقم بیوی بچوں کے لئے بچا دی، جب یہ معمولی رقم گھر کے خرچ میں کام آ گئی تو بیوی نے عرض کیا کہ جن لوگوں کے پاس نفع کے لئے رقم رکھی ہے ان کے پاس جائیں اور کچھ نفع اس کا وصول کر کے لائیں کہ گھر چلے، وہ ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، یہاں تک کہ جب زیادہ عرصہ بیت گیا اور بیوی کا مطالبہ جاری رہا تب جا کر حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ نے ظاہر کیا کہ نفع دینے والے سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات تھی، جو آخرت میں بے پناہ نفع کے ساتھ اصل واپس فرمائے گا۔ (حوالہ سابق)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اور رفقاء میں انفاق کا کیسا بھرپور جذبہ تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لٹا کر کس قدر خوش ہوتے تھے؟ اور یہ نتیجہ تھا پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی تربیت کا، خود آپ کو اس سے زیادہ کوئی چیز گراں نہ ہوتی تھی کہ آپ کے پاس پیسے جمع ہوں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ ﷺ رفقاء کے درمیان تشریف لائے، ہاتھ میں سونے کا ایک ٹکڑا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف متوجہ ہوتے اور فرمایا: اگر محمد (ﷺ) کا انتقال ہو جائے اور اس کے پاس یہ موجود ہو تو وہ اپنے رب سے کیا کہے گا؟ پھر آپ ﷺ نے اس مجلس سے کھڑے ہونے سے پہلے اسے تقسیم فرما دیا اور اُحد پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس بات سے خوشی نہیں ہوگی کہ محمد (ﷺ) کے پاس اس پہاڑ کے برابر سونا اور چاندی ہوں، وہ اسے اللہ کے راستے میں خرچ کریں اور اس میں سے ایک دینار بھی نہ بچا رکھیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ نے ایک دینار و درہم یا غلام اور باندی کچھ بھی نہیں چھوڑا، بلکہ آپ ﷺ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس تیس صاع (ایک کوئنٹل سے زائد) جو کے بدلے میں رہن تھی، یہی جو سے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے اہل و عیال کے کھانے کی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ (مجمع، بحوالہ طبرانی ۳/۱۲)

جب وفات کا وقت آیا تو سات دینار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ سونا علی کے پاس بھیج دو، آپ ﷺ کی بے ہوشی کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مشغول ہو گئیں، یہی بات بار بار پیش آتی رہی، آپ ﷺ کو ہوش آتا، آپ ﷺ دینار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا حکم دیتے، پھر بے ہوشی طاری ہو جاتی، حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی دیکھ بھال میں لگ جاتیں، آخر حضرت عائشہؓ نے دینار بھجوا دیئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے صدقہ کر دیا۔ جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس دن چراغ میں تیل تک میسر نہیں تھا، حضرت عائشہؓ نے اپنے قرابت مندوں میں سے ایک خاتون کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنے برتن سے چراغ جلانے کا سامان مہیا کر دیں۔ (مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی ۳/۱۲۳) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے یہاں کیسا انفاق تھا، کائنات آپ کے قدموں میں تھی، لیکن آپ ﷺ ہمیشہ خیال رکھتے کہ پاسِ مبارک متاعِ دنیا سے آلودہ نہ ہونے پائے ﷺ۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور غریب انسان کی مدد کرنے کی جو ترغیب دی ہے، کم نیکیاں ہیں جن کی اس قدر آپ ﷺ نے ترغیب دی ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرمائیے، اور دوسرا کہتا ہے کہ روک رکھنے والے کو نقصان پہنچائیے۔ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ خود فرماتے ہیں اے بنی آدم! خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ) ایک بار دریافت کیا گیا کہ کون سا صدقہ اجر میں بڑھا ہوا ہے؟ ارشاد ہوا کہ تو اس وقت صدقہ کرے جب صحت مند ہو، ابھی موت کے قریب نہ ہو اور فقر کا اندیشہ لاحق ہو، ایسا نہ ہو کہ جب جان حلق تک پہنچ

جائے تو کہو فلاں کو دیدو، فلاں کو دیدو، سو دیا ہو گئے۔ (بخاری) حضرت ابی ہریرہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جاہل سخی اللہ کے نزدیک بخیل عبادت گذار سے بہتر ہے۔ (ترمذی عن ابی ہریرہؓ) ایک بار آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تم کو سب سے بدترین آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا، ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: جس سے اللہ کا واسطہ دے کر مانگا جائے اور وہ پھر بھی نہ دے۔ (مسند احمد عن ابن عباسؓ)

صدقہ پر نہ صرف آخرت میں ثواب ہے، بلکہ دنیا میں بھی صدقہ کے بڑے فوائد ہیں۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدقہ کرنے میں عجلت کرو کیوں کہ بلا صدقہ کو پھلانگ نہیں پاتی۔ (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۸۸۷) یعنی صدقہ انسان کو ابتلاء و آزمائش سے بچاتا ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کی آتشِ غضب کو بجھا دیتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔ (ترمذی باب ما جاء فی فضل الصدقہ) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے تو جب تک اس پر کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہے وہ اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے۔ (ترمذی عن ابن عباس، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۹۲۰)

یہ تو صدقہ کا عمومی اجر و ثواب ہے، لیکن رمضان المبارک میں صدقہ اور انفاق کا ثواب کئی چند ہو جاتا ہے۔ رمضان جہاں صبر و ضبطِ نفس کا مہینہ ہے وہیں انسان کے ساتھ غم خواری اور حسنِ سلوک کا بھی مہینہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ یوں تو ہمیشہ صدقہ فرماتے تھے لیکن رمضان المبارک کے مہینے میں اس میں نمایاں طور پر اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے وقت کی نیکیوں کے اس موسمِ بہار سے فائدہ اٹھایا جائے اور آخرت کے خزانہ کو بھرا جائے۔ بقول مولانا حسام الدین فاضل:

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کو بھر لینا
ادھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

(۲۱ نومبر ۲۰۰۲ء)

بادشاہی میں فقیری

"حمص" شام کا ایک شہر ہے، ایک زمانہ میں یہی شام کا پایۂ تخت تھا، عہد فاروقی میں گورنر شام یہیں قیام کرتے تھے۔ حمص سے ایک وفد خدمتِ فاروقی میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی رعیت کے غرباء اور حاجت مندوں کا بڑا پاس تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے واردین سے فرمایا کہ وہاں کے غریبوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی ایک فہرست بنائیں کہ میں ان کی کچھ مدد کر سکوں۔ فہرست بنی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نگاہ ڈالی تو دیکھا اس میں ایک نام "سعید بن عامر" بھی ہے۔ حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی رسول ہیں، جن کو آپ رضی اللہ عنہ نے شام کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اس نام پر پہنچے تو اچنبھا ہوا، خیال ہوا کہ شاید کوئی اور سعید ہوں گے۔ دریافت فرمایا یہ سعید کون صاحب ہیں؟ عرض کیا گیا: ہمارے امیر و گورنر! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو تمہارے گورنر فقیر و محتاج ہیں؟ کہا گیا: بیشک، ایسے محتاج کہ مدتوں گھر میں چولہا جلنے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلطانی میں اس درویشی کو دیکھ کر گریہ طاری ہو گیا، آنسوؤں نے آنکھوں ہی کو نہیں، داڑھیوں کو بھی تر کر دیا۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے تھیلی میں ایک ہزار دینار رکھے (جو ایک بہت بڑی رقم تھی) وفد کے حوالے کیا اور فرمایا کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو میرا سلام کہنا اور یہ تھیلی دے دینا اور بتا دینا کہ یہ آپ کی ضرورت کے لئے بھیجے ہیں۔ تھیلی جب حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ اسے قریب سے ہٹانے لگے اور بے ساختہ زبان سے نکلا "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" گویا کوئی مصیبت آ پڑی ہو، کوئی تکلیف دہ خبر آئی ہو۔ اہلیہ گھبرائی ہوئی آئیں: کیا امیر المومنین کا انتقال ہو گیا؟ فرمایا: اس سے بھی بڑھ کر۔ کہنے لگیں: کیا مسلمانوں کسی آفت اور ابتلاء میں

پڑ گئے ہیں؟ ارشاد ہوا: اس سے بھی بڑی بات پیش آئی ہے۔ اہلیہ نے بے قراری سے پوچھا: آخر کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ فرمایا: میرے پاس دنیا آ پہنچی ہے کہ میری آخرت کو خراب کرے اور فتنہ نے میرے گھر میں قدم رکھ دیا ہے۔ اہلیہ اب تک صورت حال سے واقف نہیں تھی، کہنے لگیں، پھر تو اس سے نجات پانے کی کوشش کیجئے۔ حضرت سعیدؓ نے گفتگو کے اس مرحلہ کو غنیمت جانا اور دریافت فرمایا کہ کیا تم اس میں میرا تعاون کروگی؟ بیوی نے تعاون کا یقین دلایا۔ حضرت سعیدؓ نے اسی وقت وہ پورے دینار مختلف تھیلیوں میں رکھے اور ضرورت مندوں کو روانہ کردیئے۔

اس واقعہ پر بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ خود حضرت عمرؓ شام تشریف لائے۔ دارالخلافہ حمص کے لوگ کسی قدر بکثرت شکوہ کے عادی تھے اسی لئے لوگ اس کو "چھوٹا کوفہ" کہا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ جب حمص میں فروکش ہوئے تو لوگوں سے حضرت سعیدؓ کے بارے میں بھی استفسار فرمایا۔ اہلِ شہر حسب عادت شکایت سے باز نہ رہے اور چار باتوں کی شکایت کی۔ صبح میں حضرت عمرؓ نے اجلاس منعقد کیا۔ پہلے لوگوں سے شکایات دریافت کیں۔ لوگوں نے کہا کہ سویرے گھر سے نہیں نکلتے، سورج چڑھے نکلتے ہیں۔ آپ نے حضرت سعیدؓ سے جواب طلب کیا۔ فرمایا: میں ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا، در حقیقت میرے یہاں کوئی خادم نہیں ہے، صبح میں گھر کے کام کاج خود ہی کرنا ہوتا ہے، آٹا گوندھتا ہوں، روٹی پکاتا ہوں، پھر وضو کرکے باہر آتا ہوں۔

لوگوں نے عرض کیا کہ گورنر صاحب رات کو کسی سے ملاقات کے روادار نہیں ہوتے۔ حضرت سعیدؓ نے کسی قدر تامل سے جواب دیا: افسوس کہ میں جس بات کے اظہار سے بچنا چاہتا تھا اسی کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے، پھر فرمایا کہ میں نے دن اور رات کی تقسیم کر رکھی ہے، دن لوگوں کی ضروریات کے لئے، رات خدا کی عبادت کے لئے۔ کہا گیا کہ مہینہ میں ایک دن تو ایسا گذرتا ہے کہ گھر سے باہر ہی تشریف نہیں لاتے۔ حضرت سعیدؓ عرض گذار ہوئے کہ امیر المومنین! میرے پاس کوئی خادم نہیں اور کپڑا بھی صرف یہی ایک ہے جو جسم پر ہے، اس لئے ماہ میں ایک دن اسی کو دھوتا ہوں، کپڑے خشک ہونے تک

انتظار کرتا ہوں، یہاں تک کہ دن کے آخری حصے میں باہر آتا ہوں۔

ایک شکایت یہ بھی کی گئی کہ بعض اوقات درمیانِ مجلس بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور آپ حاضرین سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمایا کہ ایک لرزہ خیز منظر میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے: میں اس وقت ایمان سے محروم تھا اور مکہ میں اس غول میں شامل تھا جو خبیب رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کا گویا "تماشہ" دیکھ رہے تھے۔ دشمن ان کے جسم کا ایک ایک انگ کاٹتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے؟ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اس کرب و تکلیف کی حالت میں بھی کہتے جاتے کہ مجھے، تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اس سے بچ جاؤں اور اس کے بدلے آپ ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے، جب بھی میری آنکھوں میں یہ منظر آتا ہے، میں بے قرار ہو جاتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میں نے جو اس دن اس جاں نثارِ رسول ﷺ کی مدد نہیں کی شاید اس کی وجہ سے اللہ مجھے معاف نہ کرے، اور یہی احساس مجھے ہوش و حواس سے محروم کر دیتا ہے!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کا گمان اور انتخاب غلط ثابت نہ ہوا۔ واپس جا کر پھر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے لئے ایک ہزار دینار بھیجے۔ بیوی نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اب آپ کی خدمت کی حاجت نہ رہی، اس سے کوئی خادم خرید کر دیں۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے استفسار فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتاؤں؟ بیوی نے وضاحت چاہی۔ فرمایا: کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیں جو انتہائی ضرورت کے وقت ہمیں واپس کرے۔ اہلیہ نے پوچھا اس کی کیا صورت ہوگی؟ فرمایا: ہم اللہ کو قرض حسنہ دے دیں!! بیوی بھی آخر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی تھیں، شوہر کی تجویز کو بخوشی قبول کیا۔ مجلس ختم بھی نہ ہوئی کہ جلدی جلدی حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں دینار بھرے، یہ فلاں خاتون کے لئے، یہ فلاں مرحوم کے یتیم بچوں کے لئے، وہ فلاں فلاں غریب کے لئے، اور وہ چند لمحوں میں تھیلی بھی خالی ہو گئی اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے قناعت پسند دل کو بھی قرار آ گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کا ایک بدقسمت محسن ہے۔ محسن اس لئے کہ اس نے

متحدہ ہندوستان کا تصور دیا اور ہندوستان کو اتنی وسعت عطا کی جو نہ اس سے پہلے اسے حاصل تھی اور نہ اس کے بعد پھر حاصل ہو سکی اور "بدقسمتی" اس لئے کہ چند متعصب مزاج مورخین کو چھوڑ کر تاریخ نے اس کے ساتھ ناانصافی اور احسان ناشناسی کا رویہ روا رکھا۔ اس کے باطن درویش صفت بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اس نے اپنی آخری وصیت میں ہدایت کی تھی کہ اس کی سلی ہوئی ٹوپیوں کی قیمت میں سے چار روپے دو آنے لے لیے جائیں اور اس کے کفن پر خرچ کیے جائیں اور کتابت قرآن میں اس نے جو اجرت حاصل کی تھی اس میں تین سو پانچ روپے بچ رہے ہیں، جو اس کے ذاتی اخراجات کے بعد بچے ہیں، یہ اس کی موت کے دن فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہ واقعات نہ فرشتوں کی دنیا کے ہیں، نہ عالم بالا کی کسی مخلوق کے، یہ اسی دنیا کے واقعات ہیں اور اسی زمین پر پیش آئے ہیں۔ جب دل کی دنیا بدلتی ہے اور فکر میں انقلاب آتا ہے تو کردار کی بلندی کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ جو آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو اور خدا کے خوف سے خالی ہو، وہ کردار کی پستی کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا، اس سماج میں جو شخص جس قدر اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوگا اسی قدر خیانت، خود غرضی اور اپنے تعیش کوتاہی میں بھی وہ "ممتاز" ہوگا، وہ اسکامس اور اسکینڈلس کا جنم داتا ہوگا اور خدا ترسی اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے جس کو حصہ ملا ہوگا، وہ یقیناً اپنی بادشاہی کو بھی فقر و درویشی کے تاج سے آراستہ رکھے گا اور اس اختیاری فقیری کی لذت و حلاوت پر ساری دنیا کی ساری لذتوں کو قربان کرنا اس کے لئے آسان ہوگا!!

(۱۷ اپریل ۲۰۰۰ء)

بہترین خطا کار

انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے، یہ نیکیوں پر قادر ہے لیکن برائیوں سے عاجز نہیں، نہ فرشتہ ہے کہ برائی کا خیال تک دل میں نہ آئے اور نہ شیطان ہے کہ ضلالت و گمراہی سے کبھی دل خالی ہی نہ ہو، اس لئے اسے اس "امتحان گاہ" میں رکھا گیا ہے تاکہ دیکھا جائے کہ اس کی نیکیاں برائیوں پر فتح پاتی ہیں یا برائیاں نیکیوں پر غالب آتی ہیں، انبیاء کے سوا کوئی انسان نہیں جو غلطی اور خطا سے یکسر محفوظ ہو، گویا غلطی انسان کی سرشت میں ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان فرشتہ بن جائے۔ انبیاء کے بعد سب سے کامل انسان وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو انبیاء کی رفاقت اور نصرت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، لیکن اس مقام و مرتبہ کے باوجود بعض اوقات پیغمبروں کے اصحاب سے بھی غلطیاں صادر ہوئی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کو فوراً ہی اپنے گناہ پر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے، اور اس طرح یہی نہیں کہ ان کی یہ ندامت اس گناہ کی تلافی کا سامان بن جاتی ہے، بلکہ ان کا اس طرح گناہ کرنا اور پھر گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے مطابق پشیمان ہونا بجائے خود امت کے لئے اسوہ قرار پاتا ہے۔

آپ ﷺ نے اسی حقیقت کو اس طرح ارشاد فرمایا کہ ہر ابن آدم ضرور ہی خطا کرتا ہے لیکن بہترین خطا کار وہ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دروازۂ مغفرت پر اپنی ندامت کی پیشانی رکھ دیں اور توبہ کر لیں۔ خیر الخطائین التوابون

مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر خوش ہوتی ہے، اس سے اس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے اور کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات پر رحمت کا غلبہ اور وہ رحمان و رحیم اور غفور و کریم ہے، اسی لئے اسے گنہگاروں اور خطاکاروں کو معاف کرتے

خوشی ہوتی ہے۔ انسان انتقام کے بعد بھی زخم خوردہ رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہانوں سے مغفرت کے فیصلے فرماتے ہیں، کسی نے حج کرلیا تو پچھلی پوری زندگی کے گناہ معاف کردیئے، عمرہ کرلیا تو ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ کے درمیان کے گناہ معاف ہوگئے، بعض روزے ہیں کہ پورے سال کے گناہوں کے کفارہ ہیں، وضو اور نماز بھی جسم سے گناہوں کے میل کو صاف کرتی ہیں، صدقات بھی گناہوں کو دھو دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے کہ چھوٹے چھوٹے عمل کی بنیاد پر انسان کے گناہ معاف ہوتے جاتے ہیں۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو "عفو" یعنی بہت معاف کرنے والا قرار دیا ہے، عربی زبان میں "عفو" کے اصل معنی مٹانے کے ہیں (القاموس المحیط: ۱۶۸۱) پس "عفو" کے معنی مٹا دینے والے کے ہوئے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن گناہوں کو معاف کرتے ہیں ان کو بالکل ہی مٹا دیتے ہیں اور گویا نامۂ اعمال سے بھی محو فرما دیتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی شان کریمی ہے! انسان کسی کو معاف بھی کردے تو وہ غلطی کو دل سے مٹانے کو تیار نہیں ہوتا، وہ وقتی طور پر جذبۂ انتقام کو دبا لیتا اور جب بھی تعلقات میں ناہمواری آتی تو پھر اس کو اس کا نامۂ اعمال دکھانے اور چھپے ہوئے واقعات کو منظر عام پر لانے کے لئے آمادہ رہتا ہے؛ سیاست کی دنیا میں تو اکثر اختلافات اسی طرح ظہور میں آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں درگذر کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ جب اللہ کسی بات کو معاف فرماتے ہیں تو اس کو ریکارڈ سے بھی حذف کردیتے ہیں۔

توبہ کا تصور جہاں آخرت میں انسان کے لئے نافع ہے، وہیں دنیا میں بھی کچھ کم نافع نہیں۔ اگر توبہ نہ ہو تو ناامیدی اور مایوسی پیدا ہوگی، جرم کا حوصلہ بڑھے گا اور مجرم پیشہ افراد سوچنے لگیں گے کہ جب دوزخ مقدر ہو چکی ہے تو دنیا کی لذت اٹھائی جائے اور جہاں ایک دفعہ جرم کا ارتکاب ہوا ہے اور کئی بار اس سے جرم کو بڑھاوا ملے گا اور سماج میں زندگی اجیرن ہو جائے گی، اس لئے توبہ کا تصور سماج کی بھی ایک بڑی ضرورت ہے اور اس سے سماج کا امن و آشتی متعلق ہے۔

توبہ کے لئے اصل محرک اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے، انسان اپنے

گناہ پر ندامت اور پشیمانی محسوس کرے۔ اپنے گناہوں کو یاد کر کے اس کا دل لرزنے لگے، خدا کے سامنے اس کے ہونٹ کپکپانے لگیں، آنکھوں سے آنسو رواں ہوں، بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہو، وہ اس کا ضمیر گناہوں کے بوجھ تلے اپنے آپ کو دبا ہوا محسوس کرے، اس پشیمانی اور سچی ندامت کے بغیر محض زبان سے توبہ کے الفاظ کہہ دینا کافی نہیں۔ انسان پر اپنی قلبی کیفیت کے لحاظ سے گناہ کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس کو آپ ﷺ نے ایک مثال سے واضح فرمایا کہ نیک اور سچے مسلمان جب کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ جیسا اس کے سر پر پہاڑ جیسا بوجھ ہے اور جو شخص گناہوں کا عادی ہو جاتا ہے اسے گناہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مکھی ہے جو ناک پر بیٹھی ہوئی ہے، ذرا ہاتھ ہلایا اور اڑ گئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو دھل جاتا ہے اور توبہ نہ کرے تو جوں جوں گناہ کرتا جاتا ہے قلب پر دھبے بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے، اب انسان گناہ کرتا ہے اور اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے بے توفیقی سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں۔ جیسے دنیا میں بہت سے امراض ہیں جس سے آدمی دوچار ہوتا ہے لیکن پوچھئے تو شاید "جنون" سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں، اس لئے نہیں کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ اس میں مریض کو اپنے مریض ہونے کا احساس نہیں رہتا، وہ بیمار ہوتا ہے لیکن اپنے آپ کو صحت مند تصور کرتا ہے، اس کو علاج کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو علاج کی ضرورت سے بری سمجھتا ہے، اسی طرح توبہ سے بے توفیقی ایک "روحانی جنون" ہے کہ انسان گناہ میں مبتلا ہے، سر سے پاؤں تک گناہ میں ڈوبا ہوا ہے لیکن اپنے گنہگار ہونے کا کوئی احساس نہیں کرتا اور کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ خدا کی چوکھٹ پر ندامت اور شرمندگی کی پیشانی رکھے اور التجا کی زبان کھولے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی مسلمان ایسی محرومی اور بدبختی سے دوچار ہو۔

توبہ کے لئے پچھلے گناہ پر ندامت کے ساتھ مستقبل کا عزم مصمم بھی ضروری ہے،

آدمی اپنے دل میں یہ ارادہ کرے کہ وہ آئندہ کبھی بھی اس غلطی کا اعادہ نہ کرے گا۔ اس بات کا مطلب یہ نہیں کہ ابھی غلطی کئے دیتے ہیں پھر بھی گناہ ہو گیا تو پھر توبہ کر لی جائے گی کہ بقول شاعر: ”کم بخت توبہ مت ابھی ٹوٹی نہیں جاتی“۔ کیونکہ اس طرح کی سوچ اس بات کی علامت ہے کہ وہ زبان اور دل کی موافقت کے ساتھ پشیمانی کا اظہار نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی توبہ میں صدق و خلوص ہی ہے۔

ہر گناہ سے توبہ کا ایک ہی طریقہ نہیں، بلکہ اس کے لئے بھی شریعت نے کچھ اصول مقرر کر دیے ہیں۔ جن گناہوں کے لئے قرآن و حدیث میں کوئی کفارہ مقرر کر دیا گیا ہو تو ان کی توبہ یہ ہے کہ کفارہ ادا کیا جائے، مثلاً کسی شخص نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ساٹھ روزے رکھنا اور اس پر قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کا کفارہ ہے (المجادلہ: ۳-۴) قسم کھائی پھر اسے پورا نہ کر پایا تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا ہے۔ (المائدہ: ۸۹) ان گناہوں سے توبہ یہی ہے کہ ان کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔

بعض گناہوں پر شریعت نے قضا واجب قرار دی ہے، جیسے کسی شخص سے عذر کی بنا پر روزہ فوت ہو گیا تو اس پر ان روزوں کی قضا واجب ہے، ہوش و حواس کی حالت میں نمازیں قضا ہو گئیں تو ان کی بھی قضا واجب ہے، یہ گویا بندوں پر اللہ تعالیٰ کا قرض ہے، جس کی ادائیگی واجب ہے، ان گناہوں کی توبہ یہی ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کی جائے، اسی طرح بعض عبادتوں کے فوت ہونے پر فدیہ واجب قرار دیا ہے، جیسے کوئی شخص بہت ضعیف یا مریض ہو، روزہ رکھنے پر قادر نہیں اور بظاہر مستقبل قریب میں صحت یاب ہونے کی بھی توقع نہیں تو ایسے شخص کے لئے یہ صورت ہے کہ ہر روزہ کے عوض ایک فدیہ ادا کر دے یعنی ایک غریب محتاج شخص کو دوپہر اور رات کا کھانا کھلائے، یا صدقۂ فطر کے بقدر غلہ دے دے، اصل میں تو یہ حکم روزہ کے سلسلہ میں آیا ہے (البقرہ: ۱۸۴) لیکن فقہاء نے روزوں پر قیاس کرتے ہوئے نماز میں بھی اس کی اجازت دی ہے کہ جن لوگوں کی نماز فوت ہو گئی اور وہ اب نماز ادا کرنے کے لائق نہ رہے یا ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی طرف

شدہ نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ (درمختار، ص ۷۲، ج ۲) یہی حکم روزوں کا ہے، یہ بھی بہتر ہے کہ جب کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اس کے ذمہ واجب جو چھوٹے فرائض ہیں ان کا "کفارہ" اور "فدیہ" ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس سے متوفی کو راحت حاصل ہوگی۔

کچھ گناہ وہ ہوتے ہیں جو بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، یہ حقوق دو طرح کے ہیں: مالی اور غیر مالی۔ انسان سے متعلق مالی حقوق میں کوتاہیوں کی توبہ یہ ہے کہ صاحب حق کا اس کا حق ادا کر دیا جائے یا اس سے معاف کرالیا جائے، کسی کا قرض باقی ہو، یا بلا اجازت کسی کی چیز استعمال کر لی ہو، کسی کو اس کے حق سے محروم کر دیا ہو، میراث شرعی سے حصہ نہ دیا ہو، کسی سے رشوت لیا ہو، یہ تمام صورتیں مالی حق تلفی کی ہیں، ان کا ادا کرنا فرض و لازم ہے اور ادا کرنے کے لائق نہ ہو تو ضروری ہے کہ اس سے معذرت کر کے اور اس کو راضی کر کے اپنا گناہ معاف کرائے، بعض حقوق غیر مالی ہوتے ہیں، جیسے کسی کو گالی دی، کسی کا مذاق اڑایا اور برا بھلا کہا، کسی کی غیبت کی، بہتان لگایا، یہ تمام باتیں حق تلفی اور گناہ کے دائرے میں آتی ہیں۔ ان گناہوں کی توبہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ زیادتی کی ہے اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی جائے، یہ ضروری نہیں کہ اس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ میں نے آپ کے بارے میں کیا کہا ہے اور کیا کچھ زیادتی کی ہے؟ بلکہ اگر مبہم طور پر معاف کرنے والا یوں کہہ دے کہ تم سے جو کچھ بھی غلطی ہوئی ہو میں اسے معاف کرتا ہوں تو یہ بھی کافی ہے، ایک ایک غلطی کا شمار کرانا ضروری نہیں۔ اگر انسان سے کسی بندے کے حق میں زیادتی ہوئی ہو تو وہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، حقیر ہو یا معزز، عذر خواہی اور خوشامد میں تکلف نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ حقوق العباد میں ہونے والی کوتاہیوں کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کریں گے جب تک کہ خود صاحب معاملہ معاف نہ کر دے، یہاں تک کہ شہادت جو راہ خدا میں جان کی قربانی جیسا عظیم عمل بھی انسان کو انسان کے حق میں ہونے والی کوتاہیوں سے بچا نہیں سکتا، اس لئے اس میں شرم و عار اور رکاوٹ نہ ہونی چاہئے۔

ان گناہوں کے علاوہ جو گناہ ہیں، جیسے جھوٹ بولنا، بدنگاہی یا غصہ جہاں شرعی حدود

ہاتھ نہ ہوئی ہوں۔ یعنی ایسے کسی جرم کا مرتکب ہونا جس پر خود اللہ کی طرف سے شرعی سزائیں مقرر ہیں، جیسے زنا، چوری، کسی مسلمان پاک دامن شخص پر تہمت اندازی، شراب نوشی وغیرہ، ان کے لئے بھی خوب گڑگڑا کر توبہ کرنا چاہیے اور یہاں بھی استغفار کی کثرت رکھنی چاہیے، تاکہ یہ اس کے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات ایک ہی مجلس میں ستر ستر بار استغفار فرمایا کرتے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ جہاں نفل عبادت، قرآن مجید کی تلاوت، انفاق اور دعاؤں کا مہینہ ہے، وہیں توبہ و استغفار کے لئے بھی اس سے بہتر کوئی موسم نہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کا دروازۂ رحمت کھلا رہتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔

(۲۳ر نومبر ۲۰۰۰ء)

مانگئے، پھر مانگئے، پھر مانگئے

انسان کس قدر عاجز ہے کہ ہر لمحہ اور صبح و شام جس چیز کا ضرورت مند ہے، اسے بھی وجود میں نہیں لاسکتا، نہ وہ چاول اور گیہوں کا ایک دانہ پیدا کر سکتا ہے، نہ اپنے لئے پانی کا کوئی قطرہ وجود میں لاسکتا ہے، نہ وہ ہوا اور آکسیجن کی تخلیق کر سکتا ہے، جس کے بغیر چند منٹ بھی اس کی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔! اور خدا کس قدر قادر اور عظیم ہے جس نے اتنی بڑی کائنات ہمارے لئے بچھائی ہے، اور ہر لمحہ لاکھوں پھل پھول ہیں، جن کو وہ پیدا کرتا ہے، پھر وہ مہربان اور رحم دل بھی کس قدر ہے، کہ اس نے سورج کا ایسا چراغ جلا رکھا ہے، جس کی روشنی ہر آنگن میں پہونچتی ہے، اور جس کے حکم سے گھٹائیں رحمت باراں ہو کر ہر کھیت کی پیاس بجھاتی ہیں، یہ آنگن کسی مسلمان کا ہو یا کسی کافر کا، اور یہ کھیت اللہ کے فرمانبرداروں کے ہوں یا نافرمانوں کے!

جو خدا اس قدر قادر و مطلق ہے، جس کے خزانۂ قدرت میں نعمتوں کی کوئی کمی نہیں، پھر جو اتنا سخی اور داتا ہے کہ دنیا میں اچھے برے کا فرق کئے بغیر سب کو دیتا ہے، خوب دیتا ہے اور دامن بھر بھر دیتا ہے، اس سے بڑھ کر کون اس لائق ہو سکتا ہے کہ عجز و کمزوری اور ضرورت و حاجتمندی کا پتلا انسان اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اور اپنی ضرورتوں کے کشکول اس کے سامنے کھولے، کہ اللہ! اپنے ایک فقیر بے نوا اور گدائے بے آسرا پر نگاہ کرم فرما اور اپنے جود و سخا اور داد و دہش کے دربار سے اس کے عاجز ہاتھوں کو واپس نہ کر ـــــ اسی ادائے بندگی کا نام "دعاء" ہے۔

دعاء کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اہل ایمان سے فرمایا ہے کہ وہ اللہ سے مانگے اور اسی سے دعاء کرے، (غافر: ۱۳، ۶۰) اللہ تعالیٰ نے یہ

بھی فرمایا کہ تم مجھ سے مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا" ادعونی استجب لکم (غافر ۶۰) اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ ان کے پہلو بستر سے الگ رہتے ہیں، اور خوف و طمع کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں (السجدۃ ۱۶) ایک موقع پر اللہ تعالی نے فرمایا کہ اللہ سے اس کے فضل کے طلبگار ہو وسئلوا اللہ من فضلہ (النساء ۳۲) رسول اللہ ﷺ نے جو عبادت اور بندگی کا نمونہ تھے دعا کرنے کی خوب ترغیب دی ہے، آپ نے فرمایا کہ دعا دراصل عبادت ہے: الدعاء ھو العبادۃ (ترمذی عن نعمان بن بشیر) ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے دعا کو عبادت کی روح اور اس کا مغز قرار دیا (ترمذی ۳۳۷۱) مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ اس سے کچھ مانگو تو ناگواری ہوتی ہے لیکن اللہ تعالی کو دعا سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں (ترمذی عن ابی ہریرۃ) اور حضرت ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غصہ ہوتے ہیں (ترمذی) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مصیبتیں آچکی ہیں دعا ان میں بھی نفع ہے اور جو آنے والی ہیں دعا ان سے بھی بچاتی ہے، اس لئے اللہ کے بندو! تم پر دعا کا اہتمام ضروری ہے (مشکوۃ ۲۲۳۴) حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جس کے لئے دعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لئے رحمت کے دروازے وا ہو گئے، اور انسان اللہ تعالی سے جو کچھ مانگتا ہے اس میں عافیت سے بہتر کچھ اور نہیں (مشکوۃ ۲۲۳۹)

عام طور پر لوگ مصیبت کے وقت ہی دعا کرتے ہیں، یہ بندوں کی خود غرضی کی بات ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو چاہتا ہو کہ مشکل وقتوں میں اس کی دعا قبول کی جائے اسے چاہئے کہ بہتر وقت میں خوب دعا کیا کرے، (ترمذی عن ابی ہریرۃ) دعا چونکہ خود عبادت ہے اس لئے وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی، آپ نے فرمایا یا تو اسی دنیا میں طلب قبول کرلی جاتی ہے یا آخرت کے اجر کی صورت میں محفوظ ہو جاتی ہے یا اس مطلوب کے بقدر مصیبت اس سے دور کردی جاتی ہے (مشکوۃ عن ابی سعید خدری ۲۲۵۹) چنانچہ حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

تمہارا پروردگار بہت حیا والے اور کریم ہیں، جب بندہ ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس سے حیا کرتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں کو خالی واپس کر دیں (مشکوٰۃ ۲۲۴۴ باب الدعا) دعا کے معاملہ میں عجلت اور بے صبری نہیں ہونی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر گناہ کا یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ جلد بازی سے کام نہ لے، دریافت کیا گیا کہ جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہے میں نے بہت دعا کی لیکن لگتا ہے میری دعا قبول نہیں ہوئی، چنانچہ ناامید ہو کر دعا کرنا چھوڑ دے، (مشکوٰۃ عن ابی ہریرۃ ۲۲۲۷) اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خوشحالی اور کشادگی کا انتظار بھی افضل ترین عبادت ہے۔ وافضل العبادۃ انتظار الفرج (مشکوٰۃ ۲۲۲۷)

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کو دیکھئے تو صبح سے شام تک دعاؤں کا معمول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح دعا کرو کہ دل میں یقین ہو کہ اللہ اسے ضرور ہی قبول فرمائیں گے،

فاسئلوہ وانتم موقنون بالاجابۃ (مجمع الزوائد ۱۴۸/۱۰) کیوں کہ جب تک دعا کے قبول ہونے کا یقین نہ ہو وہ کیفیت وحالت پیدا نہیں ہو سکتی جو دعا کے لئے مطلوب ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ دعا کے وقت قلب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، دل غافل اور لاپرواہ ہو اور زبان پر دعا کے کلمات ہوں تو یہ دعا مقبول نہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ غافل اور بے توجہ دل کی دعا قبول نہیں فرماتے ہیں (مشکوٰۃ ۲۲۴۱) خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ دعا کرنے والے پر رقت کی کیفیت ہونی چاہئے: ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ (اعراف ۵۵)

قلب کے ساتھ ساتھ ظاہری حالت سے بھی دعا کرنے والے کی بندگی اور عجز و نیاز کا مظہر ہونا چاہئے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو ہتھیلیوں کی طرف سے نہ کہ پشت کی جانب سے (یعنی ہتھیلیاں پھیلا کر رکھو نہ کہ پشت) اور پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے چہرے پر پھیر لو (مشکوٰۃ عن ابن عباس ۲۲۴۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ دعا کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ مونڈھوں کے مقابل یا ان کے قریب ہو (ابوداؤد عن عمر) اور گویا ایک

بھکاری ہے جو ہاتھ پھیلائے ہوا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کا معمول مبارک بھی یہی تھا۔ (مشکوٰۃ ۲۲۵۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ہاتھ مونڈھوں کے مقابل ہونا چاہئے، حضور ﷺ اس سے زیادہ ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ (مشکوٰۃ ۲۲۵۶)

آپ ﷺ نے دعا کے کلمات کے بارے میں بھی آداب بتائے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنی چاہئے اور آپ ﷺ پر درود، پھر دعا کرنی چاہئے (مجمع الزوائد ۱۰/۱۵۵) حضرت فضالہ بن عبید سے مروی ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب آئے، نماز پڑھی، پھر دعا کرنے لگے: کہ اللہ! مجھے معاف فرما، آپ ﷺ نے فرمایا اے نماز پڑھنے والے! تم نے جلد بازی کی، جب نماز پڑھو تو بیٹھو، پھر اللہ کی حمد کرو، پھر مجھ پر درود بھیجو، اس کے بعد دعا کرو، چنانچہ اس نے اسی طرح دعا کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا کرو قبول کی جائے گی، سل تعطہ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۵۵) دعا کرتے ہوئے آواز پست اور آہستہ ہونا چاہئے، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے دعا کے آداب میں یہ بات فرمائی ہے کہ دعا میں آواز پست ہونی چاہئے (اعراف: ۵۵) کیوں کہ پست آواز میں ریا اور دکھاوے کا اندیشہ کم ہے، آدمی اپنی ضرورت کے مطابق دعا کر سکتا ہے، اس سے رقت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، آج کل اجتماعی طور پر دعا کا رواج بڑھ گیا ہے، اس میں بعض اوقات دعا "رسم دعا" بن جاتی ہے، رقت اور خشیت کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اور چوں کہ ہر شخص کی ضرورتیں الگ الگ ہوتی ہیں، اس لئے انسان اپنی ضرورت کے مطابق خدا سے سوال نہیں کر پاتا، دعا کے آداب میں یہ بھی ہے کہ دعا خواہ کسی کے لئے کرنی ہو، دعا کا آغاز اپنی ذات سے کرے (مجمع الزوائد ۱۰/۱۵۲) یہ دعا کا اہم ادب ہے، کیوں کہ اس سے عجز اور اللہ کے سامنے تضرع کا اظہار ہوتا ہے اور دعا میں یہی کیفیت دعا کرنے والے میں مطلوب ہے۔

کچھ خاص اوقات ہیں جن میں دعا مقبول ہوتی ہے، رات کے آخری اور تہائی حصہ میں یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے (مسند احمد عن ابن عمر) جہاد میں صفوں کے درست ہونے کے وقت، بارش ہونے کے وقت، نماز کی اقامت کے وقت (ترمذی عن ابی ہریرہ)

اس کے علاوہ فرض نمازوں کے بعد، شب قدر اور بعض خاص راتیں دعا کی قبولیت کے خاص مواقع ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں، جن کی دعاؤں کو آپ ﷺ نے خاص طور پر مقبول قرار دیا ہے۔ ان ہی میں مظلوم ہے گو وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے برا ہی کیوں نہ ہو، روزہ دار تا آنکہ افطار کر لے، اور مسافر تا آنکہ واپس آجائے (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۵۲)، امام عادل کی دعا، اور باپ کی دعا اپنی اولاد کے حق میں مقبول ہے، (مشکوٰۃ عن ابی ہریرۃ، ۲۲۴۹، ۲۲۴۸) کسی شخص کی غیر موجود مسلمان بھائی کے بارے میں دعا بھی مقبول ہوتی ہے اور متعدد روایتوں میں اس کا ذکر ہے، (ترمذی عن عبداللہ بن عمر) حاجی کی دعا گھر واپسی تک، اور مجاہد کی دعا جہاد سے فارغ ہونے تک بھی مستجاب دعاؤں میں ہے، (مشکوٰۃ: ۲۲۴۰) جیسے ان لوگوں کی دعا مقبول ہوتی ہے اور اس میں شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہئے، ویسے ہی ان کی بددعا، اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ اولاد اور مال پر بددعا مت کرو، کہ کہیں وہ وقت دعا کی مقبولیت کا ہو اور یہی دعا عنداللہ مقبول ہو جائے۔ (مسلم عن جابر)۔

بعض لوگ خود اپنے لئے دعا کا اہتمام نہیں کرتے، اور لوگوں سے خواہش کرتے ہیں کہ میرے لئے دعا کیجئے، یہ صحیح نہیں، اپنے لئے خود بھی دعا کرنی چاہئے، کیوں کہ انسان خود اپنے لئے جس رقت اور سوز کے ساتھ دعا کر سکتا ہے، ظاہر ہے کوئی اور نہیں کر سکتا، کیوں کہ انسان کی اپنی دعا میں اس کا غم چنگاری کی طرح شامل ہوتا ہے، اور اللہ کے یہاں اسی جذبہ دروں کی قدر و قیمت ہے، لیکن اگر کسی سے دعا کی درخواست کی جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عمرہ کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے اجازت دی اور فرمایا اے میرے چھوٹے بھائی! مجھے بھی اپنی دعا میں شریک رکھنا، اور بھول نہ جانا، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا ایسا کلمہ ہے کہ اگر اس کے بدلے پوری دنیا بھی حاصل ہو جاتی تو اس سے بڑھ کر خوشی نہ ہوتی (ترمذی عن عمرؓ)؛ بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ جو اہم چیز ہو اس کی دعا کی جائے، معمولی چیز کیا اللہ سے مانگی جائے، یہ نا سمجھی کی بات ہے، اصل میں انسان چھوٹی سے چھوٹی

اور بڑی سے بڑی تمام ضرورتوں میں اللہ ہی کا محتاج ہے، اس لئے ہر چھوٹی بڑی ضرورت خدا ہی سے مانگنی چاہئے نہ کہ کسی اور سے، کیوں کہ یہی اللہ تو غنیِ مطلق ہے، اور یہی انسان محتاجِ مطلق، چنانچہ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر ضرورت اللہ ہی سے مانگنی چاہئے، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ ہی سے مانگے، اور ایک روایت میں ہے کہ نمک کے لئے بھی اللہ ہی سے طلب گار ہو۔ (ترمذی عن انس ؓ) اور کیوں نہ ہو کہ انسان ان میں سے کسی چیز کا خالق نہیں، وہ محض اللہ کی تخلیق سے نفع اٹھاتا ہے، اس لئے قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ میں خدا کا محتاج ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ گذر رہا ہے، نیکیوں کا موسم بہار، خدا کی رحمتوں اور عنایتوں کا مہینہ، عفو و درگذر اور دوزخ سے نجات کا مہینہ، محروموں کے علاج اور بگڑی بنانے کا مہینہ، وہ مہینہ جس میں خود خدا بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور کمال شفقت کے ساتھ عاجز اور گنہگار بندوں سے دریافت کرتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے معاف کردوں، کوئی ہے روزی کا خواستگار کہ اسے روزی عطا فرماؤں، اور کوئی ہے کسی مصیبت اور ضرورت سے دوچار کہ اس کی حاجت پوری کردوں — پھر کیا ہم اس آواز پر بھی ہم اپنی ضرورت کا ہاتھ نہیں پھیلائیں گے، اور زبان سوال اسی کے سامنے نہیں کھولیں گے کہ جس کے خزانۂ قدرت میں سب کچھ ہے، جو دے کر خوش ہوتا ہے اور مانگنے والوں سے خوش، شاعر حقیقت شناس نے کیا خوب کہا ہے:

مانگئے، پھر مانگئے، پھر مانگئے
مانگنے میں شرمندگی اچھی نہیں

(۱۵ نومبر ۲۰۰۳ء)

خشک سالی ــــ شامتِ اعمال ما!

موسم کا معتدل اور متوازن ہونا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، عام حالات میں زمین پر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں اور فضاء میں شوخی سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی خنک ہواؤں کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی ؛ لیکن جب موسمِ گرما میں سورج آگ برساتا ہے، گرم و خشک ہوائیں درختوں کو بے رونق کر دیتی ہیں، لو کے جھونکے انسانوں کے لئے پیامِ موت ثابت ہونے لگتے ہیں، اور زمین اور ماحول کی تپش سے کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں، اس وقت خوشگوار موسم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے!

اس وقت پورا ملک گرمی کی لپیٹ میں ہے، اور بہت سے علاقے ہیں جہاں خشک سالی نے زندگی کو دوبھر کر دیا ہے، راجستھان اور گجرات کے ایک علاقہ کا تو بہت ہی برا حال ہے، پینے کے پانی کے لئے لوگوں کو تپتے ہوئے ریگزاروں سے گذر کر میلوں دور جانا پڑتا ہے، جانوروں کو چارہ میسر نہیں۔ ادراان کی تصویریں دیکھ کر رحم آتا ہے، پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ ان حالات میں لوگ گندے پانی بھی استعمال کرنے پر مجبور ہیں، اور اس کی وجہ سے بیماریوں کا پھیلنا فطری بات ہے، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہاں تک کہ نہایت سرد علاقوں میں بھی خشک سالی اپنے قدم بڑھا رہی ہے، آسٹریلیا جیسا ہرا بھرا اور درختوں اور جنگلات کی کرامات سے پہچانا جانے والا ملک بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں۔

قحط سالی کی کچھ طبعی وجوہ ہو سکتی ہیں، طبعی وجوہ کا تعلق بھی انسان کے اپنے افعال ہی سے ہے، زمین پر جنگلات اور درختوں کا وجود قدرت کا بہت ہی خوبصورت اور انوکھا تحفہ ہے، اگر قدرت کا یہ توازن درختوں کی تخلیق نہ کرے اور زمین کو ان چیزوں سے آراستہ

کر نہ چھوڑ دے تو کوئی حاجت نہیں بوا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ زراعت اصل میں تم کرتے ہیں یا ہم کرتے ہیں؟ افرءیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون (واقعہ: ۶۳) ان درختوں سے جہاں انسان کو غذائی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور سوکھی لکڑیوں سے وہ بھی فرنیچر بناتے ہیں اور نوع بنوع فائدے اٹھاتے ہیں، وہیں زمین کے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے اور بارش کے نظام کو متوازن بنانے میں بھی یہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، تیزی سے جنگلات کی کٹائی نے موسم پر بہت برا اثر ڈالا ہے، دنیا میں درجہ حرارت معمول سے ۲ء۱ ڈگری سلسیس بڑھ گیا ہے، اور بہ حیثیت مجموعی ۱۹۷۵ء سے اب تک تین دہوں میں تین گنا درجہ حرارت میں ایک ڈگری کا اضافہ ہو گیا ہے، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ درختوں کی کٹائی اور جنگلات کا خاتمہ اس کا بڑا سبب ہے، اسی لئے اسلام نے شجر کاری اور کاشت کاری کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان جب کوئی درخت لگاتا ہے تو اس درخت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اتنا اجر لکھتے ہیں۔ (مسند احمد عن ابی ایوب انصاری، مجمع الزوائد ۴: ۶۸) حضرت ابو درداء سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے درخت لگایا اس میں سے جو کوئی آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ (مسند احمد ۶: ۴۴۴) درخت کو آپ ﷺ نے درخت والوں کے لئے اور ان کے بعد کے لوگوں کے لئے برکت کا باعث قرار دیا۔ (مجمع الزوائد ۴: ۶۸) برکت میں عافیت، سرسبزی و شادابی اور ہر طرح کا نفع شامل ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا ہے، عرب میں عام طور پر بیری اور ببول کے درخت ہوتے تھے، اس لئے خاص طور سے حدیث میں بیری کے درخت کا ذکر آیا ہے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دوں کہ بیری کا درخت کاٹنے والے پر اللہ کی لعنت ہو۔ (مجمع الزوائد ۸: ۱۱۵، باب ما جاء فی قطع السدر) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بیری کا درخت کاٹتے ہیں وہ سر کے بل جہنم میں

ڈالے جائیں گے۔ (حوالہ سابق بحوالہ طبرانی) اسی مضمون کی روایت عبداللہ بن حُبشی سے بھی مروی ہے عروہ بن اوس ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے بیری کا درخت کاٹا سوائے اس کے کہ کھیتی کے لئے کاٹے، اللہ تعالیٰ دوزخ میں اس کا سر بنائیں گے (مجمع الزوائد ج۳، باب تحریم قطع السدر، ۲۷۴) اس سے اندازہ لیا جاسکتا ہے کہ نباتات کی حفاظت کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ جدید صنعتوں میں گیس اور کیمیکلس کا بے دریغ استعمال اور اس کے مضر اثرات سے حفاظت کی طرف سے بے توجہی نیز زمین کے اندر موجود قدرتی وسائل کوئلے وغیرہ کا مسلسل اخراج اور فضاء میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی، یہ سب وہ اسباب ہیں جو خود انسانوں کے ہاتھوں پیدا ہورہے ہیں، اور انسان خود اپنی تباہی کا سامان بہم پہنچارہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دنیا کو اجتماعی ضرر پہنچانے کا باعث ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اور فقہ اسلامی کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ نہ ابتداءً ضرر پہنچانے کی اجازت ہے اور نہ ردّ عمل میں، لا ضرر ولا ضرار، لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے ان امور میں بے جا طور پر اختیار کرنا قطعاً درست نہیں۔

یہ بھی انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ انسان اپنی تباہی کے اسباب پر ہی پوری صلاحیت خرچ کر رہا ہے، ایک سے ایک مہلک اور کثیر ہتھیار، میزائل، ٹینک اور تباہی پھیلانے والے طیارے ہیں جو وجود میں آرہے ہیں، لیکن ماحولیاتی عدم توازن جیسے سنگین اور مہیب مسئلہ سے نمٹنے کے لئے سائنس داں ایسی معلومات کی کوشش نہیں کررہے ہیں جو ان کا انسانی فریضہ ہے، حکومتیں بھی مہلک ہتھیاروں کی ایجاد کے معاملہ میں ان کی جس قدر حوصلہ افزائی کرتی ہے، تعمیری مقاصد کے لئے غالباً اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتیں، اس سے بڑھ کر افسوس کی بات کیا ہوگی؟

یہ تو خشک سالی کے طبعی اسباب ہیں، اور ان میں بھی انسان ہی کی شامت اعمال کو دخل ہے، لیکن اس کے علاوہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات میں جو بھی واقعات پیش آتے ہیں، وہ اتفاقی نہیں ہیں، بلکہ انسان کے اعمال

اور حوادث کے نظام سے اللہ تعالیٰ کے فیصلے بدلتے ہیں۔ انسان کی اطاعت، فرماں برداری اور معصیت و نافرمانی سے بارش کا گہرا تعلق ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں رات میں ان پر بارش برساؤں اور دن میں ان پر سورج نکالا کروں۔ (مسند احمد، مجمع الزوائد ۲۱۰/۲) اسی لئے رسول اللہ ﷺ سے جب جمعہ کے دن بارش کی دعا کرنے کی خواہش کی گئی تو بعض روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے اور یہ بھی فرمایا کہ اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو کہ وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے، استغفروا ربکم انه كان غفارا (مجمع الزوائد ۲۰۶/۲) غرض خشک سالی، قحط سامانی اور موسم کی غیر معمولی تمازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ ہے کہ انسان اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرے، خدا فراموشی سے باز آئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے کہ اس میں نہ صرف ان کی آخرت کی بھلائی ہے، بلکہ ان کی دنیوی فلاح بھی اس سے متعلق ہے، کم سے کم مسلمانوں کے لئے تو یہ حقیقت جزو ایمان ہے، اگر مصیبتیں اور آفتیں بھی انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرنے سے قاصر ہیں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کم نصیبی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟؟

بارش کی کمی اور عبرت و موعظت کے کچھ پہلو

جولائی ختم ہونے کے قریب ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ گھٹائیں مستانہ وار آتی ہیں، ان کی کالی کالی زلفیں دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ آج تو چپہ چپہ کو سیراب کر کے ہی چھوڑیں گی، لیکن کسی روٹھے ہوئے محبوب کی طرح اٹکھیلیاں کرتے گذر جاتی ہیں، دیہات و قریہ جات میں کسان پریشان ہیں کہ ان کی کھیتیاں کیوں کر لہلہائیں گی؟ اور کیسے ان کی امیدوں کے غنچے کھلیں گے؟ اور شہروں میں بسنے والے بے چین ہیں کہ وہ پہلے ہی سے پانی کی کمی سے دوچار ہیں، ان کے حلق کیوں کر تر ہوں گے؟؟

اس صورتِ حال نے اس وقت ہم سب کو پریشان کر دیا ہے، یہاں تک کہ وہ حکومت بھی اب اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے، جو گذشتہ ۲۰ برسوں سے حیدر آباد کو پانی لانے کے لئے صرف منصوبے بنا رہی ہے، اور سچ پوچھئے تو ان منصوبوں اور ان آبی تجویزوں سے نہ جانے کتنی بار اخبارات کی سیاہی اور اپنی وقتی سرخروئی کا سروسامان کر چکی ہے۔

دنیا کے لوگ کائنات میں پیش آنے والے واقعات کو طبعی اسباب کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور انہی کی تدابیر کے ذریعہ اس کے علاج کی سوچتے ہیں، بارش کیوں نہیں ہوتی؟ اس لئے کہ ہوا کا دباؤ موافق نہیں ہے، جنگلات کٹتے جا رہے ہیں اور دنیا کی آلودگی بڑھتی جا رہی ہے، ان اسباب کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن بحیثیت مسلمان ہمارے لئے یہ کافی نہیں، ہماری غور و فکر کی سرحدیں اس سے آگے ہیں، ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی راحت و آرام اور زحمت و مشقت کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوتے ہیں، ان فیصلوں کو کوئی مخلوق اپنے قلم سے تحریر نہیں کرتی، بلکہ یہ کائنات کے خالق و مالک کے حکم کے تابع ہیں، دنیا میں جو کچھ

پیش آتا ہے۔ اس کے کچھ ظاہری اسباب ہیں جنہیں ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، لیکن اس کے کچھ غیبی اسباب بھی ہیں، جنہیں آج ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور ہمارے ظاہری حواس سے ان کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، لیکن انبیاء کے ذریعہ خالق کائنات نے جزا و سزا کا جو نظام ہمیں سمجھایا اور پہنچایا ہے وہ ہمیں اس غیبی نظام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔

بارش کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس غیبی نظام کو رسول اللہ ﷺ نے بھی بیان فرمایا کہ جب لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو وہ بارش سے روک دیے جاتے ہیں اور ان پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے، بلکہ اگر بے زبان جانور نہ ہوں تو وہ بارش سے بالکل ہی محروم کر دیے جائیں، ولم یمنعوا زکوٰۃ اموالھم الا منعوا القطر من السماء ولولا البھائم لم یمطروا (ابن ماجہ عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر ۴۰۱۹)۔ نیز حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خشکی اور سمندر میں جو مال تلف ہوتا ہے وہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے: ما تلف مال فی بر ولا بحر الا بحبس الزکوٰۃ (مجمع الزوائد، حدیث نمبر ۴۳۳۵، بہ سند ضعیف)۔ اس لئے بارش کی جو موجودہ صورت حال ہے، اس میں ہمیں چاہئے کہ اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہیں اللہ کی طرف سے یہ کچھ تو نہیں ہے، خاص کر زکوٰۃ کے بارے میں اپنا محاسبہ کریں کہ جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے کیا ہم ان سب کی زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں؟ اور پھر زکوٰۃ کی ادائے گی کا باضابطہ حساب رکھتے ہیں؟ اس فریضہ میں کوتاہی خدا کے غیبی نظام کے مطابق اجتماعی عذاب کو دعوت دینا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کی طرف رجوع ہوں اور اپنی ضرورت کا ہاتھ پھیلائیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقع کے لئے مستقل طور پر استسقاء کی نماز رکھی ہے، آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں کم سے کم دو بار استسقاء فرمایا ہے، ایک بار تو باضابطہ نماز ادا فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ اس موقع سے آپ بہت ہی معمولی کپڑے میں، کمال تواضع اور فروتنی کے ساتھ دولت کدہ سے نکلے اور عیدگاہ تشریف

لائے، خوب دعاء کی، گریہ وزاری فرماتے رہے، اور پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی (ترمذی حدیث نمبر: ۵۵۸)۔ حضرت عائشہؓ کی روایت اور مختلف روایات میں اس موقع کی دعاء مذکور ہے، اور یہ بھی ہے کہ آپ نے نماز پڑھتے ہی بجلی کڑکی اور چمک شروع ہوئی اور ایسی بارش ہوئی کہ آپ کے عیدگاہ سے مسجد نبوی پہنچنے تک نالے بہہ پڑے، صحابہ نے بھاگ بھاگ کر ایسی جگہوں کی پناہ لی جہاں بارش سے بچ سکیں، آپ ﷺ کو بے اختیار ہنسی آگئی اور ارشاد فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہیں، اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ (ابوداؤد عن عائشہ حدیث نمبر ۱۱۷۳)

دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے دعاء پر اکتفاء فرمایا، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کا دن تھا، آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ بارش نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے، ایک دیہاتی کھڑے ہوئے اور عرض کیا؟ جانور ہلاک ہو رہے ہیں اور بال بچے بھوکوں مر رہے ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعاء فرمایئے کہ ہمیں بارش سے سیراب فرمادے، رسول اللہ ﷺ نے دست مبارک اٹھا دیا، راوی کہتے ہیں کہ جس وقت آپ ﷺ نے دعاء شروع کی آسمان پر کہیں بادل کا ٹکڑا نہیں تھا، آپ کے دعاء کرتے ہی گھٹائیں چھا گئیں، اور بارش شروع ہوگئی، یہاں تک کہ جب آپ منبر سے نیچے اترے تو ریش مبارک سے پانی کے قطرات گر رہے تھے، یہ بارش ایک ہفتہ جاری رہی، اسی بارش کے درمیان آئندہ جمعہ آپ جمعہ کے خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، اسی دیہاتی نے یا کسی اور شخص نے اپنی عرض پیش کی کہ مکانات گر رہے ہیں اور مال واسباب ڈوب رہے ہیں، دعاء فرمادیجئے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعاء فرمائی: حوالینا ولا علینا، یعنی مدینہ میں بارش نہ ہو اور مدینے کے گرد و پیش میں بارش ہو، آپ کی دعاء کا اثر یہ ہوا کہ مدینہ شہر سے بادل چھٹ گیا، لیکن مدینہ کے مضافات میں واقع وادیاں ایک ماہ تک بہتی رہیں (بخاری حدیث نمبر ۱۰۳۳)۔ غرض کہ اس قحط سالی میں اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتا ہے، جس کی حکومت پورے عالم آب وگل میں ہے، اور جس کے ہاتھوں میں پانی اور تمام نعمتوں کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک بار مدینہ اور حجاز کے علاقے میں سخت قحط پڑا، یہاں تک کہ لوگ سوکھے چمڑے کھانے پر مجبور ہوگئے، اس قحط زدہ رعایا کی کیفیت دیکھ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا برا حال ہو رہا تھا، اور آپ لوگوں کی مدد کے لئے شبانہ روز تدبیروں میں مشغول رہتے تھے، آپ نے مصر و شام کے علاقے سے کثیر مقدار میں غذائی اشیاء منگوائیں اور اہلِ مدینہ کو راحت پہونچانے کی پوری کوشش فرمائی، لیکن قحط تھا کہ کسی طور دور نہیں ہو رہا تھا، انہی دنوں ایک صحابی نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی، حضور ﷺ نے فرمایا: میں تو سمجھتا تھا کہ عمر سمجھدار آدمی ہے! یہ صاحب گھبرائے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ کون صاحب آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں، اس جواب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بے قرار کردیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھولا اور ان صاحب نے اپنا خواب سنایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت متفکر ہوئے اور نمازِ فجر کے بعد صحابہؓ سے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں نے میرے اندر حضور ﷺ کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کی ہے؟ صحابہؓ نے کہا نہیں، اور کچھ تحسینی کلمات کہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان صاحب سے کہا کہ وہ اپنا خواب بیان کریں، خواب سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! رسول اللہ ﷺ اس جانب متوجہ فرما رہے ہیں کہ قحط کے حالات سے نمٹنے کے لئے آپ دنیا کے ظاہری اسباب تو اختیار فرما رہے ہیں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا، یعنی نمازِ استسقاء نہیں پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حق کو قبول کرنے کا ایسا مزاج رکھتے تھے کہ انبیاء کے بعد روحانی تاریخ میں شاذ و نادر ہی اس کی مثال مل سکے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نمازِ استسقاء ادا فرمائی اور ایسی بارش ہوئی کہ مدینہ کا طویل قحط دور ہوا۔ غرض کہ اس طرح کے صبر آزما حالات لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں، کہ انسان خدا کے سامنے گڑگڑائے، بارگاہِ ربانی میں آنسوؤں سے وضو کرے، عجز و بندگی کے ہاتھ پھیلائے اور جبینِ نیاز خدا کی چوکھٹ پر بچھائے، اگر یہ حالات بھی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ نہ کریں تو اس سے زیادہ بدبختی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس لئے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو

نماز استسقاء کا اور تمام نمازوں میں عموماً اور نماز جمعہ میں خصوصاً غسل کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ایسا کوئی بھی کام جو لوگوں کے لئے اجتماعی نقصان کا باعث ہو، کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ سایہ دار درخت کے نیچے گندگی پھیلانے، اور پانی کو آلودہ کرنے کو حضور ﷺ نے منع فرمایا، یا بلا ضرورت درختوں کو کاٹنے کی ممانعت کی گئی۔ اس لئے ایسے اسباب کو اختیار کرنا درست نہ ہوگا، جو فطری نظام کے تحت بارش کو متاثر کرتا ہو، جیسے غیر ضروری طریقے پر جنگلات کو کاٹ دینا، زمین کو خواہ مخواہ آبادی والے علاقے میں تبدیل کر دینا کہ ان سے قدرتی ماحول متاثر ہوتا ہے، اور اس کا اثر بارش پر بھی پڑتا ہے، یہ انسانی سماج کے لئے ضرر ونقصان کا باعث ہے، ضرر ونقصان کو دور کرنا شریعت اسلامی کا اہم ترین مقصد ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ افراد واشخاص کے مفاد کے مقابلہ اجتماعی مفاد کی اہمیت زیادہ ہے، اسی طرح انفرادی نقصان کی بہ نسبت اجتماعی نقصان زیادہ قابل توجہ اور مقدم ہے، اس لئے اگر حکومت ایسے قوانین بناتی ہے، جن کا مقصود ماحول کا تحفظ ہو تو ہمیں اس کا پورا تعاون کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ یہ بات ہمارے مزاج و فکر کے عین مطابق ہے!!

زلزلہ —— خدا کی تنبیہ

پچھلے چند دنوں پہلے شہر کے کچھ حصے میں ساڑھے تین سکنڈ زلزلہ کا جھٹکا محسوس کیا گیا۔ یہ جھٹکے بہت ہی کم وقت کے لئے تھے، اسی لئے اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا، لیکن انسان اتنا عاجز اور کمزور ہے کہ اس لمحاتی حادثہ نے بھی اسے ایسی وحشت اور گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا کہ دوسرے دن بہت سے لوگوں نے گھر سے باہر سر راہ آنکھوں میں رات کاٹی، زلزلہ یوں تو کائنات کا ایک طبعی واقعہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان واقعات کے پیچھے اصل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا فیصلہ کارفرما ہے۔ اور قدرت کا ایک غیبی نظام ہے، جو کائنات میں پیش آنے والے ہر واقعہ کے پیچھے ہے، جیسے دنیا میں انسان کے افعال سے بعض حالات متعلق ہوتے ہیں، دست آور چیز کے کھانے سے معدہ خراب ہوتا ہے، چکنی چیزیں جگر کو خراب کرتی ہیں، انسان دھاردار لوہا اپنے ہاتھ پر مارے تو یقیناً ہاتھ کٹے گا اور خون نکلے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام میں انسان کے نیک و بد اعمال پر احوال مرتب ہوتے ہیں، زلزلہ، طوفان، سیلاب، قحط، غیر معتدل بارش، وبائی امراض یہ سب اوپر سے اترنے والے حوال ہیں، اللہ کی بندگی، خلق اللہ کے ساتھ حسن سلوک، صدق و صفا، عدل و انصاف، اور ان کے مقابلہ میں اللہ کی نافرمانی، خلق اللہ کے ساتھ ظلم و جور، جھوٹ، دھوکہ، وعدہ خلافی اور ایذا رسانی وہ اعمال ہیں جو زمین سے آسمان کی طرف جاتے ہیں، جیسے اعمال نیچے سے جائیں گے ان ہی کے مطابق اللہ کی طرف سے احوال و واقعات ظاہر ہوں گے۔ اس لئے ایک مومن کی نگاہ میں طبعی اسباب کسی واقعہ کے لئے ظاہری سبب کے درجہ میں ہیں، اچھے اور برے واقعات کا اصل سبب خدا کا راضی یا ناراض ہونا اور انسان کے اعمال کے اعتبار سے اس کی رحمت یا غضب کا زمین والوں کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

اس طرح کے واقعات دراصل خالقِ کائنات کی طرف سے "الارم" ہیں، تاکہ خلقِ خدا اپنے اعمال کا محاسبہ کرے، اور آپ اپنے احتساب کا فریضہ انجام دے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں گناہوں کی کثرت ہوگی اور زلزلے کے واقعات بھی بڑھیں گے، یہاں تک کہ کائنات پر زلزلۂ قیامت برپا ہوگا، جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ "زلزال" میں ہے، یہ زلزلہ پورے روئے ارض کو اپنی پیٹ میں لے لے گا، اور قرآن کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طویل اور شدید زلزلہ ہوگا، جو زمین کو جھٹکے پر جھٹکے دیتا جائے گا، اور پوری کائنات زیر و زبر ہو کر رہ جائے گی، چند سکنڈوں اور منٹوں کے زلزلے کتنے آفت بداماں ہوتے ہیں؟ یہ ہر شخص جانتا ہے، اسی سے اس شدید اور طویل زلزلہ کی ہولناکیوں اور قیامت سامانیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا تو ان احوال میں معمولی تغیر پیش آنے سے بھی بے قرار ہو جاتے، اللہ سے رجوع ہوتے، اور خوف و خشیت کی کیفیت آپ ﷺ کے چہرے سے عیاں ہوتی، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر کسی شب تیز ہوا چلتی تو آپ ﷺ بے قرار ہو کر مسجد میں تشریف لے جاتے، اور جب تک ہوا تھم نہ جاتی، خدا کے حضور کھڑے رہتے، سورج گہن یا چاند گہن لگتا تو جب تک گہن ختم نہ ہو جاتے، نماز میں مشغول رہتے۔ (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۲۰۰۹) حضرت انس رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بار سخت تاریکی چھا گئی، ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا کبھی حضور ﷺ کے زمانہ میں ایسی باتیں پیش آتی تھیں؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معاذ اللہ! اس وقت تو ہوا بھی تیز چلتی تو ہم لوگ قیامت کے خوف سے مسجد کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ (جمع الفوائد، بحوالہ ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۰۹)

لیکن ہمارے ضعفِ ایمان کا حال یہ ہے کہ زلزلہ سے ہمیں بھی خوف ہوتا ہے، لیکن نہ اللہ کا ڈر، نہ قیامت کا، صرف یہ ڈر ہوتا ہے کہ گھر گر جائیں گے، جانیں جا سکتی ہیں، مال ضائع ہو سکتا ہے، یعنی اصل میں مومن کو جس بات کا خوف ہونا چاہئے، اس کا تو دل میں خیال بھی نہیں گذرتا، لیکن ان آنی جانی اور زائل و فانی چیزوں کا خوف مسلط رہتا ہے، جن سے مومن کے دل کو آزاد رہنا چاہئے، اسی لئے زلزلہ کے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ تنہا تنہا دو دو یا چار چار

جماعت نماز پڑھی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے گناہوں پر توبہ کی جائے۔ علامہ طحطاوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں

وكذا الصلاة فرادى لحصول الفزع بالزلازل والصواعق وانتشار الكواكب والضوء الهائل ليلا والثلج والأمطار الدائمة وعموم الأمراض والخوف الغالب من العدو ونحو ذلك من الأفزاع والأهوال، لأنها آيات مخوفة للعباد ليتركوا المعاصي ويرجعوا إلى طاعة الله تعالى التي بها فوزهم وصلاحهم وأقرب أحوال العبد في الرجوع إلى ربه الصلاة.

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی ۲۹۹)

اور تنہا تنہا نماز پڑھی جائے گھبراہٹ کے موقع پر، گھبرا دینے والی باتوں سے مراد زلزلے، بجلیوں کی مسلسل کڑک، ستاروں کا ٹوٹنا، رات میں تیز روشنی کا نمودار ہونا، برف باری، مسلسل بارش، امراض کا پھیلنا، دشمن کا سخت خوف وغیرہ ہیں۔ یہ بندوں کو ڈرانے کے لئے ہیں تاکہ وہ گناہ چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا راستہ اختیار کریں جس میں ان کی کامیابی اور صلاح ہے اور بندہ کے لئے اپنے رب سے رجوع کرنے کی سب سے قریبی حالت نماز ہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی زلزلہ کے موقع پر جماعت کے بغیر تنہا تنہا نماز پڑھنا ثابت ہے، چنانچہ حنفیہ کے علاوہ شوافع اور حنابلہ بھی اس موقع پر نماز پڑھنے کے قائل ہیں۔ (دیکھئے [illegible]) اس لئے اول تو دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایسی آزمائشوں سے حفاظت فرمائے لیکن اگر کبھی خدانخواستہ ایسی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایسی آفتوں کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

اب زلزلے کے واقعات کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے، جاپان، ترکی، ایران اور امریکہ وغیرہ میں چونکہ اس سے بہت جیسے شدید اور عظیم ہلاکت سے لئے عبرت انگیز زلزلے کے واقعات سامنے آتے ہیں کہ وہ سوچتے ہیں اور ان کے [illegible]

کیفیت ہو آتا ہے۔ ماضی میں عالم اسلام میں اس طرح کے جو بھیانک واقعات پیش آئے ہیں، ۱۳۵۶ھ کے زلزلہ بہار کے موقع سے مفکر اسلام حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نے اس پر ایک نہایت ہی وقیع مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، جس میں تاریخ الخلفاء (تالیف علامہ سیوطی) اور بعض دوسری کتابوں کے حوالہ سے ان واقعات کو جمع کیا گیا ہے، اس میں زلزلہ کے علاوہ دوسرے سماوی اور کائناتی حوادث کا بھی ذکر ہے، یہاں خاص زلزلہ کے متعلق واقعات کا ذکر مناسب ہوگا۔

- ۱۳۰ اور ۱۳۱ھ میں دمشق میں نہایت تباہ کن زلزلہ آیا۔
- ۱۸۰ھ میں مصر میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ اسکندریہ کا مستحکم مینار وہیں منہدم ہوگیا۔
- ۲۰۳ھ میں خراسان اور بلخ میں ایسا زلزلہ آیا کہ ان شہروں کی ایک چوتھائی آبادی نیست و نابود ہوگئی۔
- ۲۳۳ھ کے ہولناک زلزلہ میں انطاکیہ کا شہر تباہ ہوگیا، اور موصل میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔
- ۲۴۵ھ میں ایک عالمگیر زلزلہ آیا جس سے بڑے بڑے قلعے اور پل تباہ ہوگئے، انطاکیہ کا ایک پہاڑ سمندر میں جا گرا، اور مکہ معظمہ کی نہروں کا پانی خشک ہوگیا۔
- ۲۸۰ھ میں شام کے شہر دبیل میں ایسا زلزلہ آیا کہ صرف شکستہ مکانوں کے ملبے سے ایک لاکھ پچاس ہزار لاشیں برآمد ہوئیں۔
- ۳۴۴ھ میں مصر میں ایک خوفناک زلزلہ آیا، جس کا اثر تین گھنٹے تک جاری رہا۔
- ۳۴۶ھ کو ایشیائے کوچک کے علاقہ میں زلزلہ نے بڑی تباہی مچائی، طالقان کے ڈیڑھ سو گاؤں زمین میں دھنس گئے۔ طالقان کی آبادی لاکھوں میں تھی، صرف تیس آدمی بچے، زمین ایسی پھٹی کہ مردوں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔
- ۳۸۰ھ کو اردبیل میں ایسا زلزلہ آیا کہ کنوؤں کے منہ پر سے پانی ابل آیا، اور پچیس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔
- ۴۲۵ھ کو بغداد اور اس کے مضافات میں تقریباً بیس دن طوفان، بجلی اور زلزلوں

کا سلسلہ رہا۔

○ ۳۴۴ھ میں قم نامی شہر زلزلہ میں زمین کے اندر دفن ہو گیا اور اس کی جگہ پانی کی ایک جھیل نمودار ہو گئی۔

○ ۳۳۴ھ میں بغداد میں ایسا زلزلہ آیا کہ حلوان نامی جگہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔

○ ۴۰۱ھ کو جزیرہ سقلیہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ زمین پھٹی اور کئی نہریں نکل آئیں، تقریباً ساٹھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

○ ۶۵۹ھ میں ۱۴ اپریل کو قسطنطنیہ میں ایسا زلزلہ آیا جس کا اثر چالیس دنوں تک محسوس کیا گیا، جس میں ایک سو مسجدیں بھی شہید ہو گئیں۔

○ ۱۱۱۱ھ کو جاوا میں ایسا زلزلہ آیا کہ پندرہ پہاڑ غرقاب ہو گئے۔

○ ۱۳۴۹ھ میں بہار اور نیپال کے علاقہ میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ نیپال کے پہاڑ پر ایک مندر تھا، وہ پہاڑ مندر سمیت زمین میں دھنس گیا اور اس جگہ پانی کا تالاب بن گیا (عجائب مخلوقات، ص: ۱۵۸۔۱۳۶) خدا کی طرف سے بھیجے گئے یہ چند نمونے ہیں، جن کے نقوش تاریخ کی پیشانی پر محفوظ ہیں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس طرح کے کتنے واقعات اس کائنات میں پیش آتے ہوں گے، چند سال پہلے لاتور اور عمرگہ کے علاقہ میں جو ہولناک اور دل کو ہلا دینے والا حادثہ پیش آیا، وہ تو گویا کل کی بات ہے، لیکن کیا قدرت کی ان تنبیہات کا ہمارے دل و دماغ نے بھی کوئی اثر لیا ہے؟ اور ہماری عملی زندگی میں بھی اس کی وجہ سے کوئی تبدیلی آئی ہے؟

(۲۲ دسمبر ۲۰۰۲ء)

گجرات کا زلزلہ اور ہمارا فریضہ

گجرات کا زلزلہ ایک طرف ہمیں اپنے احتساب کی دعوت دیتا ہے، تو دوسری طرف ہمیں مصیبت زدہ انسانوں کی مدد اور خدمت کی طرف متوجہ کرتا ہے، احتساب کی طرف اس لئے کہ یہ اور اس طرح کی قدرتی آفتیں اللہ کے غضب کی مظہر ہوتی ہیں، قرآن مجید نے حضرت شعیب کی قوم پر بطور عذاب زلزلہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

> کیا بستیوں والے اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آپہونچے، جب وہ سوتے ہوئے ہوں؟ یا کیا وہ اس بات کا ڈر نہیں رکھتے کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آپہونچے، جب وہ لہو ولعب میں مشغول ہوں۔ (الاعراف: ۹۷، ۹۸)

اس آیت میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ عذاب الٰہی کے نازل ہونے کے عام اوقات یہی دو ہیں، رات، اور دن چڑھے، رات کا وقت غفلت کا ہوتا ہے، اور دن چڑھا وقت نافرمانوں کے لئے لہو ولعب اور عیش وعشرت کا، پھر قرآن ہی کے بیان پر غور کیجئے کہ جب حضرت موسیٰ ؈ سے فرعون کے جادوگروں نے استفسار کیا کہ کون سا وقت ہوگا جس میں ہم اپنی سحر طرازیوں کا مظاہرہ کریں اور آپ اپنے خیال کے مطابق خدا کی نشانی پیش کریں گے؟ تو حضرت موسیٰ ؈ نے فرمایا: موعدکم یوم الزینۃ (طٰہٰ: ۵۹) یعنی یہ وقت وہ دن ہوگا جو دن تمہارے جشن وسرور کا ہے، جس دن تم جشن مناتے ہو، اسی دن خدا کی نشانی ظاہر ہوگی، گویا بعض دفعہ انسان کی توجہ کو بڑھانے اور نقوش عبرت کو نمایاں کرنے کی غرض سے ایسے وقت کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس قوم کے لئے یوم جشن ہو۔

اب دیکھئے کہ چند سال پہلے لاتور اور عثمان آباد میں عین گنپتی کے دن رات کے وقت تباہ کن زلزلہ آیا، اور معلوم ہے کہ اس علاقہ میں گنپتی برادرانِ وطن کا سب سے بڑا تہوار اور اجتماع کا موقع ہوتا ہے، دوسری طرف گجرات میں ٹھیک چھبیس جنوری یوم جمہوریہ کو زلزلہ نے آدبوچا، اور ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء کے زلزلہ کی یاد تازہ کر دی، نگاہِ عبرت وا کیجئے اور قرآن کے پس منظر میں اس واقعہ کو دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ایک پکڑ اور تنبیہ ہے، جیسے استاذ ایک طالب کی سرزنش کرتا ہے، تاکہ وہ دوسروں کے لئے سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بنے، اور عدالت ایک مجرم کو سزا دیتی ہے، تاکہ وہ دوسرے مجرم کے لئے مایۂ عبرت ہو جائے، اسی طرح رب کائنات کسی قوم کے کچھ لوگوں کو اپنے غضب سے دوچار کرتے ہیں، تاکہ دوسرے لوگ اپنی زندگی کا محاسبہ کریں اور غفلت شعاری سے باز آئیں، اگر ایسے واقعات کو لوگ محض ایک اتفاقی اور طبعی واقعہ کہہ کر گذر جائیں تو اس سے زیادہ کوئی بات افسوسناک نہ ہوگی، اس سے بڑھ کر کون شخص محروم ہوگا کہ چراغ جلے اور وہ اپنی آنکھیں بند کرلے، خطرہ کی گھنٹی بجے اور وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لے؟ اور کوئی تنبیہ بھی اس کے غفلت شعار دل کو جنبش دینے میں کامیاب نہ ہو؟؟

یہ اس حادثہ کا ایک پہلو ہے — دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق بنا کر پیدا کیا ہے کہ دوسرے انسانوں کی شرکت کے بغیر اس کی مسرت میں بھی کوئی لطف نہیں، اور جیسے وہ خوشی میں دوسرے کا محتاج ہے، مصیبت میں اس سے زیادہ دوسرے کا محتاج ہوتا ہے، زلزلہ آئے، سیلاب آئے، تباہ کن طوفان آجائے، وبائی امراض پھیل جائیں، ایسے موقع پر بیک وقت ہزاروں افراد مصیبت اور پریشانی سے دوچار رہتے ہیں، اس لئے ان مواقع پر تعاون کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

اسلام نے ایسے حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ قوم کے لئے ابر رحمت ثابت ہوں، اور مصیبت زدہ انسانوں کو اپنے دامنِ محبت میں جگہ دے، اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اس خصوصی وصف کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں: وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد: ۱۷) اس ارشادِ ربانی

میں اس بات کی طرف بلیغ اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں کو جن لوگوں سے ایذا پہنچی ہو، ان کے مقابلہ میں بھی صبر کی راہ اختیار کرے، اور ان کے ساتھ بھی ان کا رویہ رحم دلی اور مہربانی کا ہو، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، بلکہ چوں کہ غیر مسلموں سے اذیت پہنچنے کا امکان زیادہ تھا، اس لئے عجب نہیں کہ اس آیت میں ان ہی حضرات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو، کیوں کہ صبر کی ضرورت ایسے ہی حق ناشناس بھائیوں کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم کا فرق کئے بغیر اس بات کی تلقین کی ہے کہ فاقہ کے دنوں میں بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، قرابت داروں، یتیموں کا خیال رکھا جائے، اور خاکسار مسکین کی رعایت کی جائے (البلد ۱۴-۱۶) قدرتی آفات کے نتیجہ میں کتنے ہی لوگ فاقوں سے دوچار ہوتے ہیں، بچے یتیمی کا داغ سہتے ہیں، اور کل کے دولت مند آج کے مسکین ٹھہرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ مصیبت زدہ لوگ بھی شامل ہیں، قرآن ہی میں قیدیوں کو کھانا کھلانے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بھی حکم آیا ہے، (الدہر ۸) اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے قید میں مشرکین ہوا کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اسیر'' سے مراد وہ مشرکین ہیں، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں: (قرطبی ۱۹/۱۲۹) اس سے معلوم ہوا کہ جو غیر مسلم بھائی مشکل حالات میں ہوں، ان کی ضرورت پوری کرنا بھی اجر و ثواب کا باعث ہے، چنانچہ اس نصیحت کا صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ اثر ہوا کہ غزوۂ بدر کے موقع سے رسول ﷺ نے جن قیدیوں کو مسلمانوں کے حوالہ کیا، ان کا بیان تھا کہ مسلمان خود تو کھجور کھا کر رہ جاتے، اور ہمیں صبح وشام روٹی کھلاتے، اور روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، ان کے اس ایثار کی وجہ سے ہمیں حیاء محسوس ہوتی تھی، (سیرت ابن ہشام ۲/ ۲۵۶-۵۷) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور اس میں مسلمان اور غیر مسلموں کی کوئی تفریق نہیں کی، مفسرین بھی یہی لکھتے ہیں کہ اس میں مسلمان اور کافر سب شامل ہیں، اور ہر پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک مستحب ہے (قرطبی ۵/ ۱۸۴) قتادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے

بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا کافروں پر بھی انفاق کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۲ نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ ان کی ہدایت تمہارے ذمہ نہیں ہے، وہ جو کچھ خرچ کرتا تو تم جو بھی خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا بدلہ ملے گا، اور تمہارے ساتھ کوئی حق تلفی نہیں ہوگی (تفسیر [illegible])

چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے یہودی قرابت دار کے لئے متروکہ کے کچھ حصہ کی وصیت کی تھی۔ (سنن دارمی، باب الوصیۃ لاہل الذمۃ) خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی حلہ عطا فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض گذار ہوئے کہ آپ ﷺ نے تو ریشمی کپڑے کے استعمال سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارے پہننے کے لئے نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی اور طرح فائدہ اٹھاؤ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ جوڑا اپنے ایک بھائی کو جو مشرک تھے اور مکہ میں مقیم تھے تحفۃً بھیج دیا۔ (بخاری، باب الہدیۃ للمشرکین)

اگر غیر مسلموں پر کوئی مصیبت آتی تو خاص طور پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرتے، چنانچہ جب مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوئے، تو حالانکہ اس وقت اہل مکہ کی مسلمانوں سے عداوت اپنے شباب پر تھی، لیکن آپ ﷺ نے سرداران کفار ابو سفیان اور صفوان بن امیہ کو پانچ سو درہم بھیجے کہ وہ اسے مکہ کے ضرورت مند اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دیں، رسول اللہ ﷺ کے اسی عمل سے استدلال کرتے ہوئے امام محمدؒ کہتے ہیں کہ کافر خواہ حربی ہو یا ذمی، یعنی مسلمانوں کے ساتھ اس کی صلح ہو یا نہ ہو، اس کا مالی تعاون کرنے میں حرج نہیں: لا بأس للمسلم ان یعطی کافرا حربیا او ذمیا۔ (ردالمحتار [illegible])

اس لئے مصیبت کی اس گھڑی میں مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں کی مدد کے لئے آگے آنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے، اس سے جہاں انسانی خدمت اور انسانی ہمدردی کا فریضہ ادا ہوگا، وہیں برادران وطن سے تعلقات استوار ہوں گے، غلط فہمیاں دور ہوں گی، نفرت اور شکوک و شبہات کی جو بھی فرقہ پرستوں نے برادران وطن کے دلوں میں

ہوئی ہے، اس کی تخم ریزی ہوئی، محبت اور اعتماد کے پھول کھلیں گے، ارتباط بڑھے گا، اور دعوت کے مواقع پیدا ہوں گے۔ گجرات وہ جگہ ہے جو اس وقت پورے ملک میں فرقہ پرستی کا مرکز ہے، اقلیتوں کے خلاف جو بھی منصوبے بنتے ہیں پہلے گجرات اور اترپردیش میں ان کا تجربہ کیا جاتا ہے، فسادات کی رتھ یاترا یہیں سے شروع ہوئی، اور اس وقت اس صوبہ میں کتنی ہی مسجدیں ہیں، جو نمازیوں کو ترس رہی ہیں، اور برادران وطن کا ان پر ناجائز قبضہ ہے، لیکن زلزلہ کے موقع سے مسلمان نوجوانوں نے جس ایثار اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا اس نے پتھر کو پگھلا دیا، اور ایک حد تک نفرت کی آگ کو بجھایا ہے، یہاں تک کہ احمد آباد میں ایک مسجد جو حساس غیر مسلم آبادی کے درمیان تھی اور مسلمان وہاں جاکر نماز پڑھنے سے قاصر تھے، خود غیر مسلم بھائیوں نے اسے دھویا، صاف ستھرا کیا، اور مسلمانوں کو مسجد آباد کرنے کی دعوت دی، یہ معمولی اور وقتی اخلاق کا کرشمہ ہے، اگر ہم ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے اور خدمت خلق کا کام کرتے ہوئے اپنے غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات استوار کریں، اور انسانی اخوت کے رشتہ کو ان پر واضح کریں تو ہندوستان جیسے ملک میں دعوت دین کے وسیع مواقع بھی پیدا ہوسکتے ہیں، اور نفرت کا جو آتش فشاں یہاں سلگایا جارہا ہے، ہم محبت کی شبنم سے اسے بجھا بھی سکتے ہیں؟؟

اپنی عیال کو آگ سے بچایئے!

انسان پر جیسے دوسروں کے حقوق ہیں، اسی طرح اس پر خود اپنی ذات کا، اپنے بال بچوں اور اپنے عزیزوں کا بھی حق ہے، بلکہ یہ حق نسبتاً زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے اور آخرت میں اس کے بارے میں جواب دہی بھی زیادہ ہے۔ انسان پر اس کی ذات کے، اور اس کے اہل وعیال کے کیا حقوق ہیں اور اپنے زیرِ پرورش لوگوں کے تئیں اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ قرآن وحدیث میں جا بجا اس کا ذکر ہے۔ یہ حقوق انسان کی مادی ضروریات سے متعلق بھی ہیں اور اس کی دینی اور اخروی حاجات سے متعلق بھی اور یقیناً اس کی دینی ضروریات سے متعلق حقوق زیادہ اہم ہیں، کیوں کہ مادی ضرورتوں کا تعلق تو ایسے مستقبل سے ہے جو چند سالہ ہے اور جس کی انتہا قبر کی منزل پر ہو جاتی ہے، لیکن دینی اور اخروی ضرورتیں ایسے مستقبل سے متعلق ہیں، جن کی کوئی نہایت نہیں، اس لئے ایک صاحبِ ایمان جو آخرت میں جواب دہی کا احساس رکھتا ہو اور جو اس دنیا پر یقین کرتا ہو، یقیناً اس وسیع اور نہ ختم ہونے والے مستقبل سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید نے انسان کو اسی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے متنبہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ" قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم: ۶) یہ آگ سے بچانا کیونکر ہوگا؟ ایمان اور عملِ صالح کے ذریعہ، ایمان کیا ہے؟ قرآن وحدیث میں جن جن باتوں کا ذکر آیا ہے، ان سب کو ماننا اور بے کم وکاست ان کا یقین کرنا۔ ایمان صرف کلمہ پڑھنے کا نام نہیں، اگر ایک شخص اپنی زبان سے توحید کا اقرار کرتا ہو اور قرآن کے کسی حکم کا انکار بھی، رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، لیکن آپ ﷺ کی کسی سنت کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہ کرتا ہو، آپ کو نبی مانتا ہو لیکن آپ ﷺ کے بعد

کسی اور نبی کے آنے کا قائل ہو تو ظاہر ہے وہ صاحب ایمان کیسے ہو سکتا ہے، یعنی حقیقت میں وہ کفر کی راہ پر ہے۔ ایمان کا مسئلہ بہت نازک ہے، بعض اوقات انسان ہنسی مذاق میں، غیظ و غضب اور ضد و عناد میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو اسے دولت ایمان سے محروم کر دیتی ہیں اور اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے اس نادانستہ اس محرومی سے بچنے کے لئے ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے علم سے زیادہ سے زیادہ اور احکام دین سے واقف ہونا۔ بے علمی اور نا آگہی و جہالت وہ دلدل ہے جو انسان کو راہ حق سے دور لے جاتی ہے اور گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔

آگ سے بچنے کے لئے دوسری ضروری چیز عمل صالح ہے۔ عمل صالح کے معنی اچھے کام کے ہیں۔ کوئی کام اس وقت اسلام کی نگاہ میں عمل صالح بنتا ہے جب اس میں تین باتیں پائی جائیں۔ اول وہ حکم خداوندی کے مطابق ہو، دوسرے اس عمل کو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر انجام دیا جائے، تیسرے اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور رضا کا حاصل کرنا ہو، شہرت و ناموری، عہدہ و جاہ اور دنیا طلبی مقصود نہ ہو۔ اگر یہ تینوں باتیں جمع ہوں تو وہ عمل صالح ہے اور ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ پائی جائے تو وہ عمل صالح نہیں۔ ظاہر ہے کہ عمل صالح کو جاننے اور اس کو اختیار کرنے کے لئے قدم قدم پر علم کی ضرورت ہے، ایک وضو اور نماز ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس سے متعلق کتنے مسائل و احکام ہیں؟ انسان بوڑھا ہو جائے اور اپنی پوری عمر طے کر لے پھر بھی ان مسائل کا احاطہ نہیں کر پاتا، ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے، اہل علم سے استفسار کرنا پڑتا ہے، بلکہ خود اصحاب علم بھی ایک دوسرے سے رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ فقہ کا ایک سمندر بیکراں ہے جو انہی اعمال صالحہ کی تشریح و توضیح سے عبارت ہے۔

غرض انسان کے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو آخرت کی آگ سے بچانے اور جہنم کی سختی سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ ایمان اور عمل صالح ہے، اور ایمان ہو یا عمل صالح، جب تک دین کا علم نہ ہو، احکام شریعت سے آگہی نہ ہو، کتاب و سنت سے واقفیت اور دین کا فہم نہ ہو، حاصل نہیں ہو سکتا اور ایمان و عمل کا حق جہل و نا آگہی کے ساتھ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

اس لئے ہر مسلمان کے لئے اپنی ضروریات کے مطابق علم دین کا حصول فرائض میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بہ وضاحت ارشاد فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم شاید ہی دنیا کے کسی مذہب میں علم کی یہ اہمیت ظاہر کی گئی ہو۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں اور کوئی علم داخل ہو یا نہ ہو، علم دین تو ضرور ہی داخل ہے۔ کیوں کہ یہ ایسا فریضہ ہے کہ جس کے بغیر دین کا کوئی فرض ادا ہو ہی نہیں سکتا، وضو اس لئے فرض ہے کہ اس سے نماز ادا کی جائے، حرمین شریفین کا سفر اس لئے فرض ہے کہ حج کی ادائیگی ہو سکے، تو علم سے تو تمام ہی فرائض متعلق ہیں، نماز و روزہ حج و زکوۃ، نکاح و طلاق، حلال و حرام، خلوت و جلوت اور رزم و بزم کون سی جگہ ہے اور کون سا موقع ہے جہاں انسان علم کا محتاج نہ ہو، اس لئے علم دین اہم ترین فریضہ ہے، ایسا فریضہ کہ جس پر تمام فرائض کی ادائیگی منحصر ہے۔

اس لئے یقیناً قرآن مجید نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانے کا حکم دے کر بالواسطہ علم کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، ہمارے سرکاری نظام تعلیم میں آزادی کے بعد ہی سے ہندو تہذیب کی چھاپ ڈالنے کی کوشش رہی ہے، لیکن اب یہ کوشش بے لباس اور تیز رفتار ہے، مسلمان بچوں کو شرک کا تصور سے مانوس کیا جا رہا ہے، دیویوں اور دیوتاؤں کا تقدس ان کے ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے، ہندو بزرگوں کی عظمت ان کے قلوب میں راسخ کی جاتی ہے، مسلمانوں کی تاریخ کو ڈاکوؤں اور لٹیروں کی تاریخ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ مسلمان بچے احساس کمتری میں مبتلا ہوں، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت مبارکہ اور اسلام کے قرن اول کی تاریخ کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کی عظمت نئی نسل کے دل سے نکل جائے۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے دینی تعلیم کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔

دینی تعلیم کا ایک درجہ تو ضروریات دین کی تعلیم کا ہے، یہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، ہمارے جو بچے عصری درسگاہوں میں زیر تعلیم ہیں، ان کے لئے بھی قرآن مجید کا

یا تجوید ناظرہ، کچھ سورتوں کا حفظ، رسول اللہ ﷺ کی سیرت، ضروری فقہی مسائل اور شب و روز کے مختلف احوال سے متعلق جو ادعیہ و اذکار منقول ہیں ان کا یاد کرنا تو ہر مسلمان بچے کے لئے ضروری ہے، اب اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہو گئی ہے کہ ان کو اسلام کی اور مسلمانوں کی تاریخ بھی پڑھائی جائے تاکہ وہ مسلمانوں کی تاریخ سے واقف ہو سکیں اور اسلام پر مغربی مستشرقین اور ان سے متاثر ہو کر مشرق کے اہل علم جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے جواب میں بھی رہنمائی کی جائے تاکہ غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کے دام ہمرنگ زمین سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

علم دین حاصل کرنے کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ امت میں کچھ لوگ قرآن و حدیث کا تفصیلی علم حاصل کریں، کتاب و سنت پر ان کی گہری نگاہ ہو، فقہی مسائل پر ان کی وسیع نظر ہو۔

ایمانیات اور عقائد کی گہرائیوں تک ان کی رسائی ہو، ہر عہد میں اسلام کے خلاف جو فتنے کھڑے ہوں، وہ ان کے مقابلہ کی صلاحیت کے اہل ہوں۔ وہ اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں، اپنے عہد کے پیدا ہونے والے مسائل کو فراست ایمانی کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں حل کریں۔ یہ امت پر فرض کفایہ ہے، جیسے کسی ملک کی سرحد پر فوج کا دستہ گزارا جاتا ہے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس پر صرف کثیر اخراجات ہو رہے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ ملک کے سب سے بڑے محسن اور اس کی سالمیت کے ضامن ہیں، یہی مقام فکری اعتبار سے کسی بھی عہد میں علماء دین کا ہے، یہ ہمارے معنوی وجود، ہمارے فکری تشخص اور ہمارے تہذیبی امتیازات کے محافظ ہیں، اگر کسی زمانہ میں اگر کوئی عالم نہ ہو تو قرآن کا ترجمہ تحقیق علماء کے بغیر یا ناواقف دانشوران کو چھپ سکتے ہیں، عالم محض بے عمل کے اعتبار سے تو وہ ہو سکتی ہے لیکن اسکے باوجود دین کی فکر کے بارے میں غلطی میں نہیں پڑ سکتا اور پروپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہو سکتا اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی خاندان ایک دو عالم دین سے خالی نہ ہو، یہ انشاء اللہ ان کے خاندانوں کے لئے حفاظت دین کی ضمانت ہے۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے ایسا سوچ لیا ہے کہ یہ عظیم الشان علم صرف غریب اور

کے ساتھ وسطی لوگوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں میں مرفہ الحال اور اصحابِ ثروت کا طبقہ علمِ دین کی طرف سے بالکل ہی بے توجہ ہے۔ بلکہ وہ اسے حقارت اور کمتری کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ نہایت ہی افسوس ناک بات ہے۔ یہ سمجھنا تو درست نہیں کہ یہ غریب طلبہ ذہنی اور فکری اعتبار سے مفلس ہوتے ہیں۔ یہ یوں ایک بات ہے جس کا واقعات و تجربات سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غریب گھرانوں کے بچے علم کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں، چنانچہ اس وقت کئی ایسے اسکول اور دینی تعلیم کے ادارے ہیں جن میں زیادہ تر اسی طبقے کے طلبہ کو ہی داخل کر رہے ہیں۔ لیکن اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ طلبہ معاشی اعتبار سے پست ماحول سے آتے ہیں اور بسا اوقات احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے اور سماج میں جو مرفہ الحال طبقہ ہے اس سے انہیں اپنی بات کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے، اس سے سماج میں کمزور طبقے دینی مسائل اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح سے محروم رہتے ہیں۔ اگر سماج کے معزز سمجھے جانے والے لوگ علمِ دین حاصل کریں تو وہ اپنے طبقہ کے لوگوں سے بے تکلف بات کر سکتے ہیں اور بے جھجک اسلامی تعلیمات کو ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کے معزز اور مرفہ الحال لوگ علمِ دین کی طرف متوجہ ہوں اور اس محرومی کو ختم کرنے میں آگے آئیں۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ آخر علمِ دین کی طرف سماج کے اونچے طبقے کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ حالانکہ ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جو بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں تہذیب و شائستگی اور بڑوں کا ادب و احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، نگاہ اور زبان کی حفاظت اور اپنے فرائض کے تئیں جواب دہی کے احساس کا عنصر زیادہ ہے؟ پھر کیا بات ہے کہ اس کے باوجود علم کا یہ شعبہ لوگوں کے التفات سے محروم ہے؟؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جو لوگ دین اور علمِ دین کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کے پاس مادی وسائل کم ہیں، ان کو کم تنخواہوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، یہی ایک بات ہے جس نے مادہ پرست انسان اور جدید فکر و ذہن کے حاملین کو علمِ دین کی طرف آنے سے روکا ہوا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ان کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کیا کھائیں گے؟

اور کیوں کر زندگی گذاریں گے؟

اس سلسلہ میں مسلمان سماج کے لئے دو باتیں قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ کیا مسلمانوں کا معاشرہ اپنے دینی تحفظ کے لئے ایک ایسے طبقہ کی صحیح طریقہ پر کفالت نہیں کر سکتا جن کی تعداد بمشکل ایک فی ہزار ہوگی؟ اگر مسلمان اپنی دوسری ضروریات کی طرح دینی خدمت گذاروں کو بھی اپنے لئے ایک ضرورت باور کریں اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کے تعاون کے لیے ہاتھ بڑھائیں اور خادمین دین کو کم سے کم معاشی اعتبار سے اس لائق بنائیں کہ وہ متوسط طریقہ پر سماج میں اپنی زندگی بسر کر سکیں، تو یقیناً اس علم سے بے اعتنائی اور بے رغبتی کی یہ کیفیت باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں ہے، بعض وہ قومیں جو باطل فکر و نظر کی حامل ہیں، اپنے مذہب اور مذہبی شخصیتوں کے لئے کل آمدنی کا دس فیصد وقف کی ہوئی ہیں، مسلمان اتنی بڑی قوم ہے کہ اگر وہ آمدنی میں دین کے خدمت گذاروں کے لیے ایک فی صد بلکہ نصف فی صد بھی حصہ مقرر کر لیں تو ان کے ائمہ، مؤذنین، علماء اور دینی کام کرنے والے بہتر حالات میں اپنی زندگی گذار سکتے ہیں اور بعض اوقات غربت و احتیاج کی وجہ سے اس طبقہ میں جو دناءت اور پستی کی بعض باتیں پیش آتی ہیں، ان کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ کاش! مسلمان اس پہلو سے غور کریں، کہ خادمین دین کے وقار کو بلند کرنا دراصل خود دین کے وقار کو بلند کرنا ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں معیشت کا علم سے کچھ زیادہ ربط نہیں ہے، ہمارے اسی شہر میں کتنے لوگ ہیں جو نشانِ ابہام سے کام چلاتے ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کے ملازم ہیں اور دولت ان کے قدموں میں نثار ہے، کتنے انجینئر بیکار ہیں، اور کتنے ڈاکٹر بے روزگار ہیں اور کتنے قانون داں مؤکل کی تلاش میں خاک چھانتے نظر آتے ہیں، اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر ایک شخص علم دین حاصل کرے گا تو بھوکا مرے گا اور دوسرے علوم حاصل کرے گا تو اس کے گھر میں "ہن" برسنے لگیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزاق اور روزی رساں ہیں، چاہیں تو پڑھے لکھے لوگوں کو محروم رکھیں اور چاہیں تو جاہلوں کو سرفراز فرما دیں۔ پھر یہ ایک نظریہ نہیں، بلکہ تجربہ اور آزمودہ حقیقت ہے

کہ جو لوگ اللہ کے دین کے کام میں مشغول ہیں، اللہ ان کو ضائع نہیں کرتا اور غیب سے ان کی کفالت کا سروسامان کرتا ہے۔ آخر اسی معاشرہ میں دو دینی تعلیم یافتہ لوگ بھی موجود ہیں جو خوش پوش بھی ہیں، باعزت طریقہ پر اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے امت کے دل میں ان کی محبت اس طرح ڈال دی ہے کہ مشکل مواقع پر یاد کیے جاتے اور بلا طمع و اشراف وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں، اس لیے بھروسہ اللہ پر ہونا چاہئے۔ اگر ایک مسلمان میں اللہ کی رزاقیت کا یقین بھی نہ پیدا ہو، تو یہ کیسا کھوکھلا اور بے روح ایمان ہے؟

پس ہندوستان کے موجودہ حالات میں اور عالمی حالات کے پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان دینی تعلیم کی اہمیت کی طرف متوجہ ہوں۔ آج ہمارے ملک میں مدارس اسلامیہ کے خلاف آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، کئی سطح پر بھی ان کو بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا مرکز قرار دیا جارہا ہے، یہ سب ان لوگوں کی زبان ہے کہ اسلام سے جن کی عداوت ظاہر و باہر ہے۔ اعدائے اسلام کا یہ دعویٰ سراسر بے بصیرت ہے، جو لوگ حق و راستی کے دشمن ہوں، وہ تو مدارس کی اہمیت کو کم سمجھیں کہ جو لوگ صاحب ایمان اور اسلام کے نام لیوا ہیں، وہی اسلام کی حفاظت اور اس کی بقا میں مدارس کی کردار کی اہمیت کو نہ سمجھیں، اس سے زیادہ قابلِ افسوس اور کیا بات ہوگی؟

اولاد کی فکر کیجئے!

انبیاء و رسل میں ایک اہم ترین ہستی سیدنا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی گویا دنیا کی آبادی کا قریب قریب تین چوتھائی حصہ آپ کی عظمت پر متفق ہے، اور آپ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نہ صرف خود نبی تھے، بلکہ ابو الانبیاء تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) بھی نبی تھے، پھر حضرت اسحاق (علیہ السلام) کے صاحبزادے حضرت یعقوب (علیہ السلام) نبی ہوئے، حضرت یوسف (علیہ السلام) بھی نبی بنائے گئے جو حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے فرزند تھے، یعنی حضرت یعقوب جن کے آباء و اجداد تین پشت سے پیغمبر تھے، اور آئندہ بھی بنی اسرائیل کے تمام انبیاء آپ ہی کی نسل میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید نے ان کی وفات کا واقعہ ذکر کیا ہے، جو اس طرح ہے:

> ''کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب پر موت آئی؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے دریافت کیا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم آپ کے رب اور آپ کے باپ دادا ابراہیم (علیہ السلام)، اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) کے رب کی — جو ایک ہی معبود ہے — کی عبادت کریں گے، اور اسی کے فرماں بردار ہو کر رہیں گے، یہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، ان کے لئے ان کے اعمال ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی پوچھ نہیں ہوگی۔ (البقرہ: ۱۳۳)

یہ آیت بظاہر جیرت میں ڈالتی ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) جیسی شخصیت جن

کے یہاں چار پشتوں سے نبوت چلی آرہی تھی، جن کی اولاد میں بھی نبی تھے، اور آئندہ سلسلۂ اولاد میں بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء کو پیدا ہونا تھا، ایسا شخص اپنی موت کے وقت اس بارے میں فکرمند ہے کہ خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ کس کی پرستش کریں گے؟ جب ان کے بیٹے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ توحید، تعلق مع اللہ اور خدا کی اطاعت و فرماں برداری کے راستہ پر قائم رہیں گے تو اب ان کو اطمینان ہوتا ہے، یہ معمولی بات نہیں ہے، اس میں امت مسلمہ کے لئے عبرت و موعظت کا سامان ہے، کہ ایک صاحب ایمان کو کبھی بھی اپنے بچوں کی دینی کیفیت کے بارے میں غافل نہ ہونا چاہئے۔ جیسے ایک تاجر چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اچھی سے اچھی تجارت چھوڑ کر جائے، جیسے ایک کارخانہ دار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے صنعت کے میدان میں ترقی کریں۔ جیسے ایک ملازم کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے بچے اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوں، بلکہ انسان کا بس چلے تو وہ آئندہ کے لئے سات پشتوں کی معیشت کا انتظام کر جائے، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ایک مسلمان کو اپنی اولاد کے بارے میں فکرمند ہونا چاہئے کہ ایمان اور عمل صالح کے اعتبار سے اس کی اولاد صحیح راہ پر گامزن ہو، اور وہ خدا کی پرستار اور اس کی فرماں بردار ہو۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کتنا بھی دیندار خاندان ہو، خاندان میں علماء اور حفاظ ہوں، دین کی دعوت و اشاعت کا کام کرنے والے لوگ ہوں، اسلامی شعور رکھتے ہوں، لیکن اپنی اولاد کی طرف سے مطمئن نہ رہیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ بہرحال دین پر قائم رہیں گے، کیوں کہ انبیاء سے بڑھ کر تقویٰ شعار اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انبیاء اپنے خاندان اور اہل و عیال کے بارے میں کبھی بے فکر نہیں رہے، خود پیغمبر اسلام ﷺ اپنی پھوپھی اور اپنی صاحبزادی کو خطاب کر کے فرماتے کہ آخرت سے پہلے کچھ کر لو، ورنہ مجھ سے قرابت بھی تم کو کام نہیں آئے گی۔ اسی لئے قرآن مجید نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد متنبہ فرمایا ہے کہ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے، اور تم بھی گو انہیں کی نسل سے ہو، لیکن تمہارے بارے میں فیصلہ

تمہارے اعمال کے مطابق ہوگا۔

جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جن کا یقین یہ بات ہے کہ یہی دنیا آخری دنیا ہے، وہ اگر اپنے بال بچوں کے لئے صرف مال و متاع اور شکم و زر کی فکر کریں، تو مقام تعجب نہیں کہ ان کے نزدیک تو اس مادی دنیا کے آگے کوئی منزل ہی نہیں، لیکن اگر مسلمان بھی اسی راہ پر چلیں، تو یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے کوئی مسافر راستہ کو ہی منزل سمجھنے لگے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس وقت ہم لوگوں کا حال کچھ ایسا ہی ہے، ہمارے بچے بہت کم عمری میں مشنری انگلش زبان کے طرز پر چلنے والے دوسرے اسکولوں کے حوالے کردیئے جاتے ہیں، یا جو عام صورت دین سے بالکل بے بہرہ اور اپنی تاریخ سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں، مزید بدقسمتی یہ ہے کہ یہ مادری زبان سے بھی کٹ جاتے ہیں، اسلامی علوم کا بہت بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے، اس پورے سرمایہ سے ان کا رشتہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے، گھر میں دین کا ماحول پہلے سے نہیں، ٹی وی نے صورت حال اتنی خراب کردی ہے کہ الفاظ ان کو بیان کرنے سے قاصر ہیں، ان حالات میں آپ کیوں کر اطمینان کر سکتے ہیں کہ آپ کی نسل آپ کے بعد بھی اس دینی امانت کو تھامے رہے گی، جس کے آپ حامل ہیں، اور گمراہ کن نظریات ان کو اپنا شکار نہ بنا لیں گے؟

اس لئے موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ مسلمان بنیادی دینی تعلیم کا اپنا آزادانہ نظام قائم کریں، اور اس نظم کو خود کفیل بنائیں، اس سلسلہ میں گجرات کا علاقہ ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں بہت اچھی منظم بنیادوں پر دینی مکاتب کا نظم قائم ہے، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ مکتب کے جال بچھے ہوئے ہیں، مکاتب کے اوقات تعلیم ایسے ہوتے ہیں کہ سرکاری اسکولوں میں جانے والے بچے یا تو اسکول جانے سے پہلے مکتب میں وقت لگائیں، یا اسکول سے واپسی کے بعد، مکتب کی تعلیم ساتھ میں ایک دینی تعلیم بھی چالو ہے، یہی نظام پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو کرنا ہوگا، تاکہ ہمارا کوئی بچہ بنیادی دینی تعلیم سے نا آشنا نہ رہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کی

صورت میں ہمیں ایسا مرکز دیا ہے جس سے بہتر کوئی اور مرکز نہیں ہو سکتا، یعنی مسجد مدرسہ ہے وہاں جو ائمہ، موذنین اور مسجد کے خدام ہیں، جو مدرسین و معلم ہیں، اگر ہر مسجد میں صباحی اور مسائی تعلیم کا ایک مستحکم نظام قائم کریں، بچوں کے لئے ایک ایسا کورس مرتب کریں جس میں ناظرہ قرآن اور اذکار و ادعیہ کے علاوہ اردو زبان، سیرت نبوی، اور اسلامی تاریخ کی بھی مناسب تعلیم ہو جائے اور بچوں کی فکری تربیت بھی ہو اور وہ شعوری طور پر اسلام کو سمجھ سکیں، تو یہ بہت بڑا کام ہوگا، اور اس طرح ہم آنے والی نسل کی حفاظت کر سکیں گے۔

اس کے علاوہ دوسرا میدان گرمائی تعطیلات کا ہے، جس میں ڈیڑھ ماہ یا اس سے زیادہ طلبہ کو فرصت ملتی ہے، ۴۵ر ۵۰ر دن کا عرصہ کم نہیں ہے، اگر ہم ان اوقات کا صحیح استعمال کریں تو اس تعطیل سے بھی بڑا کام لیا جا سکتا ہے، اس میں مڈل اسکول، ہائی اسکول اور کالج کی سطح کے طلباء کے لئے اسلامیات کا علاحدہ علاحدہ مختصر کورس ترتیب دینا چاہئے، جس میں ناظرہ قرآن مجید، کچھ سورتوں کا حفظ، سیرت نبوی، اسلامی تاریخ، فقہ اسلامی وغیرہ موضوعات پر اسباق دیئے جائیں، تعارف اسلام خطبات کا نظم کیا جائے، اور ان کو اخلاقی تعلیمات سے بھی مزین کیا جائے، ایسی گرمائی درس گاہ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، کچھ ادارے اس سلسلہ میں کوشش کر رہے ہیں، لیکن ضرورت اس سے بہت زیادہ کی ہے، اور جہاں کہیں گرمائی کلاس قائم کئے جا رہے ہیں، لوگوں کا رجوع حوصلہ افزا ہے، لیکن اتنا نہیں، جتنا ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ نوجوانوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت لگانا چاہئے، اور سرپرستوں کو اس سلسلہ میں اپنے بچوں کو بھیجنا چاہئے، کیوں کہ جب انسان اپنے ماحول سے باہر نکلتا ہے اور کسی چیز کو حاصل کرنے میں یکسو ہو جاتا ہے تو کم وقت میں بھی زیادہ کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ نوجوان طلبہ کو اسلام سے قریب کرنے اور موجودہ مسموم ماحول سے بچانے کے لئے اور بھی وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں مخالف اسلام طاقتیں پوری طرح اس بات کے لئے سرگرم ہیں کہ وہ مسلمانوں کی اگلی نسل کو اپنی فکر اور اپنی تہذیب کے ساتھ جذب کر لیں، اور ان کو ان کی فکری میراث سے محروم کر دیں۔ ان حالات میں اگر ہم نے غفلت، بے شعوری، خدا فراموشی اور خود فراموشی سے کام لیا تو اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ ہماری فکری اور ملی وجود ایک قصۂ پارینہ بن جائے، انشاء اللہ کفر کے پھونکوں سے نور حق بجھایا نہ جاسکے گا، لیکن ضرور ہے کہ ہم اس کے لئے قانون بن کر زندہ رہیں، اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ جو دولت ایمان ہمیں حاصل ہے وہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور ہمیں اس امانت کو اپنی اگلی نسلوں تک پوری ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ پہونچانا ہے!!

(۶/۵/۲۰۰۰ء)

ماضی کو یاد رکھئے

گاندھی جی نے انصاف پرور اور دانشمند ترین حکمرانوں کی فہرست بنائی ہے اور اس میں پہلا نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تعجب نہ کیا جائے، بابائے قوم مہاتما گاندھی جی یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کو آزاد ہونے کے بعد وہی طریقۂ حکمرانی اختیار کرنا چاہئے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت مختلف جہتوں سے بہت مکمل اور جامع تھی۔ آپ کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ تھا کہ اقتدار نے کبھی آپ کو غیر متوازن نہ ہونے دیا۔ یہ آسان نہیں کہ آدمی زمین اقتدار پر متمکن ہو، ملک و قوم کی قسمت کا فیصلہ اس کے قلم سے لکھا جاتا ہو، کوئی زبان اس کو چیلنج کرنے والی اور کوئی پنجہ اس کے دست استبداد کو تھامنے والا نہ ہو، لیکن پھر بھی اقتدار کی ''نشہ'' اس کو بدمست ہونے نہ دے، دولت و اقتدار کا خمار اس کے دل و دماغ تک رسائی نہ پا سکے، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اپنے ماضی کو یاد رکھے اور اپنی پرانی سطح کو فراموش نہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں پوری طرح یہ وصف موجود تھا، وہ خلیفہ ہونے کے بعد امت کے ایک عام فرد کی طرح رہتے تھے، لباس و پوشاک ہو، کھانا پینا ہو، لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور عمومی سلوک ہو، معیار زندگی کے اعتبار سے انہوں نے اپنے آپ کو عام لوگوں کی سطح پر رکھا تھا، اس کا اثر تھا کہ وہ غریبوں کا غم جانتے تھے اور ان کے لئے غریبوں کے مسائل ''جگ بیتی'' نہیں بلکہ ''آپ بیتی'' تھے، اس لئے ہمیں ان کی زندگی میں عدل و انصاف، مساوات، برابری، غریب پروری اور کمزوروں و زیردستوں کی دستگیری کے جو نمونے ملتے ہیں، کہیں اور مشکل ہی سے ملیں گے۔

عتبہ بن فرقد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے آذربائیجان کی مہم پر مامور تھے، [illegible]

باجماعت کے موقع پر انہوں نے کھجور اور گھی سے مرکب ایک خوش ذائقہ کھانا تیار کیا جسے "خبیص" کہا جاتا ہے اور اسے اپنے غلام حکیم کے ساتھ تھال میں رکھ کر اور کپڑے سے ڈھک کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا۔ حکیم آئے تو حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ حضرت عتبہؓ کی طرف سے تحفہ بنایا گیا، آپؓ نے چکھا اور فرمایا کہ عمدہ ہے، خصوصی طور پر بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے "إن هذا لطيب أثر" پھر دریافت فرمایا کہ تمام مہاجرین نے اس سے آسودہ ہو کر کھایا ہے؟ حکیم نے عرض کیا: نہیں، یہ تو صرف آپ کے لئے خاص طور پر آپ کے لئے بنوایا ہے۔ عام طور پر ایسی خوشامد کی باتیں ارباب اقتدار اور اصحاب اختیار کو باغ باغ کر دیتی ہیں اور ان کے دل میں ایسے کارکنوں کی عزت بڑھ جاتی ہے، لیکن حضرت عمرؓ کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی، آپؓ نے فوراً عتبہؓ کو ایک تنبیہی خط لکھا کہ یہ جو بیت المال کا مال ہے، یہ نہ تمہاری محنت کا ہے اور نہ تمہاری ماں اور نہ تمہارے باپ کی محنت کا ہے: "ليس من كدك ولا من كد أبيك" پھر تحریر فرمایا کہ مجھے وہی کھانا کھلاؤ جس کو عام مسلمان آسودہ ہو کر کھائیں۔ (فتوح البلدان ص ۳۰۲)

آج ان لوگوں کا تو خیر کیا ذکر، جو صبح سے شام تک مادیت میں ڈوبے ہوئے ہیں، جو خواب بھی دنیا ہی کا دیکھتے ہیں اور جن کی بیداری کا ایک ایک لمحہ دنیا کی فکر میں گزرتا ہے، اہل دین بھی کیا حضرت عمرؓ کے عمل کو اسوہ بنانے کو تیار ہیں؟ دینی مجلسوں اور محفلوں میں بھی مرتبہ اور حیثیت کا امتیاز موجود ہے، بڑوں چھوٹوں کا فرق ہے، اکابر و اصاغر کی تفریق ہے، اور تقویٰ کی بنیاد پر نہیں بلکہ دولت، قرابت اور شہرت و کثرت کی نسبت سے درجے قائم کر دیئے گئے ہیں، جب معمولی سا اقتدار آدمی کو توازن سے محروم کر دیتا ہے تو ان لوگوں سے کیا گلہ جو اقتدار کی بلندی پر پہنچ کر [illegible] والوں کو [illegible]

انسان دوسرے انسان کو انسان سمجھتا [illegible] یا خود اپنے آپ کو انسان سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق خیال کرنے لگتا ہے تو وہ انسانوں کے غم کی چوٹ اپنے کلیجہ پر محسوس نہیں کر سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان کے مزاج کو [illegible] متوازن اور

طرح یہ فکر اس کو مسلسل تازہ رکھتی ہے، ورنہ انسان اپنے ماضی کو بھولتا چلا جاتا ہے اور جب بھولی
اور اپنے ماضی سے دور ہوتا جاتا ہے۔ کبر و نخوت بڑھتی چلی جاتی ہے، اس لئے جب انسان دولت و
ثروت، حکومت و اقتدار اور شہرت و مقبولیت کے بام پر پہنچ جائے، تب تو ضروری ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے
ہوئے سوچتا رہے اور اس زینہ کے پیچھے کی ہوئی زندگی کو دیکھتا جائے اور یاد رکھے کہ اس
نے کہیں سے اپنا سفر شروع کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہم نام فرزند حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا
ننھیالی سلسلہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے ملتا ہے۔ رجاء بن حیوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ
کے قدیم رفقاء میں تھے۔ انہیں کے مشورہ سے بارِ خلافت آپ کو سونپی گئی تھی۔ دورِ خلافت
میں۔ ایک شب آپ کے پاس مقیم ہوئے۔ ایک معمولی سا چراغ تھا جو روشن تھا، چراغ
بجھنے لگا تو رجاء اٹھے کہ چراغ درست کر دیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے قسم دی کہ رہنے دیں،
بڑے تکلف کی بات ہے، رجاء بیٹھ گئے، خلیفۃ المسلمین خود اٹھے اور چراغ درست فرما دیا۔ خواہ جہاں سے
تبدیلی دور کی سے بادشاہانِ مملکت کی شوکت و عظمت جس طرح روز بروز بڑھتی چلی گئی تھی اس
کے تحت حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل تعجب و باعث حیرت تھا، رجاء نے عرض کیا
آپ امیر المومنین ہونے کے باوجود چراغ درست کرنے کا کام کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا
میں جب اٹھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور جب واپس آیا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہی تھا!!

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے امیر المومنین ہونے کے بعد بھی اس کو یاد رکھا کہ وہ "امیر
المومنین" بعد میں ہیں، "عمر بن عبدالعزیز" پہلے۔ اگر انہوں نے عمر بن عبدالعزیز ہونے کی
حیثیت کو بھلا دیا ہوتا تو ان کے لئے چراغ بجھانے کے لئے اٹھنا اور خود اپنی ضرورت پوری کرنا
دشوار ہوتا، لیکن ماضی کی یاد دہانی نے ان کی زندگی کو ایک سادہ اور بے تکلف، متواضع انسان
کی زندگی بنا دیا تھا، یہ ایک ضروری وصف ہے جس کی قدم قدم پر ضرورت ہے، رشتہ داروں سے
رشتہ باقی رکھنے کے لئے، دوستوں سے محبت کی فضا قائم رکھنے کے لئے، اپنے ماتحت کام
کرنے والے معزز دوستوں اور ملازمین کا دل جیتنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ خدا
کے یہاں اس کا شمار تکبر کرنے والوں میں نہ ہو۔ ۱۰ اپریل ۱۹۹۹ء

سالِ نو ساعتِ سرمستی یا وقتِ احتساب؟

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو بہت سی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان میں ایک اہم ترین نعمت "وقت" ہے۔ وقت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وقت کی قسم کھائی ہے، اور ایک مستقل سورت "والعصر" کے نام سے نازل ہوئی ہے۔ "عصر" کے معنی ہی زمانہ و وقت کے ہیں۔ پھر دن و رات کے مختلف مواقع ہیں جن کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے دن، رات، صبح، سورج نکلنے کا وقت، وغیرہ، چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے رات کی (اللیل ۱)، دن کی (النہار ۲)، صبح کی (التکویر ۱۸)، اور سورج چڑھتے ہوئے دن کے وقت کی (الضحیٰ: ۱) قسمیں کھائی ہیں، قرآن میں جب کسی چیز کی قسم کھائی جائے تو اس سے اس چیز کی اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس طرح قرآن مجید نے بار بار وقت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پھر غور کیجئے کہ اکثر عبادتیں وقت ہی سے متعلق ہیں، نماز پنجگانہ جو افضل ترین عبادت ہے اس کا ادا و قضا ہونا، درست و نادرست ہونا اور مستحب و مکروہ ہونا وقت کے ساتھ مربوط ہے، روزہ کی ابتدا و انتہاء وقت سے اس درجہ متعلق ہے کہ اس میں دو چار منٹ کی بھی کمی زیادتی نہیں ہو سکتی، یہی حال دوسری عبادتوں کا بھی ہے۔

وقت کی اہمیت کیوں نہ ہو، کیوں کہ انسان کی نیکیاں اور برائیاں اور ثواب و عذاب سب کا تعلق وقت کے صحیح اور غلط استعمال سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن جب تک لوگ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیں گے ان کو آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہیں ہوگی، ایک یہ کہ انہوں نے اپنی عمر کس کام میں بسر کی، عمر،

فیما افناه، دوسرے اپنی جوانی کس کام میں صرف کی: عن شبابه فیما ابلاه، تیسرے مال کس ذریعے سے کمایا اور چوتھے کس راہ میں خرچ کیا؟ اور پانچویں یہ کہ اس نے جو کچھ سیکھا اس پر کتنا عمل کیا؟ (ترمذی ۲۴۱۷) اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا سوال اصل میں وقت ہی کے حساب وکتاب سے متعلق ہے، اور دنیا میں تو ہر شخص دن و رات اس کا تجربہ کرتا رہتا ہے کہ وقت کی ناقدری انسان کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہے، اور وقت کی قدردانی اسے کس قدر نیک نام و باعزت کرتی ہے، اسی لئے اردو کے ایک شاعر نے خوب کہا ہے:

لمحہ گذر گیا تو سمجھئے صدی گئی

اب چند دنوں میں ۲۰۰۳ء کا آغاز ہونے والا ہے، ۳۱ دسمبر کے بعد آنے والی رات کو جوں ہی گھڑی کا کانٹا ۱۲ بجے کو پہنچے گا تو یہ صرف A.M اور P.M ہی کی تبدیلی نہیں ہوگی، بلکہ یہ ایک سال کی تبدیلی ہوگی، اور ایک نئے کیلنڈر کا وجود میں آئے گا، نیا سال دراصل ہمیں دو باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، ماضی کا احتساب، اور آئندہ کا پروگرام، انسان کے لئے اپنے آپ کا محاسبہ ضروری ہے، یہ محاسبہ ہر پہلو سے ہونا چاہئے، محاسبہ دنیوی امور میں بھی ضروری ہے، اگر آپ تاجر ہیں تو اپنی تجارت کا جائزہ لیں کہ اس میں آپ نے کیا کچھ ترقی کی ہے؟ اگر نہیں کی ہے یا پیچھے ہٹے ہیں تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ کہیں اس میں آپ کی کوتاہی کو تو دخل نہیں ہے؟ اگر آپ کسی سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں ملازم ہوں تو غور کریں کہ آپ اس میں جو بہتر پوزیشن حاصل کر سکتے تھے یا اپنی ایمانداری اور بہتر کارکردگی کے ذریعہ جو اعتماد آپ کا پیدا ہو سکتا تھا، آپ نے کس حد تک اسے حاصل کیا ہے؟ اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں ہمیں اپنی کامیابی و ناکامی اور پیش قدمی و پست رفتاری کا جائزہ لینا چاہئے۔

انسان کا کسی چیز میں پیچھے ہو جانا بری بات نہیں، بری بات یہ ہے کہ انسان بے حسی میں مبتلا ہو جائے، وہ ناکام ہو اور اپنی ناکامی کے اسباب پر غور نہ کرے۔ اس کے قدم پیچھے ہٹیں، اور فکرمندی کی کوئی چنگاری اس کے دل و دماغ میں سلگنے نہ پائے، وہ ٹھوکر کھائے لیکن ٹھوکر اس کے لئے مہمیز نہ بنے، جو شخص اپنے نقصان کا جائزہ لیتا ہے، اپنی

کتاب زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو محسوس کرتا ہے، وہی ترقی کرتا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے، جس میں اپنے احتساب اور اپنی کمزوریوں کے اعتراف کی صلاحیت ہی نہ ہو، وہ کبھی اپنی منزل کو نہیں پا سکتا۔

جیسے دنیوی اعتبار سے اپنا احتساب ضروری ہے، اسی طرح دین، اخلاق اور اعمال و کردار کے اعتبار سے بھی احتساب ضروری ہے، اپنی عبادات پر نگاہ دوڑائیں کہ یہ مقابلہ گذشتہ سال کے اس سال اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اپنے معاملات کو دیکھیں کہ حلال و حرام اور مستحبات و مکروہات کے جو احکام شریعت میں ہیں، ان میں ہم سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے، خاص کر اپنے اخلاق و سلوک کا جائزہ لینا چاہئے، والدین کے ساتھ، شوہر و بیوی کے ساتھ، اولاد کے ساتھ، رشتہ داروں اور خاص کر غریب رشتہ داروں کے ساتھ، خاندان کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ، مسلمان اور غیر مسلم پڑوسیوں اور کاروبار و ملازمت کے رفقاء کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہے؟ ہم ان کے لئے پھول ہیں یا کانٹے؟ وہ ہم سے راحت و سکون محسوس کرتے ہیں یا خوف و دہشت؟ ہم نے انہیں محبت کی سوغات دی ہے یا نفرت و عداوت کا تحفہ؟ غرض ہمیں اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کا جائزہ لینا چاہئے اور خود اپنا حساب کرنا چاہئے کیوں کہ انسان دوسرے انسانوں کی نگاہ سے اپنی کوتاہیوں کو چھپا سکتا ہے، لیکن اپنے آپ سے نہیں چھپا سکتا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے، خود اپنا حساب کرو: حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔

(کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۴۲۰۳)

پھر اس احتساب، آپ اپنے جائزہ اور خود حسابی کی روشنی میں آئندہ سال کا نظام بنانا چاہئے، کیا بہتر کام اس نے کئے ہیں، جسے برقرار رکھے ہیں؟ ان بہتر کاموں میں معیار یا مقدار کے لحاظ سے کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ اور سے اس میں فلاں حد تک اضافہ کرنا ہے، کیا کوتاہیاں اور کمزوریاں ہیں، جنہیں وہ اس سال دور کرے گا، اور اگر وہ مکمل طور پر انہیں دور نہیں کر سکتا تو اسے کم کرے گا، دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا، تعلیم کا

معاملہ ہو یا جز منزل کا، تجارت کی ہو، ملازمت میں، سماجی تعلقات کی بات ہو یا ملکی معاملات ہوں، ہر جگہ یہ پلاننگ اور پروگرام سازی ضروری ہے، اور یہیں سے ان کی ترقی و کامیابی متعلق ہے

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم

پل پہ پل، لمحہ لمحہ، دم بہ دم

لوگ سالِ نو کی خوشیاں مناتے ہیں، لیکن غور کیجئے تو یہ موقع خوشی سے زیادہ غم کا ہے، یہ ساعت جشن و مسرت نہیں، بلکہ لمحۂ عبرت و موعظت ہے، کیوں کہ سال کے گذرنے سے عمر بڑھتی نہیں ہے، بلکہ عرصۂ حیات تنگ ہوتا جاتا ہے، اور مقررہ عمر گھٹتی جاتی ہے، اس لئے سالِ نو کی آمد غفلت شعار طبیعتوں کے لئے صور پھونکا اور سونے والوں کے لئے بیداری کا الارم ہے، نہ کہ سرمستی و عیش کوشی کا پیغام، یہ وقت ہے کہ ایک مومن کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم ہو کہ تو نے میرے بہت سے ہم عمروں کو اٹھا لیا، اور مجھے اپنی مہلت سے سرفراز کیا ہے، اس لئے تیرے دربار میں شکر و امتنان کے جذبات پیش کرتا ہوں، یہ وقت ہے کہ خدا کے حضور التجا و الحاح کے ہاتھ پھیلائیں، کہ خدایا میرے مستقبل کو میری ماضی سے بہتر فرما، میری نامرادیوں کو کامیابیوں سے اور میری تنگ دستیوں کو بلندیوں سے بدل دے، خاص کر مسلمان اس وقت پورے عالم میں خدا سے غفلت شعاری اور دنیا اور متاعِ دنیا کی محبت کی جو سزا پا رہے ہیں، اس پس منظر میں پوری امت کو عالمِ اسلام اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کی دعا کرنی چاہئے۔

لیکن افسوس اور ہزار بار افسوس! کہ عبرت پذیری اور موعظت پذیری کی اس ساعت کو بھی ہم نے عیش کوشی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کی ساعت بنا لیا ہے، اس موقع سے رقص و سرود کی محفلیں سجائی جاتی ہیں، تفریح گاہوں اور پارکوں میں کھلے عام بے حیائی کے منظر دیکھے جاتے ہیں، اور جن بے ہودہ حرکات و سکنات کے لئے کبھی اہلِ مشرق اہلِ مغرب کو شرم دلاتے تھے، اب خود مشرق اس بے حیائی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کو مضطرب ہے، کیا کسی شریف انسان کے لئے اس طرح کھلے عام بادہ و ساقی

سے ہم رنگی و تشبہ روا رکھا جا رہا ہے؟ اور کیا مسلمانوں کے لئے اس خود فراموشی اور غفلت کوشی کا کوئی موقع ہے؟ جس قوم کا قبلۂ اوّل اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہو، عالمِ اسلام کے قلب و جگر تک دشمن کی رسائی ہو چکی ہو، جس کی عبادت گاہ بابری مسجد دن دہاڑے زمین بوس کر دی گئی ہو، جس کا بدلہ گجرات کے بچے بچے سے لیا جا رہا ہو، جیسے مسلم سرزمین کشمیر اتنی مظلوم اور ستم رسیدہ ہو اور ذلت و نکبت کی سرحدوں پر کھڑی امت کے لئے خوشی کے شادیانے بجانے اور عیش و نشاط کے تماشے سجانے کا بھی کوئی موقع ہے؟" فاعتبروا یا اولی الابصار!

لمحہ گذر گیا تو سمجھئے صدی گئی

دسمبر ۲۰۰۰ء گذرنے کو ہے، اور اکیسویں صدی اب وقت کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے، یہ سال اس اعتبار سے اہم ہے کہ ۳۱ دسمبر کو سال بھی مکمل ہو رہا ہے، بیسویں صدی بھی، اور دوسرا ہزار سال بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ رہا ہے۔ آنے والی یکم جنوری کی تاریخ نہ صرف نئے سال کی مژدہ لائے گی، بلکہ نئی صدی اور نئے ہزار سالہ کا نقطۂ آغاز بھی ہوگی، یہ وقت افراد و اشخاص کے لئے بھی اداروں اور تنظیموں کے لئے بھی اور جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی اپنے احتساب کا وقت ہے، کہ انھوں نے اس عرصہ میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اور وقت کی صورت میں جو عظیم نعمت اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اس کا کس طور استعمال کیا ہے؟ جو قوم خود اپنا محاسبہ نہیں کر سکتی، اور جو جماعت اپنے گریبان آپ جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، دوسرے ان کے گریبان جھانکتے ہیں، اور خیر و شر کا حساب کر کے اس کا بدلہ چکاتے ہیں، لمحوں کی ناقدری سے بعض اوقات صدیوں کا نقصان ہوتا ہے، اور قومیں زوال و انحطاط کے دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بہت سی نعمتیں اس کائنات میں دی ہیں، ان میں ایک بہت بڑی نعمت وقت ہے، انسان سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، اس کے اوقات بڑھ رہے ہیں، لیکن درحقیقت عمر گھٹتی جاتی ہے اور ہر لمحہ وقت کی متاعِ گراں مایہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
چپکے چپکے، لمحہ لمحہ، دم بہ دم

وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں

کتنے ہی مقامات پر وقت کی قسم کھائی ہے، کبھی رات اور صبح کی قسم کھائی گئی، (اللیل: ۱، ۲، مدثر ۳۳، ۳۴، تکویر: ۱۷، ۱۸) کبھی رات کے ساتھ شفق کی قسم کھائی گئی، (انشقاق: ۱۶، ۱۷) کبھی فجر اور اس کے ساتھ دس راتوں کی (الفجر: ۱، ۲) کبھی دن کی روشنی اور رات کے چھا جانے کی (الضحیٰ: ۱، ۲) اور کبھی خود زمانہ کی، (العصر: ۱) دونوں کی آمد و رفت اور سورج و چاند کے طلوع و غروب سے اوقات کا علم ہوتا ہے، قرآن مجید نے جا بجا اللہ کی نعمت کی حیثیت سے اُن کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے اس کی عمر کے بارے میں بھی سوال فرمائیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی، جس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگ نصیحت حاصل کر سکیں، اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ من تذکر (الفاطر: ۳۷) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی سے اس بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں گذاری، اور اپنی جوانی کو کس مقصد میں صرف کیا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں، صحت اور فراغت وقت۔

سلف صالحین جنہوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کئے ہیں، اپنے وقت کے ایک ایک لمحہ کو وصول کرتے تھے، اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارا نہیں تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے، امام ابو یوسفؒ (۱۱۳-۱۸۲ھ) اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ ہیں، ان کے بارے میں اہل تذکرہ نے ابراہیم بن جراح سے نقل کیا ہے، کہ وہ مرض وفات میں امام صاحب کی عیادت کے لئے پہنچے، آپ پر بے ہوشی طاری تھی، ابراہیم بیٹھے رہے، کچھ دیر میں ہوش آیا، امام صاحب نے پوچھا کہ حج میں جمرات کی رمی پیدل کرنا افضل ہے یا سواری پر؟ ابراہیم نے استاد سے عرض کیا کہ اس حال میں بھی آپ فکر و تحقیق کو نہیں چھوڑتے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، ابراہیم نے کہا سوار ہو کر رمی کرنا افضل ہے، امام ابو یوسفؒ نے کہا یہ غلط ہے، ابراہیم نے کہا پھر پیدل رمی کرنا افضل ہوگا، فرمایا یہ بھی غلط، ابراہیم نے عرض کیا کہ جو درست صحیح ہو، اسے آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: جس رمی کے بعد کوئی اور رمی ہو، اس کو پیدل کرنا افضل ہے، اور جس

کے بعد کوئی اور دن نہ ہو، اسے سوار ہو کر ابراہیم وہاں سے اٹھے، اور امام صاحب کے گھر کے دروازے ہی پر پہنچے تھے کہ اہل خانہ کے رونے کی آواز آئی، پہلے تو معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہی امام ابو یوسفؒ ہیں جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سترہ سال تک اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں اس طرح شرکت کی کہ کبھی فجر کی نماز فوت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بھی، بلکہ صاحبزادے کا انتقال ہو گیا تو تجہیز و تکفین کا انتظام اپنے اعزہ اور پڑوسیوں کو حوالے کر کے درس میں شریک رہے، اور درس سے محرومی کو گوارا نہیں کیا (مناقب مکی: ۲/۲۷۲)

ایک بڑے محدث عبید بن یعیشؒ گذرے ہیں جو امام بخاری اور امام مسلم کے اساتذہ میں ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ تیس سال تک رات میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھایا، بلکہ خود حدیث لکھنے میں مصروف رہتے، اور بہن منہ میں لقمہ دیتی جاتی (سیر اعلام النبلاء ۱۱/۴۵۸) احمد بن یحییٰ شیبانی (۲۰۰ - ۲۹۱ھ) عربی لغت، ادب، گرامر اور قراءت وغیرہ کے بڑے نامی گرامی آدمی تھے، اور ثعلب کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ اگر دعوت دی جاتی تو داعی سے فرماتے کہ کھانے کے وقت ان کے لئے چمڑے کے تکیہ کی مقدار جگہ خالی رکھی جائے، جس میں وہ کتاب رکھ کر مطالعہ کریں (الحث علی طلب العلم ابو ہلال عسکری ۷۰) امام ثعلب کا معمول تھا کہ راستہ چلتے بھی ہاتھ میں کتاب رہتی، اور مطالعہ کرتے جاتے، چنانچہ اسی طرح چل رہے تھے کہ گھوڑے نے ٹکر دی، گڑھے میں گر پڑے اور ایسی چوٹ آئی کہ دوسرے ہی دن وفات ہو گئی۔

(وفیات الاعیان لابن خلکان ۱/۱۰۲)

اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اہل علم نے اتنا عظیم تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے کہ ان کو اور پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور آج ان کتابوں کو ایک شخص کا پڑھ لینا بھی دشوار ہے، امام ابن جریر طبری بہت ہی بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، انہوں نے اپنی عظیم الشان تفسیر ۳۰ جزء اوراق کی ۲۸۳ھ تا ۲۹۰ھ یعنی صرف سات سال کے عرصہ میں مکمل کی، پھر ایک تفصیلی تاریخ لکھنی شروع کی، جس سے ۳۰۳ھ میں فارغ ہوئے، یہ

دونوں کتابیں تین تین ہزار گویا ۶ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں طبری کی یہ تفسیر ۳۰ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آچکی ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری کی تصنیفات کا حساب لگایا جائے تو یومیہ ۱۴ اوراق یعنی ۲۸ صفحات کا اوسط ہوتا ہے۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو روشنائی خریدی، اس کا حساب کیا گیا تو وہ سات سو درہم کی تھی، ابوریحان بیرونی کی وفات کے وقت اس زمانہ کے مشہور فقیہ ابوالحسن ولوالجی گئے، بیرونی نزع کی حالت میں تھے، اور سینے میں گھٹن محسوس کر رہے تھے، اس وقت علامہ ولوالجی سے "جدات فاسدہ" نانی کے حق میراث کا مسئلہ پوچھا، ولوالجی کو رحم آیا اور کہنے لگے کہ اس وقت بھی آپ کو یہ فکر پڑی ہے؟ بیرونی نے کہا کہ دنیا سے اس مسئلے سے واقف ہو کر جانا بہتر ہے یا ناواقف ہو کر؟ ولوالجی نے مسئلہ کی وضاحت کر دی اور واپس ہوئے، ابھی کچھ ہی دور آئے تھے کہ رونے دھونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ علامہ بیرونی کا انتقال ہو گیا ہے۔

وقت کی حفاظت کرنے والے بزرگوں میں علامہ ابن عقیل بھی ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی سب سے اہم کتاب "الفنون" ہے، جس کے بارے میں بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی ۸ سو جلدیں تھیں، اس کا کچھ حصہ ڈاکٹر جارج مقدسی مستشرق نے دو جلدوں میں ۱۹۷۰۔۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے، امام ابن جوزی تاریخ اسلام کے بڑے مصنفین میں ہیں، وہ ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، جو چاہتے کہ ان کے پاس ملاقاتیوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ لگی رہے، خود بھی بے مقصد آنے والے سے بہت نالاں رہتے، اور مجبوراً جن لوگوں سے ملاقات کرنی ہوتی، ان سے ملاقات کے اوقات کو اسی طرح استعمال فرماتے کہ اس وقت حسب ضرورت کاغذ کاٹے جاتے، قلم تراش لیتے، اور لکھے ہوئے اوراق باندھ لیتے، اس کا نتیجہ تھا کہ بقول حافظ ابن رجب شاید ہی کوئی فن ہو، جس میں ابن جوزی کی کوئی کتاب نہ ہو، ابن جوزی کی تصنیفات پانچ سو سے اوپر ہیں، اور ان میں سے بعض بیس جلدوں اور بعض ۱۰ جلدوں پر مشتمل ہیں، ابن جوزی کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے جن قلموں سے حدیثیں تحریر کی تھیں، ان کے ڈھیر

سارے تراشے جمع ہو گئے تھے، انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرے غسل کا پانی انہی تراشوں سے گرم کیا جائے، چنانچہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی قلم کے تراشے بچے رہے۔

مشہور مفسر اور صاحبِ تفسیر امام رازی کھانے کے وقت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے کہ اس وقت علمی مشغلہ فوت ہو جاتا ہے۔ مشہور محدث علامہ منذری کے صاحبزادے رشید الدین (۶۴۳ھ) کا انتقال ہو گیا، جوان اور بہت محبوب تھے، تو اپنے جوان مرد بیٹے کی نماز جنازہ خود پڑھائی، مدرسے کے دروازے تک جنازے کے ساتھ خود چلے اور وہاں سے اللہ کے حوالے کر کے اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ امام طحاوی جیسا محدث اور صاحبِ علم سے کون ناواقف ہو گا، دوات چھینتے ہوئے بھی علمی مذاکرہ میں اپنا وقت گذارتے، اس کا نتیجہ ہے کہ صرف ۵۷ سال کی عمر پائی، لیکن ہزار ہا ہزار صفحات ان کے قلم سے آج بھی محفوظ ہیں، جو اہل علم کے لئے حرز جان ہیں۔

ابن النفیس میڈیکل سائنس کی یادگار شخصیتوں میں ہیں، جسم میں دورانِ خون کا نظام سب سے پہلے آپ ہی نے دریافت کیا، طب میں آپ کی کتاب "الشامل" تقریباً ۳۰۰ جلدوں میں ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا حال یہ تھا کہ سفر و حضر اور صحت و بیماری کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے، ان کے شاگرد ابن قیم نے ان کی تصنیفات کی تعداد پانچ سو بیان کیا ہے، وہ خود ۲۲۰ صفحات کا ہے۔ ذخیرہ در ذخیرہ کے اس علم میں علامہ شوکانی کا حال یہ تھا کہ روزانہ دس اسباق پڑھاتے، فتاویٰ بھی لکھتے، فریضۂ قضاء بھی انجام دیتے، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سو چودہ تصنیفات آپ کی یادگار ہیں۔ علامہ شہاب الدین آلوسی (۱۲۱۷ھ - ۱۲۷۰ھ) کا حال یہ تھا کہ روزانہ چودہ اسباق پڑھاتے، افتاء کا کام بھی کرتے، اور اس کے ساتھ انہوں نے روح المعانی کے نام سے ایسی عظیم الشان اور مبسوط تفسیر لکھی ہے کہ جس کی پوری علمی دنیا نے داد دی ہے۔

ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے صرف ۳۹ سال کی عمر پائی۔ لیکن ان کی تصنیف ۱۱۰ سے بھی زیادہ ہیں، اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرفِ آخر

ہے، مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ہزار کے قریب ہے، مولانا عبدالحئی حسنی نے اشتغال لا طائل سیف الہند مولانا حبیب الرحمان شیروانی نے علاوہ معروف اور مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی نہایت اہم اور قابلِ قدر تصنیف "قیمۃ الزمن عند العلماء" میں سلف صالحین کے ایسے کتنے ہی واقعات ملتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب وقت کی قدر جاننے اور اس کی قیمت پہچاننے کا نتیجہ ہے، جو لوگ وقت کو سستی اور بے قیمت شئی سمجھتے ہیں اور اس کی قدر دانی نہیں کرتے، وہ زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے، اسلام نے وقت کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے تمام عبادات کو وقت سے جوڑ رکھا ہے، نمازوں کے اوقات مقرر ہیں، روزہ متعین وقت سے شروع ہوتا ہے اور متعین وقت پر ختم ہوتا ہے، حج کے افعال بھی متعین ایام و اوقات میں انجام دیئے جاتے ہیں، قربانی بھی متعین دنوں میں ہوتی ہے، زکوٰۃ میں بھی مال پر ایک سال گذرنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے، اور شریعت میں کتنے ہی احکام ہیں، جو وقت سے مربوط ہیں، لیکن افسوس کہ یہ امت اپنے وقت کو جس قدر ضائع کرتی ہے اور اس کو جتنا بے قیمت سمجھتی ہے، شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، مسلمان نوجوانوں کی یہ بازی، ہوٹل بازی اور بے مقصد سیر و تفریح ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، بلکہ ضرب المثل بنتی جارہی ہے، شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ اوقات ضائع کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دینی جلسوں اور اجتماعات میں بھی اوقات کی پابندی کے معاملہ میں جو بے احتیاطی روا رکھی جاتی ہے، وہ کس قدر افسوسناک ہے!

آیئے! نئی صدی اور نئے ہزار سالہ کا استقبال کرتے ہوئے ہم عزم مصمم کریں کہ وقت کی پوری قدردانی کریں گے، اور اپنے ایک ایک لمحہ کو ضائع ہونے سے بچائیں گے، اگر ہم سب اس کا عزم کرلیں اور اپنے آپ کو اس پر قائم رکھیں تو کون ہے جو اس امت مرحومہ کی سربلندی کو روک سکے؟؟

تہذیبی ارتداد

ایمان کچھ حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے، جن میں سب سے اہم اللہ پر، رسول پر، اللہ کی کتاب پر اور آخرت پر ایمان لانا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے صرف ایمانیات ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ عبادات، معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں نبوی ہدایات سے سرفراز فرمایا اور پوری قوت اور تاکید کے ساتھ امت مسلمہ کو ان تعلیمات پر کاربند رہنے کی تلقین فرمائی، کیوں کہ کسی قوم کے لئے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا صرف عقیدہ کے ذریعہ ممکن نہیں، بلکہ تہذیب و معاشرت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، ہندوستان میں کتنی ہی قومیں آئیں جو آج ہندوستان کا حصہ بن چکی ہیں، وہ اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے اپنا الگ وجود رکھتی ہیں، لیکن انہوں نے دوسری قوموں سے سماجی اور تہذیبی فاصلہ قائم نہیں رکھا، رہن سہن، لباس و پوشاک، خورد و نوش، شادی بیاہ، خوشی اور غم کی تقریبات وغیرہ میں انہوں نے اپنا رنگ برقرار نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا تشخص کھو دیا اور آج ہندوستان ان کو اپنا ایک عضو تصور کرتا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے تہذیبی تشخص سے محروم کر دیا جائے، کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیبی انفرادیت سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ آہستہ آہستہ دین و مذہب ہی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے، اور اگر وہ کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل نہ ہو، تب بھی الحاد و انکار کا راستہ اختیار کر لیتی ہے، یا کم سے کم وہ مذہب کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر لیتی ہے، غیر سنجیدہ رویہ سے مراد یہ ہے کہ مذہب سے اس کی کوئی ذہنی اور فکری وابستگی نہیں ہوتی، البتہ وہ اسے ایک خاندانی روایت سمجھ کر نبھاتی رہتی ہے، تہذیبی اقدار پر اس کا کوئی یقین نہیں ہوتا، البتہ

خاندانی روایت کے تحت خاص خاص مذہبی تقریبات اور تہواروں میں اس کی شرکت ہو جاتی ہے، اور کبھی کبھی کچھ عبادات کی توفیق میسر آجاتی ہے، لیکن حلال و حرام، معاملات، کسب معاش اور سماجی زندگی میں مذہب کے لئے کوئی خانہ نہیں ہوتا، اس کیفیت کو میں نے "تہذیبی ارتداد" سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ارتداد دبے پاؤں آتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر داخل ہوتا ہے، اور ایسے میٹھا زہر بن کر حلق سے اترتا ہے کہ زہر کھا کر بھی انسان تحسین و آفریں کے کلمات کہہ اٹھتا ہے، یہ ارتداد نہ سوتے ہوؤں کو جگاتا ہے، نہ غافلوں کو متوجہ کرتا ہے، نہ فکرمند دلوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے، نہ قلب و ذہن کو جھنجھوڑتا ہے، اور نہ اس کی وجہ سے سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، یہ ایسی بیماری کی طرح ہے، جو بظاہر ہلکی ہو، لیکن بتدریج انسان کو موت کی طرف لے جائے، اور یہ ایسا نشہ ہے کہ متوالا خودکشی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس لئے اس ارتداد کو خوب سمجھنے، اس کے اسباب پر نظر رکھنے اور اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت پوری دنیا جو بنیادی طور پر یہودی دماغ اور یہودی منصوبہ بندی کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے، اور اس کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقصاں ہے، اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ اگر مسلمانوں کو کھلے عام مرتد نہیں کیا جا سکتا، تو ان پر ایسی زبردست تہذیبی یلغار کر دی جائے کہ وہ خوشی خوشی تہذیبی ارتداد کو قبول کر لیں، اور اس مقصد کے لئے اتنے طاقتور حربے استعمال کئے جا رہے ہیں کہ بظاہر اس سے زیادہ دوررس اور قوی و مؤثر کوئی اور ذریعہ نہیں، ٹی وی نے اس رفتار کو بہت تیز کر دیا ہے، اور اسی کی وجہ سے مسلمان اور مشرقی علاقوں میں ایسے فحش پروگرام کا ایک طوفان سا آگیا ہے کہ جن کا اسلام اور مشرقی سماج میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اب انٹرنیٹ نے اس تہذیبی یلغار کو مزید طاقتور بنا دیا ہے، اور ایک ایسی چیز جو بہتر سے بہتر تعمیری اور تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکتی تھی، دونوں چیزیں انتہائی تخریبی اور غیر اخلاقی مہم جوئی کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں، اب جو نئی معاشی اصلاحات کا عمل پوری دنیا میں جاری ہے، وہ "عالمیانے"

کی نئی اصطلاحات شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی صحافت، مغربی لٹریچر، اور مغربی کمپنیوں کے وساطت سے مغرب، خلاق غذائی اور غیر غذائی اشیاء کی آمد کا ایک سیل بلا جاری وساری ہے۔

اس وقت اس منصوبے کے نقوش مشرقی ملکوں میں اور مسلم ملکوں میں نہایت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، ادھر چند سالوں میں عرب اور اسلامی ممالک میں خواتین کے لباس اس قدر تبدیل ہوگئے ہیں کہ امریکی ویورپی ملبوسات اور عرب خواتین کے ملبوسات میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، بہت سے عرب اور مسلم ممالک وہ ہیں جہاں عوام تو کیا؟ علماء بھی داڑھی نہیں رکھتے، داڑھی جسے کسی زمانہ میں صلاح وتقویٰ اور شرافت و سعادت کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب دہشت گردی اور شدت پسندی کی پہچان سمجھی جاتی ہے، مجھے ایک بار حج کے موقع سے مکہ مکرمہ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جس کے استقبالیہ پر ایک دیندار، خوش شکل، مصری نوجوان لڑکا بیٹھا کرتا تھا، اور اس کے چہرے پر داڑھی بہت بھلی محسوس ہوتی تھی، میں اکثر عشاء کے بعد مسجد سے واپس ہوتے ہوئے دو چار منٹ اس کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی مذہب پر، کبھی عربی زبان کے بارے میں، اور کبھی مصر میں مسلمانوں کے حالات کے متعلق اس سے گفتگو ہوتی، وہ بہت برجستہ اور بہت ہی بلیغ اور سہل عربی زبان میں گفتگو کرتا، اور بہت ہی اخلاق ومروت سے پیش آتا، اس لئے اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے لطف سا آتا تھا، میں نے ایک دن کہا کہ مصر کے لوگ اکثر داڑھی نہیں رکھتے، لیکن تم نے جو یہ داڑھی رکھی ہے، یہ بہت اچھی بات ہے، اس سے تمہارے چہرے پر ایک نورانیت اور معصومیت سی معلوم ہوتی ہے، میری یہ بات سن کر وہ افسردہ سا ہوگیا، اور اس نے سنجیدہ ہوکر کہا کہ شیخ آپ سچ کہتے ہیں، میں داڑھی رکھنا چاہتا ہوں، لیکن مصر میں داڑھی رکھنے میں بڑی مشکلات ہیں، ہمارے یہاں داڑھی رکھنے والوں کو باضابطہ اپنا رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے، مجھے جب پہلی بار داڑھی رکھ کر اپنے وطن گیا تو مجھے سات آٹھ گھنٹے ایئرپورٹ پر تفتیش کے لئے روک لیا گیا، اور میرے پورے اہل خاندان کو طلب کیا گیا، جن میں میری ماں اور بہنیں بھی تھیں، اور ان سے بھی کافی دیر تک تفتیش کی گئی،

اس کے بعد سے مجبوراً میں مصر جاتے ہوئے اپنی داڑھی صاف کرالیتا ہوں، اور واپسی کے بعد پھر داڑھی رکھ لیتا ہوں ـــــ غور کیجئے! کیا غضب ہے کہ ایک مسلمان ملک میں مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت نہ ہو، کاش یہ اسرائیل ہی سے سبق حاصل کرتے جہاں یہودی مذہبی طبقے کے داڑھی رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جب مسلمان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ حال ہے تو ان مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے، جو مغربی ثقافت کی آغوش میں محوِ غفلت ہیں، اور اسے دنیا ہی میں جنت تصور کرتے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغربی ممالک نے عرب اور اسلامی ممالک اور مختلف علاقوں میں بسنے والے تارکین وطن مسلمانوں کے لئے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنا دامن دل کھول رکھا ہے، انھیں شہریت دی جاتی ہے، انھیں ملازمت اور مزدوری کے مواقع ملتے ہیں، اور انھیں اپنے ملکوں سے بڑھ کر شہری حقوق دیے جاتے ہیں، تارکین وطن خوش ہیں کہ انھیں پھلنے، پھولنے اور آگے بڑھنے کے بھرپور مواقع ہاتھ آرہے ہیں، لیکن انھیں نہیں معلوم کہ وہ ان ممالک کے ہاتھوں اپنی اگلی نسلوں کا سودا کررہے ہیں، چنانچہ لاکھوں عرب اور فلسطینی جو پچاس سال پہلے امریکہ گئے، اب ان میں اپنے مسلمان ہونے کی پہچان بھی باقی نہیں رہی، مذہبی شعور رخصت ہوا، رہن سہن بدل گیا، زندگی کے طور طریق تبدیل ہوگئے، یہاں تک کہ ان کے نام میں بھی مسلمانیت کی کوئی بو باقی نہیں رہ گئی ہے، حالانکہ ان کے آباء واجداد راسخ العقیدہ مسلمان اور عرب تہذیب کے علمبردار بن کر یہاں آئے تھے، اگر آج ان گذری ہوئی روحوں کو دوسری زندگی دے دی جائے تو شاید ہی وہ خود اپنی نسل اور اپنی اولاد کو پہچان سکیں، یہ ہے اس تہذیبی ارتداد کا اثر، جو بتدریج افراد و اقوام کو فطری اور اعتقادی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے!

اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اور مماثلت اختیار کی، وہ ان ہی میں سے ہوگیا، اس روایت کو امام ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور امام طبرانی نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور علامہ سیوطی نے اس حدیث کو "حسن" یعنی مقبول قرار دیا ہے، (الجامع الصغیر، حدیث نمبر:

۹۵۹۳) رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں عقیدہ و ایمان میں غیر مسلموں سے مماثلت مراد نہیں ہے، کیوں کہ جو شخص عقیدہ کے اعتبار سے غیر اسلامی فکر اختیار کر لے، وہ تو پہلے ہی سے مسلمان نہیں ہے، اس کے غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے کے کیا معنی؟ لہٰذا اس حدیث میں عملی اور سماجی زندگی میں غیر مسلموں کے تشبہ سے منع فرمایا گیا ہے، اور مختلف مسائل میں حضور ﷺ کی تصریح و توضیح نے اس تصور کو مزید واضح کیا ہے، مثلاً آپ ﷺ نے سورج نکلتے، سورج ڈوبتے، اور سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ یہی اوقات عام طور پر مشرک اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے رہے ہیں، جو قومیں سورج کی پرستار ہیں، وہ انہی اوقات میں سورج کی پوجا کرتی ہیں، اس لئے ان اوقات میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا۔

روزہ میں حکم دیا گیا کہ افطار جلدی کیا جائے، افطار میں تاخیر نہ کی جائے، کیوں کہ افطار میں تاخیر اہل کتاب کا طریقہ ہے، یوم عاشوراء کے ساتھ مزید ایک روزہ رکھنے کا حکم ہوا، کیوں کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھا کرتے تھے، تاکہ مسلمان اپنی عبادت میں ان سے ممتاز رہیں، حج میں بہت سے ایسے افعال جن کو مشرکین بہت اہمیت دیتے تھے، اسلام نے ان کو ختم کیا، یا ان میں تبدیلی پیدا کی، پھر یہی ہدایات آپ نے وضع قطع اور لباس و پوشاک کے بارے میں بھی دی، مجوسی داڑھی منڈایا کرتے تھے، بعض قومیں داڑھی بڑھایا کرتی تھیں، آپ نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا، اہل ایران اظہار فخر کے لئے ٹخنوں سے نیچے کپڑے پہنتے تھے، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اہل مکہ سر میں مانگ بھی نکالا کرتے تھے، چنانچہ مکی زندگی میں آپ نے سیدھے بال رکھنے کو پسند فرمایا تاکہ مسلمان ان سے ممتاز رہیں، مدینہ میں یہود سیدھے بال رکھتے تھے، تو وہاں آپ نے مانگ نکالنے کو پسند فرمایا، پھر جب تمام عرب نے اسلام قبول کر لیا تو آپ ﷺ نے دونوں طرح بال رکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی، اہل عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے، یا صرف عمامہ باندھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ابتداءً ہدایت دی تھی کہ وہ ٹوپی اور

عمامہ دونوں کا استعمال کریں، تاکہ ان کے اور مشرکین کے درمیان امتیاز باقی رہے، بعد کو جب اہل عرب ایمان لے آئے تو آپ نے صرف ٹوپی یا صرف عمامہ کے استعمال کی بھی اجازت مرحمت فرمائی ۔

دین کا یہ مزاج کہ مسلمانوں کو قومی اعتبار سے دوسری قوموں سے ممتاز اور متشخص رہنا چاہئے، فقہاء نے بھی اپنے اجتہاد و استنباط اور قانون شریعت کی تشریح و توضیح میں ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھا ہے، اور لباس و پوشاک، خورد و نوش، عبادات، یہاں تک کہ عبادت گاہوں کے طرز تعمیر وغیرہ ہر مرحلہ پر ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ مسلمان ایک امتیازی شان کے حامل ہیں، اور وہ اپنے دین و مذہب اور تہذیب و تمدن میں دوسری قوموں سے ممتاز و متشخص رہیں، کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیب سے محروم ہو جاتی ہے، اور تمدن و ثقافت کے میدان میں دریوزہ گری پر اتر آتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے فکر و عقیدہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے ۔

ہندوستان میں اس وقت منظم طور پر دوسری جانب سے اس بات کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان نماز پڑھیں، مسجدوں کو جائیں، عید بقرعید وغیرہ کریں، لیکن اسلامی تہذیب کو خیرباد کہہ دیں، اس کے لئے بظاہر معمولی لیکن نتائج کے اعتبار سے دور رس اقدامات کئے جارہے ہیں، نصاب تعلیم میں تبدیلی لائی جارہی ہے، ہندوازم کو ایک نظریہ و عقیدہ کے بجائے قومی ثقافت کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے، اسکولوں میں دیویوں، دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں، ہندو مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے، اور انہیں شریک کیا جاتا ہے، اور ہمارے مسلمان نوجوان، دیوالی اور ہولی میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہورہے ہیں، مردوں اور عورتوں کے لئے دھوتی نما پائجامے بنائے جارہے ہیں، بہت سے علاقوں میں مسلمان عورتیں ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق سندور لگاتی، یا کالی پوت کے ہار پہنتی ہیں، بین مذہبی شادی بیاہ کا رواج بھی بڑھ رہا ہے، بعض جگہ مسلمان بچوں کے ہندی نام بھی رکھے جارہے ہیں، ٹی وی پروگراموں کا ہندو کرن کیا جارہا ہے اور ہندو دیوتاؤں اور فرمانرواؤں کو قومی ہیرو کے روپ میں پیش کیا

جارہا ہے، اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جو ہمارے زمانہ میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی ہیں، آج ہم ان کے قدموں کی آہٹ سننے سے قاصر ہیں، لیکن اگر ہم نے حالات کو محسوس نہیں کیا تو مستقبل میں اس سے ناقابلِ تلافی نقصان کا اندیشہ ہے، اس لئے اس وقت اس تہذیبی ارتداد کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے، کہ یہ محض سیاسی و اتفاقی مسئلہ نہیں، بلکہ اپنے دور رس اثرات کے اعتبار سے ہمارے ملی بقا اور دینی تحفظ کا مسئلہ ہے!

( )

کیا اس ارتداد کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟

مسلمان اس وقت ہندوستان میں ہر چہار جانب سے نوع بنوع فتنوں میں گھیرے جارہے ہیں، اسلام سے ان کی محبت اور بزرگوں کے بنائے ہوئے اداروں کے باوجود ایمان پر ان کی استقامت فرقہ پرست طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹا بنی ہوئی ہے، جہاں مسلمانوں کی معیشت منصوبہ بند طور پر کمزور کی جارہی ہے، تعلیم کے دروازے محدود کئے جارہے ہیں، مسلم تاریخ پر سیاہی پھیرنے اور مسلمانوں کو قومی سطح پر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش جاری ہے، مسلمانوں کے تاریخی نقوش یا تو مٹائے جارہے ہیں، یا تاریخی حقائق میں تبدیلی عمل میں لائی جارہی ہے، اور مسلمان تہذیب وتمدن کو مشرقی تہذیب میں جذب کرنے کی کوشش جاری ہے، وہیں ایمان وعقیدہ اور دین ومذہب کے پہلو سے بھی ان کو ہدف بنایا جارہا ہے، اور ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جو مسلمانوں کے ایمان ویقین کے سوداگر اور ان کے دین کے غارت گر ہوں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی قادیانیت ہے، جو اپنے آپ کو احمدی مسلمان کہتے ہیں، حالاں کہ ان کا ایمان سے محروم اور دائرۂ اسلام سے باہر ہونا ایک متفق علیہ حقیقت ہے، مرزا غلام احمد قادیانی پنجاب کے ایک شہر قادیان میں پیدا ہوئے، یہ وہ وقت تھا کہ انگریز ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے، اور اہل وطن کا جذبۂ جہاد اپنے شباب پر تھا، انگریز چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی صف سے کچھ ایسے لوگ کھڑے ہوں جو دین ومذہب کا لبادہ اوڑھ کر جذبۂ جہاد کی اس آگ کو بجھائیں اور مسلمانوں کو داخلی انتشار سے دوچار کردیں تاکہ وہ باہمی مسائل ہی میں الجھے رہیں، اور انگریزوں کے خلاف ان کی طاقت ختم باقی نہ رہ سکے، اسی پس منظر میں انگریزوں کی شہ پر مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے

مجدد ہونے کا، پھر امام مہدی ہونے کا اور اس کے بعد مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا، مگر مرزا صاحب کسی عہدہ و منصب پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ ایک زمانہ میں تو خود ہی امکانِ نبوت کی شدومد سے نفی کرتے تھے، لیکن پھر خود ہی نبی ہونے کا دعویٰ بھی پیش کر دیا، اور نبوت ہی کیا؟ مرزا صاحب نے دعوے تو خدا اور مثیلِ خدا تک ہونے کے کئے ہیں، مرزا صاحب کے دعاوی اتنے متضاد اور مختلف ہیں کہ کسی ایسے آدمی سے ان کا صدور کا تصور دشوار ہے جو دماغی اور عقلی طور پر متوازن ہو، مرزا صاحب نے جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان بھی کر دیا اور امت میں انتشار اور بے عملی ان کی قوت کے ضائع ہونے کا سرو سامان بھی کیا۔ اور یقیناً ان کے اس طرزِ عمل نے انگریزوں کو فائدہ پہونچایا، چنانچہ مرزا صاحب نے اپنے آپ کو "حکومت انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا" (برطانیہ کا لگایا ہوا پودا) قرار دیا ہے، حکومت برطانیہ کی مہربانیوں اور ملکہ برطانیہ کی عنایتوں پر مرزا صاحب جس طرح رطب اللسان ہیں، درباری شاعروں کی خوشامد اور تملق بھی اس پر ہزار بار قربان ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے بوئے ہوئے اس پودے کو تناور بنانے میں اپنی طاقت کی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اولاً پاکستان کی نوخیز ریاست اس فتنہ کا ملجا و ماویٰ بنی، جب وہاں سے اس کی بیخ کنی ہوئی تو برطانیہ اور اسرائیل کو اس نے اپنا مرکز بنایا، اس وقت صلیبی اور صہیونی طاقتیں اس کی ناصر و مددگار ہیں، بدقسمتی سے ادھر ہندوستان میں بھی انہوں نے اپنی شر انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کا دامن پھیلا دیا ہے، اور فرقہ پرست طاقتوں سے اپنا گٹھ جوڑ قائم کر لیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ دور دراز دیہاتوں کے جاہل اور ناواقف مسلمان اپنی جہالت اور ناسمجھی کی وجہ سے ان کے جال میں پھنستے جا رہے ہیں۔

اگر کوئی شخص علی الاعلان کفر کی طرف بلائے اور اسلام سے بغاوت کی دعوت دے تو ان شاء اللہ کوئی مسلمان ایسی مذموم دعوت پر لبیک نہیں کہہ سکتا، لیکن جب کوئی فتنہ اسلام کا لباس پہن کر اور دین حق کا روپ بھر کر سامنے آتا ہے تو یقیناً جو لوگ ناواقف ہوتے ہیں اور

ان کا علم سطحی ہوتا ہے وہ اس فتنہ میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں، اور ان کے تحفظ کی ذمہ داری اور فکر پوری امت کی ذمہ داریاں بہت ہیں، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ آندھرا پردیش میں ارنگل، نلگنڈہ، کھمم، وشاکھاپٹنم، سریکاکولم اور دوسرے کریم نگر وغیرہ کے اضلاع کے دور دراز کے دیہات قادیانیت کے مسموم فتنہ سے بری طرح متاثر ہیں، متعدد دیہی علاقے جہاں دین دیہاتی ناخواندہ مسلمان ہیں، جو ان کے دام تزویر میں آچکے ہیں، مالی تحریص، مساجد و مکاتب کے نام سے نام نہاد دعوت کا دوردورہ، مساجد کی تعمیر اور اسلام کے نام پر دھوکہ دہی کے ذریعہ ان مسلمانوں کے ایمان کا سودا کیا جا رہا ہے۔

یہ فتنہ تمام فتنوں سے زیادہ سنگین اور یہ مصیبت تمام مصیبتوں سے سوا ہے، یہ ایک صورت حال ہے جو ہر مسلمان کو تڑپا دے، ہر صاحب ایمان کی کروٹوں کو بے سکون کر دے، اور جس سے سیاست کے ہر درد مندی کی آنکھیں بے خواب ہو جائیں، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب کچھ جھوٹی نبیوں کے فتنوں نے سر اٹھایا اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ ہوا تو اس نے سب کو بے قرار کر دیا، یہ زمانہ حضرت ابوبکر ؓ کی خلافت کا تھا، خود حضرت ابوبکر ؓ کے جوش اور غیرت دینی کا حال یہ تھا کہ ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص ساتھ نہ ہو تو ابوبکر تنہا جہاد کرے گا (؟) یہ بات ضرب المثل بن گئی کہ جب کوئی فتنہ ارتداد اٹھتا اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے والے لوگ نہیں رہتے تو کہا جاتا کہ یہ ایسا فتنہ ارتداد ہے کہ جس کے لئے کوئی ابوبکر موجود نہیں ردۃ ولا ابا بکر لہا — آج بھی بصیرت دین کے کان کھول کر سنیں اور عبرت و موعظت کی نگاہوں سے دیکھیں تو شاید وہ نبوت محمدی ﷺ کو اپنی طرف متوجہ پائیں گے، اور اس صدائے درد کو سن سکیں گے کہ ہائے میری حفاظت کے لئے کوئی ابوبکر موجود نہیں؟؟

ان حالات میں ضرورت ہے کہ مسلمان مسلک و مشرب کے اختلاف سے اوپر اٹھ کر اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مسلمانوں کو اس ایمان لیوا مصیبت سے بچائیں۔ اس سلسلہ میں چند امور جو ذہن میں آتی ہیں وہ ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ مساجد کے خطباء جمعہ کے خطبات و بیانات میں ختمِ نبوت اور قادیانیت کے مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھائیں اور وقتاً فوقتاً بار بار اس کا تذکرہ کریں تاکہ عام مسلمان اس سے آگاہ ہو سکیں۔

۲۔ سیرۃ النبی کے جلسوں میں مقررین حضرات اس موضوع پر بیانات کریں اور عوام کو اس کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ کریں۔

۳۔ رسائل و جرائد اور اخبارات میں بار بار اس موضوع پر مضامین شائع کئے جائیں، اردو زبان کے علاوہ انگریزی، ہندی اور دیگر رسائل میں بھی اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دی جائے۔

۴۔ جو طلبہ اسکولوں میں پڑھتے ہیں، خواہ وہ مذہب کا تعلق مسلموں کے زیرِ انتظام ہوں یا غیر مسلموں کے، ان میں اس موضوع پر تقریریں رکھی جائیں۔

۵۔ دینی مدارس میں اس موضوع کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے شریکِ نصاب کیا جائے۔

۶۔ عام مسلمانوں کے لئے مختلف علاقوں میں اور خاص کر متاثرہ مقام کے قرب و جوار میں ایک روزہ، دو روزہ، سہ روزہ تربیتی کیمپ رکھا جائے اور ان کو ان کے ذہنی معیار کے اعتبار سے اس فتنہ کے بارے و خطرے سے آگاہ کیا جائے۔

۷۔ مختلف زبانوں میں ختمِ نبوت اور قادیانیت کے مسئلہ پر چھوٹے چھوٹے مختصر، آسان اور مدلل رسائل مرتب کئے جائیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔

۸۔ جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ بھی اس فتنہ کی شناعت سے لوگوں کو واقف کرایا جائے۔

۹۔ ایسے دیہات جو قادیانیت سے متاثر ہو چکے ہیں یا جو متاثر تو نہیں ہوئے لیکن وہاں کوئی مدرسہ، مکتب، مسجد یا کوئی عالمِ دین موجود نہیں ہے، وہاں مکاتب قائم کئے جائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ مختلف تنظیمیں، جماعتیں

اور بڑے مدارس ان دیہاتوں کو اپنے اوپر تقسیم کرلیں، مثلاً پانچ سو دیہات متاثر ہیں یا ان کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو حیدرآباد کے مختلف تنظیمیں اور مدارس ان میں سے دو، چار، پانچ دیہاتوں میں مکتب قائم کریں اور وہی اس کے ذمہ دار ہوں، اگر کسی مدرسہ میں دس مدرس رکھنے کی صلاحیت ہے تو پانچ مدرس مرکز میں رکھ لے، اور پانچ مدرس کے ذریعہ پانچ بستیوں میں مکاتب قائم ہو جائیں، اس طرح دیہات کے بہت بڑے علاقے کا احاطہ کیا جاسکے گا۔

۱۰۔ جن مدارس میں دارالاقامہ قائم ہے وہ اپنی گنجائش کا کچھ حصہ ان دیہاتوں کے لئے مخصوص کردیں، مثلاً کسی مدرسہ میں دو سو طلبہ کی گنجائش ہے تو سو طلبہ ان دیہاتوں سے اس طرح رکھے کہ بیس دیہاتوں سے پانچ پانچ طلبہ لائے جائیں اور ان کو یہاں تعلیم دی جائے، تاکہ وہ اپنے گاؤں میں مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پوری کرسکیں، اس طرح اگر چند مدرسے باہمی ارتباط کے ساتھ طلبہ کو لائیں تو چند سال میں ہزاروں دیہات تک علم کی روشنی پہنچائی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ اس سلسلہ میں بہت اہم رول تبلیغی جماعت ادا کرسکتی ہے، جماعتوں کا رخ زیادہ سے زیادہ ان دیہاتوں کی طرف کیا جائے، وہاں سے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کی جائے، ایسے علاقوں میں خاص طور پر ضلعی سطح کے اجتماعات رکھے جائیں، اس سے بڑا نفع ہوگا

۱۲۔ دینی مدارس بھی اگر اپنے فنڈ کا کچھ حصہ اس کام کے لئے مخصوص کرلیں اور ہر ماہ دو، تین دنوں کا دورہ ان علاقوں میں وفد کی صورت میں کریں، سفر کے اخراجات تو خود برداشت کریں ہی، مقامی لوگوں سے بھی خورد ونوش کی صورت میں کچھ حسن سلوک کریں تو اس کا بھی بڑا فائدہ ہوگا، اور یہ بھی سنت نبوی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو ہاشم کو دعوت اسلام دینے کے لئے کھانے کی

پہلے تو خود فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کا عظیم فتنہ ہے، اور اس کے مقابلے کے لئے سوزِ صدیق کی ضرورت ہے، حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی ہم سے سرگوش ہے کہ کیا اس ارتدادِ نو کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟؟

(۴؍ فروری ۲۰۰۰ء)

اخوتِ اسلامی کا فقدان

اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو اخوت اور بھائی چارہ کے رشتہ سے باندھ دیا ہے، مسلمان دنیا کے کسی بھی گوشہ میں ہو، مغرب میں یا مشرق میں شمال میں یا جنوب میں، گورا ہو یا کالا، مالدار ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو یا معمولی مزدور، اور بڑا ہو یا چھوٹا، وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمام اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں، انما المومنون اخوۃ (الحجرات ۱۰) یہ ایمانی رشتہ رنگ و نسل، علاقہ و وطن، زبان اور خون کے رشتوں سے بڑھ کر ہے، یہ رشتہ ہمیں ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان کا رکن بنا دیتا ہے، یہ ہمیں رشتہ و تعلق کے محدود دائرہ سے نکال کر عالمگیر وسعت میں لے آتا ہے۔

اسی رشتہ نے حبش کے بلال اور روم کے صہیب، فارس کے سلمان، اسرائیلی نسل کے عبداللہ بن سلام، بنو ہاشم کے علی و عباس اور دوسرے عرب کے ابوبکر و عمر وغیرہ کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا، یہ ایک دوسرے پر خون چھڑکنے والے، اور باہم خود مٹ کر دوسروں کو بچانے والے لوگ تھے، یہ اسلامی اخوت ان کے ذہن و فکر اور دل و دماغ پر اس قدر حاوی تھی کہ یہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے اور خود پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دوسروں کو اچھے کپڑے پہنانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ یؤثرون علی انفسھم و لو کان بھم خصاصۃ (الحشر ۹)۔

مسلمانوں کے لئے ایمان کے بعد اس اخوتِ ایمانی کو قائم رکھنا سب سے اہم ضرورت ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس رشتہ کو زندہ فرمانے کی سعی کی، آپ ﷺ

نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو ایک مسلمان دوسرے پر ظلم کرسکتا ہے، نہ اسے چھوڑ سکتا ہے، جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آتا ہے، اللہ اس کی ضرورت میں کام آتے ہیں، جو کسی مسلمان سے مصیبت کو دور کرتا ہے، اللہ قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور فرماتے ہیں، اور جو کسی مسلمان کی عیب پوشی کرتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیب کو چھپائیں گے۔ (مسلم، حدیث نمبر ۲۵۸۰) اس ارشاد میں آپ ﷺ نے اسلامی اخوت کے پانچ تقاضوں کو بیان فرمایا ہے، اول یہ کہ وہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرے، دوسرے یہ ایک دوسرے کے ناصر و مددگار رہیں، اور اپنے بھائی کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے، تیسرے اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آئے، چوتھے اس پر کوئی مصیبت آئی ہو تو اسے دور کرنے میں معاون و مددگار بنے، پانچویں اگر کسی مسلمان سے غلطی یا گناہ ہو جائے تو اس پر پردہ رکھنے کی کوشش کرے اور اسے رسوائی سے بچائے۔

آپ ﷺ نے اس امت کے باہمی تعلق کو بڑی موثر اور معنی خیز مثالوں سے سمجھایا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ باہمی محبت اور تعلق میں اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے، کہ اگر ایک عضو بیمار ہو جائے، تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر ۶۰۱۱، مسلم، حدیث نمبر ۲۵۸۶) اس تمثیل کی معنویت پر غور کیجئے، جسم کے تمام اعضاء یکساں اہمیت اور حیثیت کے حامل نہیں ہوتے، دماغ پورے جسم کا بادشاہ ہے، اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر جسم کا ہر ہر انگ کام کرتا ہے، اور ہر صلاحیت متحرک ہوتی ہے، قلب پورے بدن کے لئے پاور ہاؤس ہے، اگر یہ کسی حصے کو خون کی سپلائی چھوڑ دے، تو لمحوں میں اس حصہ کی موت واقع ہو جاتی ہے، پھر دوسرے اعضاء میں بھی کچھ زیادہ اہم ہیں، اور کچھ کم، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ اگر انگلی کو تکلیف ہو تو دل و دماغ یہ سوچے کہ ایک حقیر عضو کے لئے ہم کیوں مبتلائے رنج و غم ہوں، اور پاؤں یہ نہیں سوچتا کہ تکلیف انگلی کی ہے، ہم کیوں دوا خانہ کا چکر لگائیں؟ یہاں تک کہ اگر ناخن بھی ضرورت سے زیادہ کٹ جائے تو پورا جسم اس کی کسک کو

محسوس کرتا ہے، حد یہ ہے کہ بال جو ہمیں کاٹنے کے لئے، جس کے کٹنے سے جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچتا، وہ بھی انسان کو محبوب ہوتے ہیں، تو جیسے جسم کا ہر عضو دوسرے کے غم میں شریک ہے، نہ اس میں رنگ کا فرق مانع ہے، نہ کسی عضو کا کم اہم ہونا رکاوٹ ہے، اسی طرح پورا ''اسلامی خاندان'' ایک دوسرے کے لئے لائق محبت ہے، کوئی مسلمان غریب ہو، ان پڑھ ہو، کسی اور مسلک کا حامل ہو، کسی دوسری جماعت اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہو، کسی اور علاقہ یا کسی اور ملک کا رہنے والا ہو، محض اس فرق کی وجہ سے اخوتِ اسلامی کی آگ بجھ جائے، اور انسان اپنے بھائی کے لئے محبت کی شبنم بننے کے بجائے نفرت کا شعلہ بن جائے، یہ یقیناً ایمان کی کمزوری کی بات ہے، جس شخص کا ایمان جس قدر قوی ہوگا، اسلامی اخوت کا جذبہ اسی قدر اس میں موجزن ہوگا، اور حمیتِ ایمانی جتنی کم ہوگی، تعصبات اور تنگ نظریاں اسی قدر اس کے سینہ کو اپنے لئے پناہ گاہ بنائیں گی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس اسلامی رشتہ کو ایک اور مثال سے سمجھایا، آپ نے فرمایا: یہ پوری امت ایک عمارت کے درجہ میں ہے، جیسے عمارت کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، اسی طرح اس قصرِ اسلامی کی ہر اینٹ دوسرے کے لئے تقویت کا سامان ہے، المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا (مسلم، حدیث نمبر: ۶۵۸۵) یہ مثال بھی بڑی ہی معنی خیز اور چشم کشا ہے، عمارت کے تمام اجزاء قوت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک درجہ کے نہیں ہوتے، بنیاد کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، پھر ستون ہیں، اس کے بعد چھت ہیں، دیواریں اور فرش بھی عمارت کا حصہ ہیں، عمارت کا ایک حصہ وہ ہے جو لوگوں کے سر پر سایہ فگن ہے، اور ایک حصہ وہ ہے جو اس کے قدموں کے نیچے روندا جاتا ہے، بنیاد کے پتھر نظر نہیں آتے، اور زیبائش و آرائش کے لئے کھڑے کئے گئے گنبد اور مینار دور سے دعوتِ نظارہ دیتے ہیں، بنیاد اپنے آپ کو نیچے دبا کر دوسروں کو سربلند کرتی ہے، یہی حال اس امت کے افراد کا ہے، کوئی زیادہ اہم ہے اور کوئی کم اہم، کسی نے ایک کام کو سنبھال رکھا ہے، کسی نے دوسرے کام کو، کسی نے خود کو کتابوں کے غار میں

دفن کر کے دوسروں کو سربلند کر رکھا ہے، لیکن سب ایک دوسرے کے لئے معاون و مددگار بھی ہیں، اور ضرورت بھی، اگر دیوار کی ایک اینٹ نکال دی جائے، تو پوری دیوار کمزور ہو جاتی ہے، اسی طرح امت کے کسی فرد یا گروہ کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے، کہ یہ سب ایک دوسرے کے لئے تقویت کا سامان ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد کرنے میں ہی پوری امت کا بقاء اور اس کا تحفظ ہے۔

اسلام نے اس رشتۂ اخوت کو اتنا مضبوط اور مستحکم کیا کہ نازک سے نازک وقت میں بھی مسلمان نے اسے یاد رکھا، اور انہوں نے دوسروں کو کسی مسلمان گروہ پر ان سے اختلاف کے باوجود دست درازی کی اجازت نہیں دی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں ایک سے زیادہ جنگیں ہوئیں، رومیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھانا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یلغار کرنا چاہا، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ترچھی نگاہ سے بھی دیکھا تو میں تیری آنکھ نکال دوں گا، یہ کہا کہ علی رضی اللہ عنہ کی فوج کا پہلا سپاہی میں ہوں گا، عباسیوں کے عہد خلافت میں جب اندلس پر بنو امیہ کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت بھی عیسائیوں نے بنو امیہ سے تعاون کی پیشکش کی، لیکن اموی بادشاہ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سے ہی یہود و نصاریٰ نے محسوس کیا کہ جب تک اسلامی اخوت کے اس جذبہ بیکراں پر تیشہ نہ چلایا جائے، مسلمانوں کو زیر کرنا ممکن نہیں ہوگا، چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس مقصد کے تحت ترکی مرحوم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا عظیم سانحہ پیش آیا، اس حقیر کے خیال میں سیاسی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو سب سے بڑا نقصان اس واقعہ سے ہوا، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عراق اور شام میں دو الگ الگ مسلم مملکت کا وجود، کیونکہ اس وقت تک عالم اسلام کی تقسیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اس تقسیم نے بعد کو چل کر ایک الگ مسلم مملکتوں کے تصور کو تقویت پہنچائی، اور دنیا کے مختلف حصوں میں خلافت اسلامی سے آزاد مسلمان مملکتیں قائم ہونے لگیں، خود ہندوستان

بھی اسی کی ایک مثال ہے، جہاں بعض علاقوں نے اندر خطبہ میں خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا اور بعض میں نہیں، اور جہاں پڑھا جاتا تھا تو وہ بھی برائے نام، خلیفہ سے کوئی حقیقی ربط و تعلق نہیں ہوتا تھا۔

دوسرا حادثہ خلافت عثمانیہ کا سقوط ہے، خلافت عثمانیہ جیسی کچھ بھی ہو لیکن بہرحال وہ مسلمانوں کی وحدت، جمعیت اور مرکزیت کا ایک نشان تھی، اور دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی افتاد آتی، مسلمانوں کی نگاہ مرکز خلافت کی طرف اٹھتی تھی، اور کسی حد تک اس کی ترجمانی ہوتی تھی، یہ ایک ایسی بنیاد تھی کہ جس کو وسیلہ بنا کر پوری دنیا کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا جا سکتا تھا، اس حقیقت کو اس دور کے نا سمجھ عرب اور ترک قائدین نے نہیں سمجھا، اور مغرب کے اشارہ پر خلافت ختم کر دی گئی، پھر اس اسلامی اخوت کے جذبہ کو سرد کرنے اور ان کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے لئے مغرب نے وطن پرستی کی کاشت لگائی، اور اسے خوب آبیار کیا، کیونکہ یہی وطنی قومیت کا جذبہ اسلامی اخوت کا بدل بن سکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ شام، مصر، حجاز، یمن، ترکی، عراق اور پورا عالم اسلامی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا، اور آج وہ مغرب کے لئے بازیچۂ اطفال ہے، اسرائیل قتل عام کرے، اور مسلمانوں کی زمین پر غاصبانہ قابض ہو، بوسنیا میں نسل کشی کی جائے، افغانستان اور سوڈان میں مسلمان حکومتوں کے خلاف مرتد عیسائیوں کو ورغلایا جائے، اور الجزائر میں ایک منتخب حکومت کو بلاوجہ تخت اقتدار سے تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے تو یہ دہشت گردی نہیں، اور مسلم ملک کو خود ساختہ الزامات کے ذریعہ دہشت گرد قرار دیا جائے لیکن افسوس! کیا مجال کہ کوئی زبان بھی اس کے خلاف جنبش کر سکے!!

یہ سب اخوت اسلامی سے محرومی اور حمیت ایمانی سے تہی دامنی کا نتیجہ ہے، اس سے زیادہ بدقسمتی کی کوئی اور بات ہو سکتی ہے کہ لوگ مسلمانوں کے مسائل کو علاقوں اور خطوں کی اصطلاحات میں سوچنے لگیں، گویا یہ جغرافیائی تقسیم ہی انسانوں کی تقسیم ہے، نہ کہ خالق انسان کی، یہ جغرافیائی لکیریں ہی ایمانی رشتوں کو بے معنی بنا دیں گی؟ افسوس کہ مسلمانوں

میں بین الاقوامی سطح سے لے کر ملک، ریاست، ضلع اور شہر کی سطح تک علاقہ پرستی کا مزاج پیدا ہوتا جا رہا ہے، جو قومیں دریا کے کناروں کی طرح ایک دوسرے سے نہیں مل سکتی تھیں، وہ تو آج ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، اور جو امت جسد واحد بنائی گئی تھی، اس کا عضو عضو ایک دوسرے سے اس طرح روٹھا ہوا ہے کہ ایک کی مصیبت دوسرے کو اشکبار نہیں کرتی۔ فیا اسفاہ ویا عجباہ!

(.)

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

مسلمان آج کسی زبوں حالی سے دوچار ہیں، یہ محتاجِ اظہار نہیں، خون ان کا اتنا ارزاں ہے کہ بعض اوقات اس کی قیمت پینے کے صاف پانی سے بھی کم ہوتی ہے، مسلمانوں کا قتل عام ہوسکتا ہے، لیکن کیا مجال کہ قاتلوں پر بھی کوئی آنچ آئے؟ ملیانہ اور ہاشم پورہ کا قتل عام، مرادآباد کی عیدگاہ، آسام میں نیلی اور بہار میں بھاگلپور کو چھوڑئیے آخر کون سی جگہ ہے جو مسلمانوں کے خون ناحق سے لالہ زار نہیں؟ مال و اسباب اور دکان و کاروبار تو مسلمانوں کے لوٹے جاتے ہیں، احمدآباد میں، جمشید پور میں، مرادآباد اور بھاگلپور میں، راورکیلا اور احمدآباد میں شاید اب بھی ایسے تباہ شدہ علاقے کے کھنڈر موجود ہیں، عزت و آبرو بیچ کر بھی نہیں بلکہ سرِ عام کس کی تذلیل ہوتی ہے؟ مظلوم مسلمانوں کی! اگر سورت کی سڑکوں کو قدرت کی طرف سے قوت گویائی دے دی جائے تو شاید آج بھی وہ گواہی دے اور پھر ان انسانیت سوز اور شرافت دوز حرکتوں کا ذکر بھی ہوتا ہے اور بستی کے گلی کوچوں میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے تاکہ مسلمان خوب بے آبرو ہوں اور ان کی ذلت و رسوائی اپنی نہایت کو پہنچ جائے۔

یہ تو مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی بات ہے، لیکن کونسا میدان ہے، جس میں ان کا حال بہتر ہے؟ معاشی اعتبار سے وہ اتنے گئے گذرے ہیں کہ معاشی پسماندگی میں اب کوئی قوم ان کی شریک و سہیم نہیں، تعلیمی صورت حال یہ ہے کہ اب ناخواندگی کی سطح مسلمانوں میں ہریجنوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے اور ہماری تعلیمی پسماندگی ملک میں ضرب المثل بن گئی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہمارا

حصہ دو تین فیصد بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اتر پردیش ملک کی اہم ترین ریاست ہے۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بھی قابل لحاظ ہے، لیکن ریاست کے اضلاع میں سے ایک میں بھی مسلمان ڈی ایم نہیں، کوئی کمشنر مسلمان نہیں، کوئی آئی جی، ڈی آئی جی مسلمان نہیں، ملک میں جو مانے ہوئے ٹیکنسین ہیں، جن میں سے ۲۶۴ ڈائرکٹر ہیں، ان میں مسلمان صرف چار ہیں۔

ہم ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہم سب سے بے وزن سیاسی قوت ہیں، ہندوستان میں سکھوں کی آبادی کا تناسب دو فیصد ہے اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب حکومت کے بیان کے مطابق بھی ۱۳ر فیصد ہے، جو یقیناً حقیقت پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے، لیکن سکھ بھی اپنی ایک سیاسی قوت رکھتے ہیں، اسی طاقت کا نتیجہ ہے کہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کے فساد میں مارے گئے سکھوں کے قاتلوں کو انھوں نے سزائیں دلوائیں اور ایک ایک مقتول کا معاوضہ دس لاکھ منظور کرایا، لیکن مسلمانوں کو فسادات میں جو نقصان پہنچے، بعض اوقات تحقیقاتی کمیشن قائم ہوئے لیکن اس کی رپورٹ پر کبھی عمل نہیں ہوا اور ممبئی کے فساد کے سلسلہ میں شری کرشنا رپورٹ کو تو نہایت ہی بے شرمی کے ساتھ حکومت مہاراشٹر نے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور مسلمان کچھ نہیں کر سکے۔ یہ تفاوت محض سیاسی بے وزنی کی وجہ سے ہے۔

آخر جو قوم صدیوں اس سرزمین پر فرماں روائی کر چکی ہے اور جس کی عزت و شوکت کے نقوش اور شرافت و انسانیت کے عکوس اس ملک کے چپے چپے پر ثبت ہیں، آج کیوں ذلت و انحطاط کے اس مقام تک پہنچ چکی ہے اور وقت کی ٹھوکریں بھی اس کو خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے میں ناکام و نامراد ہیں؟ ___ غور کریں تو ان سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خدا سے اپنا رشتہ کمزور کر لیا ہے، فرقہ بندیوں اور باہمی عداوتوں نے ہمیں سمندر کی سی طاقت رکھنے کے باوجود قطروں میں تقسیم کر دیا ہے، ایسا قطرہ جسے دھوپ کی ہلکی سی تمازت اور ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی وجود سے محروم کر سکتا ہے۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا، جس میں مسلمانوں کو ایک گونہ ہزیمت سے دوچار

ہونا پڑا، اور حضرت مصعبؓ جیسے جاں نثار شہید ہو گئے، قرآن نے تفصیل سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، قرآن میں اس شکست کے اسباب اور اثرات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے، اس واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا (آل عمران: ۱۰۳) یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑیوں میں بٹنے سے بچو، اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع سے بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں جھگڑو نہیں کہ آپسی نزاع تمہارے لئے ناکامی اور نقصان کا پیش خیمہ بنے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی: ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ریحکم (الانفال: ۴۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی بے وزنی، بحیثیت قوم کے ان کی بے وقعتی اور ہوا خیزی کا اصل سبب یہی آپسی نزاع و اختلاف اور بکھراؤ ہے، اتحاد و اتفاق اور اجتماعیت یوں تو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ضروری ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آج کے سیاسی پس منظر میں یہ اتنی بڑی ضرورت ہے کہ شاید ہی کبھی اس قدر ضروری رہا ہو، فرقہ پرستی کی گھنگھور گھٹائیں ہر سو چھائی ہوئی ہیں۔ پورے ملک کے افق پر زعفرانی شفق چھایا جاتا ہے، شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کا کوئی فرق نہیں، پڑھے لکھے لوگوں، دانشوروں اور جاہل عوام سب پر فرقہ پرستی کا نشہ سا چھاتا جا رہا ہے اور اس آتش فشاں سے جو لاوا اُٹھنے والا ہے، یقیناً مسلمان ہی اس کا نشانہ ہیں، اور ہماری صفوں میں اتحاد و یکجہتی اور اشتراک و تعاون کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں، جس کے ذریعہ اس فتنہ کا مقابلہ کیا جا سکے، اور اس ملک کے امن و امان کی حفاظت ہو سکے، یہ سیلاب اتنا خطرناک ہے کہ اگر مسلمان اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ نہ صرف مسلمانوں کے جان و مال کو بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت اور تمدنی وجود کو بھی ——— خدانخواستہ اور ہزار بار خدانخواستہ ——— بہا لے جائے گا۔

اسلام میں اتحادِ امت کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں، مقصد کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض ایسی چیزوں کی اجازت دی جو عام حالات میں گناہ بلکہ گناہ کبیرہ ہے، جھوٹ بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی کس

قدر مذمت فرمائی ہے؟ لیکن دو مسلمانوں میں اختلاف کو دور کرنے اور شکستہ دلوں کو ملانے کی غرض سے آپ نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دی، جب دو اشخاص و افراد کا اتحاد اتنا اہم ہے تو مسلمانوں کے دو گروہوں جماعتوں اور تنظیموں کے اختلاف کو دور کرنا اور ان کو ایک صف میں کھڑا کرنا کتنا اہم عمل ہوگا، کہ اس کے لئے تو شاید سو جھوٹ بھی جائز ہوں، اسی طرح برائی سے روکنا اور برائی کے خلاف آواز اٹھانا مسلمانوں کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے، لیکن جہاں "نهي عن المنكر" فساد و اختلاف کا باعث بن جائے اور اندیشہ ہو کہ اس سے ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا تو ایسے موقع پر آپ نے وقتی طور پر برائی کو انگیز کرنے اور تحمل برتنے کا حکم دیا۔ آپ نے ایک بار حضرت ابوذر غفاری ؓ سے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہو جائیں گے جو تم سے وصول کریں گے اور اپنی عیش کوشیوں میں خرچ کریں گے، ایسے موقع پر تم کیا کرو گے؟ حضرت ابوذر ؓ نے عرض کیا کہ میں اس کو نوک شمشیر سے سیدھا کر دوں گا، آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرنا، بلکہ اس وقت کا انتظار کرنا جب تم بھی اللہ سے آملو اور یہ امراء بھی۔ منشاءِ نبوی یہ تھا کہ منکر اور برائی کو روکنے میں ایسے تشدد سے کام نہ لیا جائے جو امت میں تفریق اور انتشار کا باعث بن جائے۔ بلکہ ایسے موقع پر صبر و تحمل اور بردباری کا راستہ اختیار کیا جائے، اور ان کے عمل کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے کہ وہی احکم الحاکمین ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ امام مقتدیوں کی نماز کا ضامن ہے، اسی لئے امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدی کی نماز آپ سے آپ فاسد ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے: الامام ضامن، اس لئے امام کو بہتر سے بہتر اوصاف کا حامل ہونا چاہئے، وہ صاحب علم ہو، عمدہ قرآن پڑھتا ہو، ورع و تقویٰ کا حامل ہو، لیکن اگر کوئی خراب شخص ہی امام بن جائے اور اس کو ہٹانے میں فتنہ و انتشار کا اندیشہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز پڑھی جائے۔ صلوا خلف كل بر و فاجر۔ گویا امام کا نیک ہونا بہتر ہونا امت کے اختلاف و انتشار اور نزاع و افتراق سے کمتر ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت کی وحدت اور اجتماعیت کو برقرار رکھنا کس قدر اہم اور ضروری ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ایک تو ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور باہم دست و گریباں ہیں، دوسرے مسلمانوں میں پڑھے لکھے سمجھدار اور باشعور لوگ اس بات کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ وہ مسلمانوں کے آپسی اختلاف کو دور کرنے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں، حالانکہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا اور ان کی باہمی کدورتوں کو دور کرنے کی سعی کرنا بھی امت کے اجتماعی فرائض میں سے ایک ہے، رسول اللہ ﷺ کے نزدیک نماز میں جماعت کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مرض وفات میں بھی جب بالکل مجبور ہوگئے تب ہی آپ کی جماعت فوت ہوئی، لیکن قبیلہ عمرو بن عوف کے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے آپ کو مسجد تشریف آوری میں تاخیر ہوگئی، تاخیر کے باعث حضرت ابوبکرؓ کو امام بنایا گیا، بعد میں آپ شریک جماعت ہوئے (بخاری عن سہل بن سعد ساعدی) غرض، یہ نہایت اہم اور مبارک کام ہے، جس کی طرف مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اتحاد اس طرح نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص یا کوئی تنظیم سوچنے لگے کہ تمام لوگ اپنے وجود کو اس کے وجود میں گم کردیں، اور اس کے تابع ہو کر اتحاد قائم کریں، اسی کی تنظیم اور جماعت کو اپنا مرکز تسلیم کرلیں، ایسا خیال کرنا یقیناً خود فریبی اور خوش فہمی ہی کی بات ہوگی، اتحاد کی بنیاد یہی ہوسکتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنا بلکہ ایک دوسرے کے کام اور طریقۂ کار کا احترام کرنا سیکھیں، اگر کام کے میدان الگ الگ ہوں تو اپنے اپنے دائرے بنائیں اور دوسرے کے کام کو بھی قدر و منزلت سے دیکھیں، اور اگر ایک ہی میدان میں کام کررہے ہیں تو اس میں بھی تقسیم ہوسکتی ہے مثلاً اگر ایک شہر میں دو مسلمان سیاسی جماعتیں ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس شہر کے حلقہ ہائے انتخاب کو باہم تقسیم کرلیں تاکہ مسلمانوں کا ووٹ بٹنے نہ پائے اور ہمارا اختلاف فرقہ پرست طاقتوں کو فائدہ نہ پہونچائے؟ اس کے لئے اپنی انا کو قربان کرنے، خود پرستی کے خول سے باہر آنے اور جرأت مندی کے ساتھ حقائق کو سمجھنے کی ضرورت پڑے گی، لیکن اگر ہماری سیاسی جماعتیں اس پر تیار ہوجائیں تو یہ نہایت ہی اہم قدم ہوگا۔ جس میں امت کی سرخروئی بھی ہے اور ان

جماعتوں کا بھی۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ اس وقت جس تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، وہ کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ ایسے لوگ جن کا ایک ساتھ بیٹھنا، سال دو سال پہلے ناممکن سمجھا جاتا تھا اور ایسی جماعتیں جن کے اشتراک کا چند ہفتوں پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ آج ایک دوسرے سے بغل گیر اور سیاست کی بساط پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر کھڑے ہوئے ہیں، پھر مسلمان جن میں اتحاد کی کتنی ہی بنیادیں موجود ہیں، کیا وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟ مصیبت اور پریشانی شیر اور بکری اور سانپ اور نیولے کو بھی ایک جگہ جمع کر دیتی ہے، لیکن کیا ہم اس قدر بے حس اور بے شعور اور شخصی مفادات کے حریص اور لالچی ہیں کہ سیلاب بلا اور طوفان بے درماں بھی ہم کو متحد نہیں کر سکا؟ شاید علامہ اقبال کی روح ہم پر نوحہ کناں ہو، اور استفسار کر رہی ہو کہ

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں؟
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

(۲؍اگست ۱۹۹۹ء)

بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قسم قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں، ایک سے ایک طاقتور، اور خوبصورت سے خوبصورت تر، انسان بظاہر ان کے مقابلہ میں کم تر محسوس ہوتا ہے، اس کو نہ ہاتھی کا ڈیل ڈول حاصل ہے نہ شیر کی قوت، نہ ہرن کی نشیلی آنکھیں، نہ چیتے کی طرح خوبصورت نقش و نگار کا پیرہن اور نہ گلاب کی سی خوش رنگی، لیکن ان سب کے باوجود پوری کائنات گویا اس کے اشاروں پر رقص کرتی ہے، اس کی وجہ انسان کی کچھ امتیازی صلاحیتیں ہیں، انہیں امتیازی اوصاف میں ایک اظہار و بیان کی قوت ہے، قرآن مجید نے انسان پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اللہ نے اس کو بیان سکھایا" (الرحمٰن: ۴) گفتگو کے ذریعہ اپنے مقصود کا اظہار اور خیالات و افکار کو الفاظ کا جامہ پہنانا، انسان کی ایسی صلاحیت ہے کہ شاید ہی کوئی مخلوق اس میں اس کی ہمسری کر سکے، شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے، لیکن کبھی اس کے اعزاز میں نہ جلسے ہوئے نہ جلوس، اور نہ کبھی اس نے اپنے خطاب شاہانہ ہی سے اہل جنگل کو نوازا ہے، مگر یہ حضرت انسان ہیں کہ ان کی تقریروں، نعروں، مشاعروں اور نغموں نے پوری فضاء کائنات کو اپنا اسیر بنالیا ہے، اس لئے زبان اور قوت بیان اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کی قدر دانی بھی اسی نسبت سے واجب ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو میرے لئے دو چیزوں کی ضمانت لے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لوں گا، ایک زبان، دوسرے نفسانی خواہشات" زبان کو قابو میں رکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے، اس لئے کہ ہر گناہ نے اپنی فانی لذت کے ساتھ پریشانی اور خطرات کو

بھی دوش بدوش رکھا ہے، چور چوری کرتے ہوئے خطرات سے گزرتا ہے اور مشقتیں اٹھاتا ہے، راہزن رہزنی میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے، لیکن زبان کے گناہ میں نہ کوئی خرچ ہے نہ مشقت، اور نہ دنیا میں جان و مال کا خطرہ، اس سے ایسے لوگوں کو بڑی لذت ملتی ہے جن کو کوئی اور کام نہ ہو۔

زبان بگڑے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور اچھے خاصے ماحول کو بگاڑنے کی بھی، زبان کے ایک بول ہی سے رشتے بنتے بھی ہیں اور بنے بنائے رشتے ٹوٹتے بھی ہیں۔ ایک ہی بات کو دو طرح سے کہا جاسکتا ہے۔ ایک انداز ادب کا ہے اور دوسرا بے ادبی کا۔ کسی نے حضرت عباس ؓ سے پوچھا: آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ ﷺ بڑے ہیں؟ عمر پوچھنی مقصود تھی، اس لئے سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ میں بڑا ہوں، لیکن حضرت عباس ؓ نے یہ نہ کہا۔ فرمایا بڑے آپ ﷺ ہیں، عمر میری زیادہ ہے، "هو اکبر و انا اسن" حضرت عمر ؓ کو اللہ تعالیٰ نے خاص مومنانہ فراست عطا فرمائی تھی، کئی مواقع پر حضرت عمر ؓ کی جو رائے تھی، اس کے مطابق آیت قرآنی نازل ہوئی، حضرت عمر ؓ نے خود اس کو بیان کیا ہے، کوئی کم فہم ہوتا تو کہتا کہ فلاں فلاں بات میں اللہ نے میری موافقت فرمائی ہے، مگر حضرت عمر ؓ کا کمال ادب ملاحظہ ہو، فرمایا کہ تین باتوں میں میں نے اپنے رب کے منشاء کے موافق رائے اختیار کی: "وافقت ربي في ثلاث" کتنا ادب ہے اس تعبیر میں!

سب سے بڑھ کر ادب سے معمور زبان اللہ کے پیغمبروں کی ہوتی ہے، کیوں کہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

قرآن مجید میں نمرود سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مکالمہ میں اللہ تعالیٰ کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ میرا خدا وہ ہے کہ جب بیمار پڑتا ہوں تو وہ مجھے شفاء دیتا ہے: "وإذا مرضت فهو يشفين" (الشعراء: ۸۰) غور کیجئے کہ اصل میں تو بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفاء و صحت بھی،

لیکن بیماری بہر حال ایک تکلیف دہ چیز ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت سے گریز فرمایا اور اپنی طرف نسبت کی، شفاء میں شر کا کوئی پہلو نہیں اس لئے اس کو صراحۃً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔

گفتگو کا سلیقہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے ساتھ مطلوب نہیں، اس کی ضرورت ایک انسان کی دوسرے انسان سے بات چیت میں بھی ہے۔ "ماں" کا لفظ کتنا مقدس ہے، اس میں کس قدر محبت، پیار اور احترام ہے! لیکن ماں کا ترجمہ "باپ کی بیوی" سے کیا جائے تو صحیح طبیعت کو اس کا سننا بھی گراں گزرتا ہے۔ خوش سلیقگی کے ساتھ اختلاف رائے ہو تو اختلاف رائے سے بھی گرانی نہیں ہوتی، لیکن بد سلیقگی کے ساتھ "تعریف" کے بھی گالی ہونے کا خیال گزرتا ہے۔ اگر آپ کو کسی کی رائے سے اختلاف کرنا ہو اور آپ یوں کہیں کہ تمہیں تو عقل ہی نہیں ہے اور تمہاری یہ رائے بالکل غلط اور ناقابل قبول ہے تو بات "تو تو، میں میں" سے بڑھ کر جیب و گریبان تک بھی جا سکتی ہے، لیکن اگر اسی بات کو اس طرح کہا جائے کہ آپ تو ماشاء اللہ سمجھ دار اور صائب الرائے آدمی ہیں، مجھ سے زیادہ عقل و فہم رکھتے ہیں، ممکن ہے آپ ہی کی رائے زیادہ صحیح ہو، لیکن میری ناقص عقل میں فلاں فلاں وجہ سے یہ بات اس وقت مناسب محسوس نہیں ہوتی تو اختلاف میں شدت بھی پیدا نہ ہوگی، دوسرے شخص کے لئے آپ کی رائے و فکر کا منصفانہ تجزیہ کرنا اور اس کے لئے آپ کی رائے کی طرف رجوع کر لینا آسان ہوگا، اس لئے حضرت کلیم کا یہ شعر مجھے بڑا پسند ہے اور شاید آپ کو بھی پسند آئے:

بات جو ہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کرنے کا سلیقہ چاہئے

(۲۰/فروری ۱۹۹۸ء)

اسلام

نسل پرستی کا علاج

جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں نسل پرستی کے موضوع پر اقوامِ عالم کی کانفرنس زور و شور کے ساتھ جاری ہے، اور اس کی خبریں روزانہ اخبارات کی شاہ سرخیوں کی زینت بن رہی ہیں، یہ کانفرنس نسل پرستی کے ختم کرنے میں کس قدر مفید ثابت ہوگی، یہ تو وقت ہی بتلائے گا، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ واحد سپر طاقت "امریکہ" جو پوری دنیا میں انسانی حقوق کی حفاظت کو اپنی خود ساختہ ذمہ داری سمجھتا ہے، وہ اس لئے کانفرنس سے باہر نکل آیا ہے کہ دنیا کی بدترین نسل پرست حکومت اسرائیل کے خلاف ایک حقیقت پسندانہ تجویز منظور ہوئی ہے، یہ کیسا المیہ ہے کہ جو ملک دنیا بھر میں انسانی حقوق کا احتساب کرتا ہو، وہ خود انسانی حقوق کی پامالی کا بدترین مرتکب ہو، جو دوسروں کے یہاں مچھر بھی چھانتا ہو اسے خود اپنے یہاں اونٹ نگل جانے میں بھی کوئی تکلف نہ ہو۔

اگر اقوامِ عالم حقیقت پسندی سے کام لیں اور تنگ نظری کے خول سے باہر آکر سوچیں اور دیکھیں تو محسوس کریں گی کہ وہ نسل پرستی کی جس دشواری سے دوچار اور وحدتِ انسانی کے جس پیغام کی خواہش مند ہیں، وہ اسلام کے دامن میں موجود ہے، اسلام کی بنیادی تعلیم اور انسانی اخوت کے بارے میں اسلامی تصورات کا ترجمان پیغمبرِ اسلام ﷺ کا وہ عظیم الشان خطبہ ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اے لوگو! تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی، تم سب آدم

> کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ اللہ کے نزدیک تم میں
> سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی
> پر فضیلت نہیں ہے مگر تقویٰ کے ذریعے۔

یہ کوئی معمولی اعلان نہیں تھا، یہ ایک انقلاب کی دعوت تھی۔ مروجہ فکر کے رخ کو موڑنے والی اور انسانی ذہن کو جھنجھوڑنے والی دعوت، رسول اللہ ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے، اس وقت دنیا کی جن قوموں کا ذکر ملتا ہے، ان سبھوں کی فکر نسل پرستی کے تصور پر قائم تھی۔

یہود و نصاریٰ کے بارے میں تو خود قرآن نے کہا ہے کہ وہ کہتے تھے، ہم اللہ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، وقالت الیہود والنصاریٰ نحن ابناء اللہ واحباؤہ (المائدہ:۱۸) خود عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ غیر عرب کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عجمی (گونگا) کی تعبیر خود بتاتی ہے کہ دوسری قومیں ان کی نگاہ میں کیا درجہ و مقام رکھتی تھیں، خود عربوں کے مختلف خاندان ایک دوسرے کے مقابلہ احساس برتری میں مبتلا تھے۔ اور وہ عبادات و بندگی کے موقع پر بھی اپنے آپ کو اس احساس سے فارغ نہیں کر پاتے تھے۔ قریش کا حال یہ تھا کہ وہ حج کے موقع سے حرم اللہ سے آگے نہیں جاتے تھے، اور وہ اسے اپنے مقام کے منافی جانتے تھے، کہ حدود حرم سے باہر عرفات تک جائیں، کعبہ کا دروازہ اس لئے اونچا کر دیا گیا تھا، کہ عام لوگ کعبہ میں داخل نہ ہو سکیں۔ یہ اونچ نیچ کا تصور دوسرے قبائل کے ذہنوں میں بھی اس طرح بٹھا دیا گیا کہ وہ بھی اپنے آپ کو قریش سے کمتر خیال کرتے تھے، وہ طواف کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ قریش کے کپڑے پہن کر ہی طواف کریں، یہاں تک کہ جن لوگوں کو قریش کے پہنے ہوئے کپڑے میسر نہ آئیں وہ بے لباس طواف کرتے، مرد دن میں اور عورتیں شب میں۔

اہل ایران کا حال یہ تھا کہ شاہی خاندان کو خدا کا نبیرہ باور کرتے تھے، شاہ ایران کو "خداؤں میں انسان لافانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی" کہا جاتا تھا، ہندوستان میں بعض خاندان سورج کی اور بعض چندر کی اولاد سمجھے جاتے تھے، اور منو کے قانون کے تحت

نسلِ انسانی کو مستقل طور پر چار طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ سب سے اونچا طبقہ برہمن، دوسرا چھتری، تیسرا ویش اور چوتھا شودر جو ان سب میں زیادہ بدقسمت اور کم نصیب طبقہ تھا، مصر، یونان اور روم وغیرہ قریب قریب تمام علاقے نسل پرستی کی لعنت میں مبتلا تھے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اللہ کی وحدت کے ساتھ انسانی وحدت کا تصور دیا، اور قرآن نے صاف کہا کہ اللہ نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے، اور ایک ہی ماں باپ سے تمام انسانیت کو پھیلا دیا ہے: خلقکم من نفس واحدة، و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیرا و نساء (النساء: ۱)

رسول اللہ ﷺ کے اس خطبہ میں دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شرف و کرامت اور عزت و فضیلت کا معیار انسان کا عمل اور اس کا کردار و "اکتساب" ہے، نہ کہ اتفاقاً اس کا کسی خاص نسل یا خاندان میں پیدا ہو جانا۔ اللہ کے نزدیک با عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو، خود قرآن نے بھی اس حقیقت کو انہی لفظوں میں کہا ہے: ان اکرمکم عند الله اتقکم (الحجرات: ۱۳) یہ وہ تصور ہے جو اونچ نیچ کی غیر فطری، غیر معقول اور خود ساختہ عمارت کی دیوار منہدم کر دیتا ہے، اور یہ گویا نسل پرستی کی شہ رگ پر نشتر لگانے کے مترادف ہے۔

تیسری اصولی بات جو قرآن نے کہی ہے، وہ یہ کہ خاندان کا مقصد تعارف اور پہچان ہے نہ کہ تفاخر اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانے کا ذریعہ، ارشادِ ربانی ہے:

یا ایها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی و جعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان محض اس لئے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

بیشک اللہ نے تم لوگوں سے زمانۂ جاہلیت کا تعصب اور آباء

وجہ اس پر فخر کرنے کو ختم کر دیا، اب وہ مومن تقی ہے یا بدکار شقی،

گویا انسانیت کی تقسیم عمل کے اعتبار سے ہے، نہ کہ خاندان کے اعتبار سے، خاندان بڑے اور چھوٹے ہونے کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ یہ محض پہچان اور شناخت کا ذریعہ ہے، جیسے پہچان کے لئے مختلف افراد کے نام رکھے جاتے ہیں، مختلف علاقوں کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، اداروں اور کمپنیوں کا نام ہوتا ہے، اسی طرح یہ انسانی گروہوں اور افراد کی مختلف اکائیوں کے نام ہیں، نسل پرستی اور خاندانی برتری اور کمتری کا تصور اسی یقین سے وجود میں آتی ہے، کہ خاندانی نسبتیں ایک دوسرے پر فخر کا سامان ہیں، اور ان نسبتوں سے عظمت وحقارت جسم سے جدا نہ ہونے والے سایہ کی طرح لگی ہوئی ہیں، قرآن نے اس کھوٹی فکر کی اصلاح کی، اور قوموں کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا۔

پھر اسلام نے اسے عملاً برت کر دکھایا، غور کیجئے! حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک حبشی نژاد اور سابق غلام ہیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنا آقا اور سردار برسرعام کہتے ہیں، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ایرانی النسل ہیں، لیکن آپ ﷺ ان کو اپنے اہل بیت میں شمار فرماتے ہیں: سلمان منا من اهل البيت، نماز کی امامت نہایت معزز عمل ہے، آپ نے اس کے لئے علم اور قراءت کو معیار بنایا، حسب ونسب کا اس سلسلہ میں ذکر تک نہیں فرمایا، عبد اللہ ابن ام مکتوم آزاد شدہ غلام ہیں، لیکن پندرہ مواقع پر آپ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔

عرب شادی بیاہ کے معاملہ میں خاص طور پر خاندان ونسب کا بہت خیال کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس تصور کو بھی مٹانے کی کوشش کی، حضرت زید بن حارثہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زینب سے کر دیا، جو آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور جو بعد کو آپ ﷺ کے نکاح میں آگئیں، حضرت مقداد بن اسود بنو زہرہ میں سے تھے، جو بنو ہاشم سے کمتر سمجھے جاتے تھے، آپ ﷺ نے ان کا نکاح اپنی چچا زاد بہن ضباعہ بنت زبیرؓ سے کیا، اور فرمایا کہ مقداد بھی اور زبیر بیٹی کا نکاح ہم نے اس طرح اس لئے کیا ہے کہ تقویٰ ہی شرافت کا معیار قرار پائے، ليكون اشرفكم عند

واللہ احسنکم خلقا (بیہقی ۷/۱۳۷) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو عجمی اور حبشی ہونے کی وجہ سے لوگ اپنی لڑکی دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے بنفس نفیس ایک عرب زادی فاطمہ بنت قیس سے فرمایا: ابوطیبہ نے بنو بیاضہ کے یہاں نکاح کر دیا، آپ ﷺ نے انہیں نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد پیدا ہوگا، الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر (بیہقی: ۷/۱۳۶) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے فرمایا کہ میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی بھی مسلمان سے نکاح کرلو خواہ رومی ہو یا حبشی، (المغنی ۷/۱۸۱) حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی شادی کی۔ (فتح القدیر: ۲/۱۸۱) اسی طرح کی کتنی ہی مثالیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے درمیان موجود ہیں، یہ کی بات ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے بعد علوم اسلامی کی جتنی بھی ممتاز شخصیتیں ہیں، ان میں غالب ترین اکثریت عجمی علماء کی ہے، سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہؒ عجمی الاصل، سب سے بڑے محدث امام بخاریؒ عجمی الاصل، علم کلام اور تصوف کی ممتاز ترین شخصیتیں عجمی الاصل ہیں، امام غزالیؒ جیسی شخصیت جس پر علوم اسلامی کی تاریخ کو ناز ہے، عجمی ہیں، عربی زبان کے رمز شناس اور اس زبان سے متعلق قواعد کے واضع جو گویا مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اکثر فارسی الاصل ہیں۔ خود سیبویہؒ امام نحو، عجمی ہیں، تفسیر کے بڑے بڑے ائمہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اکثر تلامذہ عجمی نژاد ہیں، علوم اسلامی کی تدوین اور ارتقاء میں آزاد شدہ عجمی غلاموں کا بڑا حصہ رہا ہے، اس سے نسل و نسب کے معاملہ میں اسلام کی بے تعصبی اور وسیع النظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام جہاں گیا، وہ انسانی وحدت و اخوت کی سوغات اپنے ساتھ لے کر گیا، اس نے مظلوم انسانوں کو اپنے انسان ہونے کا احساس دلایا اور مختلف علاقوں میں جن لوگوں نے اپنے لئے خدائی کے بت تراش لئے تھے، ان کی جبر و زیادتی کی چکی میں پسنے والی انسانیت کو عزت و شرافت سے ہمکنار کیا، اور ان میں مقام و مرتبہ کا احساس جگایا، جس کی

بازگشت آج پوری دنیا میں محسوس کی جارہی ہے۔ افسوس کہ مغرب آج تک نسلی تفوق کے ان قصوں سے باہر نہ آسکا۔ نازیوں کا نسلی برتری کا احساس تو کل کی بات ہے، یوگوسلاویہ میں نسلی تطہیر کی شرمناک اور نفرت انگیز مہم کے لہو تو ابھی خشک بھی نہ ہو پائے ہیں، جس کے پیچھے در پردہ پوری مغربی دنیا تھی، اسرائیل اور یہودیوں میں نسلی برتری کا خیال کوئی نئی بات نہیں، بلکہ بائبل کی عبارتوں اور قرآن و حدیث کی صراحتوں سے ان کا یہ مزاج و مذاق پوری طرح واضح ہے، مغربی دنیا اگر اس نسل پرست قوم کی پشت پر ہے تو چنداں باعث تعجب نہیں، کہ نسل پرستی تو مغرب کی تاریخ رہی ہے، یہودیوں کے علاوہ دنیا کی سب سے بدترین نسل پرست قوم ہندوستان کے برہمن رہے ہیں، جو کئی ہزار سال سے ایک بہت بڑے طبقہ کو گویا اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں، اور اس ملک کی تہذیب و ثقافت پر ان کی زیادتی کے نقوش اس درجہ نمایاں ہیں کہ جنہیں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت یہودیت اور برہمنیت نسل پرستی کا دوسرا نام ہے، اور اسی لئے ان دونوں کی قربت روز افزوں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا کو نسل پرستی کی لعنت سے نجات پانا ہے اور اس کائنات کو انسانی وحدت کے نغمہ سے معمور کرنا ہے تو اسے رحمت عالم محمد ﷺ کے دامن میں آنا اور اسلامی تعلیمات کو فکر و نظر کا سرمایہ بنانا ہوگا۔ جس نے انسانی وحدت کا انقلابی تصور انسانیت کو دیا، جس نے عزت و شرافت کے مصنوعی اور کھوٹے معیار کو توڑا، اور جس نے بتایا کہ اصل میں نسل انسانی کا ایک ہی شجرۂ طوبیٰ ہے اور اس سے پھوٹنے والی شاخیں جو الگ الگ ناموں سے موسوم ہوتی ہیں، یہ محض تعارف کا ذریعہ ہیں نہ کہ تفاخر کا۔

{ ۷؍ دسمبر ۲۰۰۱ء }

گناہ پر فخر

قرآن مجید نے مختلف انسانی گروہوں کے مزاج اور ان کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک کے بارے میں اس کی دکھتی ہوئی نبض پر انگلی رکھ دی ہے۔ اس میں مشرکین کا ذکر بھی ہے، یہودیوں کا بھی، عیسائیوں کا بھی، اور منافقین کا بھی، دعوت حق کے بارے میں کس کا کیا رد عمل ہے؟ اور زندگی کے مسائل کے بارے میں کس کے سوچنے کا کیا انداز ہے؟ قرآن نے اس کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اعراب یعنی دیہاتیوں کا جو مزاج قرآن نے بتایا ہے، آج بھی شہری ثقافت سے محروم دیہات کے لوگوں میں پوری طرح وہ کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہودیوں میں زندگی کی بے پناہ چاہت اور موت سے بے حد خوف کی جو نفسیات بیان کی گئی ہے، اسرائیل اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ ہر دور میں ایک ایسا گروہ موجود رہا ہے، جس کے ظاہر اور باطن میں ایسا فاصلہ ہوتا ہے جیسے دریا کے دو کنارے، اور جن کی زبان دل کی رفاقت سے محروم ہوتی ہے۔ اسی گروہ کو قرآن "منافق" سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کی مدنی سورتوں میں ان منافقین کی ریشہ دوانی اور بزدلی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اتنا مکمل اور بھرپور ہے کہ اس سے بہتر اس گروہ کی تصویر نہیں کھینچی جاسکتی۔

اسی طرح قرآن نے ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو دیدہ و دانستہ سچائی کی مخالفت پر پوری طاقت کے ساتھ کمربستہ رہتا ہے۔ اس کی کیفیت ایسی ہے کہ گویا اس کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو، جس کے کان مہر بند کر دیے گئے ہوں، جس کی آنکھوں پر جھوٹ کا تانا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے کہ سچائی اسے بالکل نظر نہیں آتی۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ

علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوۃ (البقرہ ۷) یعنی ان کے سینے میں دھڑکنے والا گوشت کا ٹکڑا ہی نہ ہو، ہے لیکن سمجھنے سے محروم، کان نام کا عضو ان کے پاس بھی ہے لیکن حقائق کو سمجھنے سے قاصر، آنکھیاں ان کے حلقہ چشم میں بھی موجود لیکن سچائی کو دیکھنے سے قاصر: لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا ولہم آذان لا یسمعون بہا

قرآن کی ان تعبیرات کو اگر ایک فقرہ میں سمیٹا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس گروہ کے پاس اعضاء جسم تو ہوتے ہیں، لیکن یہ ضمیر سے محروم ہوتا ہے۔ جیسے دل کے مرجانے کے بعد جسم ایک لاشہ اور زمین کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے، اسی طرح ضمیر کی موت انسان کے اندر چھپی ہوئی جوہر انسانیت کو زندگی سے محروم کر دیتا ہے اور اخلاق و تمدن کی دنیا کیلئے اس کا وجود ایک بار گراں بن جاتا ہے، جیسے مردار جسم انسان کے لئے زہر کی ٹوکری ہے، اسی طرح بے ضمیر اور مردہ ضمیر انسان کی آدمیت کے لئے زہر کا پیالہ ہے، وہ جس منہ سے لگے اسے بھی جوہر انسانی سے محروم کر دیتا ہے، اور ایک ایسے جسد کو وجود میں لاتا ہے، جو انسانی شکل و صورت کا درندہ ہوتا ہے نہ کہ انسان۔

انسان خطاؤں کا مجموعہ ہے، انسانی ضمیر انسان کو اس کی خطاؤں اور غلطیوں پر متنبہ کرتا رہتا ہے، وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، لیکن اس کی چوٹ بھی محسوس کرتا ہے، وہ گرتا ہے، لیکن گر کر اٹھتا ہے، اور اپنے گرد آلود جسم کو صاف ستھرا بھی کرتا ہے، اگر کوئی شخص غلطی پر غلطی کرتا جائے، لیکن اسے اپنی غلطی پر پشیمانی تک نہ ہو، ٹھوکریں کھائے لیکن اتنا بے حس ہو کہ چوٹ کو بھول بھی جائے، بار بار گرے، لیکن اپنے گرد آلود دامن کو بے داغ اور بے غبار تصور کرے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے ضمیر میں کوئی رمق حیات باقی نہیں رہ گئی ہے، اس کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، وہ انسانیت کے لئے ایک بوجھ ہے، وہ ایک زندہ لاش ہے، جس کا تعفن صحت مند اور باضمیر انسانوں کے لئے سراسر نقصان دہ اور مضر ہے۔

گجرات کے بدنام زمانہ اور بقول وزیر اعلیٰ بنگال جناب بدھا دیب سب سے زیادہ بے شرم "چیف منسٹر نریندر مودی" نے انسانیت کے قتل اور غارت گری کا جو عریاں

بعض مجرمین جرائم میں ایسے ہیں، ان پر انہیں اتنی مسرت اور عزت کا احساس ہے کہ اس کارنامہ پر وہ فخر کرتے ہیں (کہ رواں عصر) انتقال ہے، ہیں گویا قتل انسانیت پر فخر کیا جارہا ہے، اس سے زیادہ باعث شرم کوئی اور امر ہوسکتا ہے؟ چور کو اپنی چوری پر، راہزن کو اپنی راہزنی پر اور قاتل کو اپنے جور وظلم پر بھی پچھتاوا ہوتا ہے۔ بہت سے مجرمین اپنے ضمیر کی ملامت کی وجہ سے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں، اور بہت سے شدت احساس کی وجہ سے خودکشی کر گذرتے ہیں، یا ان کا دماغی توازن متاثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسا شخص ہے جس کے سینے میں دل نہیں شاید پتھر کی سل ہے۔ جو احساس سے خالی اور حیا سے عاری ہے!

دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اپنی کسی بات پر خوش ہونا کبر ہے۔ جو سب سے بڑا اخلاقی مرض اور تمام روحانی بیماریوں کی جڑ ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھے بغیر اپنے اوپر ہونے والی کسی نعمت کا اظہار فخر ہے، لیکن اکثر فخر کی سرحدیں کبر سے جا ملتی ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ جب اپنی کسی منقبت کو بیان فرماتے (اور رسول اپنے درجہ ومقام کو واضح کرنے پر اللہ کی طرف سے مامور ہوتا ہے) تو ساتھ ہی ساتھ فخر کی نفی بھی فرماتے، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں: انا سید ولد آدم ولا فخر، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے آباء واجداد پر فخر کرنے کو ناپسند فرمایا ہے اور حج کے موقع سے جو لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، ان کو منع کر کے اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کا مزاج پیدا فرمایا، یہی اسلام کی تعلیم اور اسکا مزاج ہے، کوئی اچھی بات ہو تو اس کا سر خدا کے سامنے جھک جائے اور کوئی غلطی ہو تب بھی جبین ندامت خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو اور مخلوق کے سامنے زبان پر کلمۂ اعتراف ہو، یہی ایک اچھے انسان کی پہچان ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے کیا خوب فرمایا کہ ہر انسان خطا کا مرتکب ہوتا ہے، لیکن بہترین خطا کار وہ ہے جس کو اپنی غلطی پر پشیمانی اور شرمندگی ہو: کل بنی آدم خطاء و خیر الخطائین التوابون، یہ اعتراف ہی انسان اور شیطان کے درمیان اصل حد امتیاز ہے، سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ذرا سی چوک ہوئی تو وہ ندامت سے پانی پانی ہوگئے، اور اپنی لغزش سے کہیں بڑھ کر توبہ فرمائی، اور جب شیطان نے اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی کی تو بجائے ندم

اور پشیمان ہونے کے اس نے تکبر اور فخر کا راستہ اختیار کیا اور اسی چیز نے اس کو ہمیشہ کے لئے خالق کائنات کی نظر میں مجرم و مغضوب اور مطرود بنا دیا، پس برائی اور گناہ کاری پر ندامت اور اعتراف کے بجائے فخر "ابلیسی صفت" ہے، اور کسی شخص میں اس کیفیت کا پایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ روح آدمیت سے محروم اور مزاج شیطانی سے قریب ہو چکا ہے۔

مسلمانوں کو بھی سوچنا چاہئے کہ انہوں نے آج فخر و تعلّی کے جو بت تراش لئے ہیں، کیا یہ واقعی متاعِ فخر و اعزاز ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دولت و ثروت آج ہمارے سماج میں وجہ افتخار بن چکا ہے، پرشکوہ دعوتوں پر فخر کیا جاتا ہے، ہماری خواتین کے لئے زیورات کی بھاری مقدار وجہ افتخار ہے، نکاح کی تقریبات میں جس قدر دولت کی نمائش مسلمانوں کے یہاں ہوتی ہے اور کھانے پینے کی دعوتوں میں ہمارے یہاں جس تنوع، اسراف اور فضول خرچی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور پھر اسے باعث فخر سمجھا جاتا ہے، یہ سب غلطی پر اعتراف کے بجائے غلطی پر افتخار کی مثالیں ہیں، رشوت اور کرپشن کس قدر لائق شرم فعل ہے، لیکن صورت حال یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس آمدنی کو بالائی آمدنی اور اوپری آمدنی کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں۔ ماں باپ کو اپنے بال بچوں کی ایسی آمدنی پر شرمندگی اور خفت کے بجائے مسرت اور عجب کا احساس ہوتا ہے، اور جو شخص حلال پر قناعت کی وجہ سے سادہ زندگی گذارتا ہو، اسے بے وقوف اور بے عقل باور کیا جاتا ہے۔

سودی اداروں کی ملازمت ناجائز ہے، فلمی اداکاری ناجائز ہے، لیکن لوگ اپنا اور اپنے عزیزوں کا فخریہ ذکر کرتے ہیں، کہ یہ فلاں سودی ادارہ میں فلاں عہدہ پر ہیں۔ فلمی اداکاروں سے ملاقات کو اعزاز تصور کیا جاتا ہے، مسلمان تنظیمیں انہیں اپنے جلسوں میں عزت کے احساس کے ساتھ مدعو کرتی ہیں، اور ان کی شرکت کی تشہیر کرتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سب گناہ اور گناہ گاروں پر فخر کرنے ہی کی صورتیں ہیں، مسلمانوں میں شاید ابھی یہ بلا نہیں آئی، لیکن دوسری قوموں میں مغرب کے زیر اثر حسن کی نمائش کا جو ذوق چل پڑا ہے، اس نے سماج کو اتنا بے حیا کر دیا ہے کہ والدین اپنی لڑکیوں کے حسن کے عریاں ہونے پر خوشی میں ناچتے اور رقص کرتے ہیں، "حسن بے پردہ" تو وجہ عار تھا، لیکن مردوں کی نگاہ

ہوس سے عورتوں کا استعمال کرنے کے لئے اسے جائز قرار دیا۔

بعض لوگ بدزبان اور بدمزاج ہوتے ہیں، معمولی معمولی باتوں پر بڑوں اور اپنے بزرگوں اور ساتھیوں کے بے عزتی کرنے والوں پر حرف گیری کا مزاج رکھتے ہیں جس کو بھی جی میں آیا کہہ دیا، بلکہ صحیح ہوا تو دشنام طرازی سے بھی نہیں چوکے۔ پھر اسے فخریہ بیان کرتے ہیں، اسے اپنا کمال سمجھتے ہیں، یا اسے صاف گوئی کا عنوان دیتے ہیں، حالانکہ صاف گوئی کے معنی دوسروں پر طنز و تعریض یا تحقیر نہیں۔ اور ایسی ہی نازیبا باتوں پر فخر بھی کرتے ہیں، کہ ہم نے فلاں کو کیسی کھری کھری سنائی اور فلاں شخص کو برسرِ عام ایسا اور ویسا کہا، حالانکہ یہ سب قابلِ شرم باتیں ہیں نہ کہ قابلِ فخر۔ مومن پر اس کو شرمانا چاہئے نہ کہ اترانا۔

غرض گناہ پر شرمانے، لجانے اور معافی خواہ ہونے کے بجائے فخر کرنے، اترانے اور اپنی عزت محسوس کرنے کا ایک مزاج سا بن گیا ہے۔ یہ سماج کے بے ضمیر ہونے اور اس کے جوہرِ انسانیت کے مردہ ہو جانے کی ایک علامت ہے اور کیوں نہ ہو کہ حکمرانوں کا اثر رعایا پر پڑتا ہی ہے۔ الناس علی دین ملوکھم، جس سماج میں گناہ پر فخر ہونے لگے اور غلطی پر ندامت ہونے کے بجائے وہ اسے حق قرار دے، وہاں برائیاں پنپتی ہی رہیں گی، اور جور و ظلم میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا، کیوں کہ جب گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھا جائے تو گناہ پر ٹوکنے والی زبانیں، اور گناہ سے روکنے والے ہاتھ کہاں رہیں گے؟ جو لوگ خدا پر اور آخرت پر ایمان کی دولت رکھتے ہوں ان سے گناہ پر فخر کرنے کی بات کیا تصور کی جائے، افسوس تو اپنے ان بھائیوں سے ہے جو دینِ حق کے حامل و ترجمان ہونے کے باوجود گناہ کے بارے میں اتنے جری ہیں کہ انہوں نے نیکی و بدی کی اصطلاحیں ہی بدل دی ہیں اور برائیوں کو نیکی کا نام دے دیا ہے!

فسادات کا سبق

گجرات کے حالیہ فساد نے ایک بار پھر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ہمارے ملک کے ایک طبقہ نے اب تک ہندوستان کے ہمہ مذہبی اور ہمہ تہذیبی کردار کو قبول نہیں کیا ہے، جو لوگ اس ملک میں اچھوتوں کے بھارتیہ کرن کا نام لیتے ہیں اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے قومی دھارے میں شامل ہونے کی خواہش کرتے ہیں، انھیں چاہئے کہ وہ اقلیتوں کو نصیحت دینے کے بجائے اکثریتی طبقہ میں پائے جانے والے فرقہ پرست عناصر کی صحیح تربیت کریں اور ان کو انسانی زندگی کی اہمیت کا سبق پڑھائیں۔

گجرات کے حالیہ فساد میں غیر جانب دار ذرائع کا خیال ہے کہ دو ہزار سے زیادہ مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، ان میں بڑی تعداد خواتین اور کمزور و معصوم بچوں کی ہے، انسان کو مارنے کا شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ اور بے رحمانہ طریقہ اس کو زندہ جلا دینا ہے، گجرات میں زیادہ تر یہی سفاکانہ طریقہ اختیار کیا گیا، حکومت کے حفاظتی عملوں نے دن کی روشنی میں کئے جانے والے ان بہیمانہ جرائم پر نہ صرف خاموشی اختیار کی، بلکہ بلوائیوں کی مدد بھی کی اور متاثرہ لوگوں کے ساتھ ستم یہ ہے کہ ان کی فریاد بھی صحیح طور پر درج نہیں کی گئی، گذشتہ چند سالوں میں یہ ریاست کئی بھیانک فسادات سے گذری ہے، ہر فساد نے پہلے فساد کے ظلم و جور کا ریکارڈ توڑا ہے اور درندگی و سفاکی اور بربریت سے سبقت حاصل کی ہے، جہاں اس ریاست میں بار بار مسلم کش فسادات ہوتے ہیں، وہاں قدرت نے بار بار انھیں جھنجھوڑا بھی ہے، زلزلہ کے حادثہ کو ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے، اس سے پہلے ایک گم گشتہ بیماری پلیگ نے بھی اس ریاست کو اپنے پنجۂ تقاضا میں

کر رہ کر تقویت ملتی رہتی ہے، تیز ہجرت کے نتیجہ میں بدترین قسم کا نفاق ان کے علاوہ ہے، کیوں کہ جو خود پر صافی ہوئی ان کے حق میں ظلم اور جور سے نہ وہ کوئی چیز ناپسندیدہ نہیں، یہ مغلوب قدرت نے دست انتقام کے ہاتھوں یہاں کیا کچھ ہوتے دیکھا ہے!

اس قسم کی کئی باتیں قابل توجہ ہیں، ایک بات یہ ہے کہ جہاں دینی اسپرٹ کے کمزوروں اور مفسدوں نے ظلم و جور کی فرقہ وارانہ آرمی اور انتہا پسندی شامل نہیں ہے، یہاں ہندوستانی معاشرہ بالکل ہی ہمہ گیر معاشرتی کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ مسلم آبادی میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اور فساد کے دوران مسلمانوں نے ان کے ساتھ بہتر اخلاق کا سلوک کیا ہو ضرورت ہے کہ ان کے تاثرات لکھے جائیں؟ آڈیو اور ویڈیو کے ذریعہ ان تاثرات کو محفوظ کیا جائے، اور غیر مسلم بھائیوں تک انہیں پہنچایا جائے، اگر لٹریچر اور پمفلٹ بنایا جائے ان تاثرات کے لئے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے کیوں کہ آپ بیتی اور خود گذشت کا اثر انسان پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو مختلف علاقوں میں اپنی آبادی کے جزیرے بنانا چاہئے، جن دیہات اور قریب بستیوں میں چند مسلمان گھر آباد ہیں یا شہر کے جن آخری محلے میں چند مسلمان رہتے ہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات میں نہ صرف ان کی جان و مال اور عزت و آبرو بلکہ ان کا دین و ایمان بھی خطرہ میں رہتا ہے، فسادات میں اس طرح روند دیئے جاتے ہیں جیسے ہاتھی کی زد میں چیونٹیاں آ جائیں، معاشی اعتبار سے بھی ان کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں، غیر مسلم تہذیب و ثقافت بھی انہیں متاثر کرتی چلی جاتی ہے، یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے علاقوں میں بسنے والے مسلمان اپنی شکل و صورت، بات چیت کے تہذیب، چال چلن اور رکھ رکھاؤ میں ذرا بھی پہچانے نہیں جاتے، بعض علاقوں میں تو ان کے ناموں میں بھی مسلمانیت کی جھلک باقی نہیں رہی، اور ایسا بھی ہوا کہ غلط ماحول اور مغلوب ثقافت کی وجہ سے یہ لوگ ان کے تہوار وغیرہ میں بے تکلف اور پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور پوجا پاٹ وغیرہ میں بھی انہیں کوئی عار نہیں ہوتی، گویا آہستہ آہستہ وہ دین و ایمان سے بھی

محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

اس ساری صورت حال کا ایک اہم سبب معاشرہ کا اختلاط ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی سے الگ اپنی آبادیاں بنانے کا حکم دیا تھا۔ خثعم کے کچھ لوگ غلط فہمی میں مارے گئے تو آپ ﷺ نے ان کے سلسلے میں فرمایا: جو مسلمان کسی مشرک کے ساتھ بود و باش رکھتا ہو، میں اس سے بری ہوں "انا بری من کل مسلم مع مشرک" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں میں سے ایک کی آگ دوسری طرف نظر نہیں آنی چاہئے۔ "الا لا تراءى ناراهما" (نسائی-۴۷۷۴) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ سیوطی نے "نہایہ" کے حوالے سے لکھا ہے:

"مسلمان پر یہ بات لازم و واجب ہے کہ اس کا گھر مشرک کے گھر سے دور ہو، ایسی جگہ نہ رہا جائے کہ جب وہاں آگ سلگائے تو مشرک کو اپنے گھر سے نظر آئے"

{شرح نسائی، مجموعہ السنن وشروحہا: ۱۹، ۳۷}

حضرت سمرۃ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے امن پسند افراد کی بھی تھی جنہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو اپنے یہاں جگہ دی اور ان کی جانیں بچائی، بلکہ انہی اس ہمدردی اور انسانیت کی وجہ سے وہ فرقہ پرستوں کی لعنت و ملامت، دھمکیوں اور سنگ باریوں کا نشانہ بھی بنے۔ اس سے امید کی ایک کرن نظر آتی ہے کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تمام ہندو خونخواری اور آدم کشی پر اتر آتے ہیں بلکہ یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے، عام ہندوستانی قتل و غارت گری کو ناپسند کرتا ہے اور انسانیت، بھائی چارہ اور رواداری پر یقین رکھتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ پرست میڈیا جو زہر افشانی کر رہا ہے، ہم ان پروپیگنڈوں کے زہر سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں انہیں حقائق سے آگاہ کریں۔ گروپ میٹنگ، ہندو مسلم مخلوط اجتماعات اور شخصی ملاقاتوں کے ذریعہ ہم برادران وطن تک پہونچیں اور انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔ مسلمان اس کام کو مہم کے طور پر منصوبہ بند طریقے سے پورے ملک میں انجام دیں، مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈوں کی

جو جنگ جیتنے کی فنی صلاحیت بہت زیادہ رکھتا ہوگا۔

اس واقعہ کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت نہ تھی اور یہاں مسلمان معدود تھے۔ جب انہوں نے اس علاقہ کو خالی کرنے کے بعد اکثریت سے ٹیکس نہیں لیا بلکہ اس سے انکار کر دیا اور ذمیوں نے اپنے معاملات خود سنبھالے۔ یہ اخلاق کا کمال ہے، یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ اس سے مسلمانوں کی اخلاقی برتری اور کردار کی بلندی ثابت ہوتی ہے۔ اپنے وقت کی عظیم طاقت سے زیادہ نمایاں کرتا ہے کہ حق پر ہونے کے سبب اخلاق اور فولاد کی طرح ان کی طاقت سے مقابلہ کرتے تھے: یعنی اخلاق و کردار کی طاقت وہ ہتھیار ہے جس کی قوت سے دشمنوں کے قلوب کو فتح کیا ہے، جنگ جیتنا ہی فتح نہیں، بلکہ دلوں اور ضمیر بدلیں گی۔ ان اخلاق ہی کا اثر دیرپا رہتا ہے، جب وقت گزرتا ہے تو جنگ کامیابی کی بنیاد بن جاتی ہے اور قوموں کی تہذیب کا باعث بن جاتی ہے۔

لیکن اقلیت ذمیوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ یہ تیسرا پہلو ہے جو بہت اہم ہے اور مسلمانوں کے عروج و زوال کا سبب ہے کہ ان کو کم نہ کرنا چاہئے۔ اسلامی جنگ کے اصولوں کی ابتدائی روشنی میں عطا کیا ہے۔ اس کی بڑی ہر جگہ مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے، اسی میں دوسرے کی عزت ہوگی اور تمام مسلمانوں کی نصرت میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے محفوظ رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مؤمن وہ ہے جس کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ رہیں۔ آپ ﷺ نے غیر مسلم ہمسایوں کے حقوق ادا کرنے کی وہ تاکید فرمائی جو مسلمانوں کی جان و مال کی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیمات اور ان کی حقیقی روح کی عکاسی نہ کیا گیا۔ جب کہ اسلام ایک ہمدرد و رحم دل مذہب ہے، جو دوسرے اہل مذہب کے ساتھ مخالفت کا نہیں کسی مشرک کے ساتھ رہنے سے روکتا ہے: "جامع المشرك وسكن معه فانه مثله" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۷۸۷) علامہ خطابی نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حکم ان کے لئے کافروں کے ساتھ ان کے علاقہ میں رہنا درست نہیں: "لا يجوز لمسلم ان يساكن الكافر في بلادهم" (معالم السنن، ۲/۲۷۲)

یہاں حدیث کا منشاء یہی ہے کہ مسلمانوں کے محلے اور آبادیاں علیحدہ ہونے چاہئیں، علیحدہ آبادی میں ان کی جان کی بھی حفاظت ہے جیسا کہ ظاہر ہے، مال و کاروبار کی بھی حفاظت ہے، اس آبادی میں وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ زندگی گذار سکیں گے، اور اجنبی ثقافت سے اپنے آپ کو باسانی بچا سکیں گے، جو اسلامی معاشرت کا بنیادی مزاج ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کی مشابہت اختیار کرنے کو منع فرمایا ہے، ایسی آبادیوں میں دینی تحریکات بھی اپنے کاموں کو بہتر طور پر انجام دے پاتی ہیں اور اس کی وجہ سے مذہبی وابستگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کے مخصوص ماحول میں مسلمانوں کی علیحدہ آبادی سے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی مفادات بھی متعلق ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاستی اسمبلی نیز پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے ان کی نمائندگی بہت ہی کم ہے، مثلاً خود گورنمنٹ کے اعداد و شمار کے مطابق بہار اور یوپی میں مسلم آبادی کا تناسب پندرہ فیصد ہے، اس لحاظ سے بہار میں ان کے ارکان اسمبلی پچاس کے قریب اور یوپی میں ساٹھ سے زائد ہونے چاہئیں، اسی طرح آندھرا پردیش میں نو فیصد کے قریب مسلم آبادی تسلیم کی گئی ہے، اس لحاظ سے پچیس سے زیادہ مسلمان ارکان اسمبلی ہونے چاہئیں، لیکن عملاً نمائندگی کا تناسب اس سے بہت کم ہے، کیرالا میں مسلم آبادی کا تناسب بہار و یوپی ہی سے قریب ہے، لیکن وہاں مسلمان نمائندوں کی تعداد ہمیشہ فیصلہ کن ہوتی ہے اور ان کے تعاون کے بغیر کوئی سرکار بن نہیں پاتی، اس کی بنیادی وجہ کیرالا میں مخصوص علاقوں میں مسلمان آبادی کا ارتکاز اور دوسرے علاقوں میں مسلم آبادی کا بکھراؤ ہے، مسلمان اگر مختلف علاقوں میں اپنی آبادی کے جزیرے قائم کرلیں اور بتدریج وہاں اپنی آبادی کو جمع کرلیں تو مستقبل میں ایک سیاسی طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں کہ وہی اس ملک کے بادشاہ گر ہوں گے اور انہی کے قلم سے حکمرانوں کی تقدیر لکھی جائے گی۔

معاشی اعتبار سے بھی آبادی کا ارتکاز ایک مفید عمل ہوگا، کیوں کہ اس آبادی کی ضروریات کے لئے جن دکانوں اور چھوٹی صنعتوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ مسلمانوں کے

ہاتھ میں ہوں گے، آج صورت حال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے صنعت و تجارت میں اپنے قدم آگے بڑھائے تو فرقہ پرست عناصر انہیں چن چن کر نشانہ بناتے ہیں اور بعض متعصب صنعت کار بھی نہیں چاہتے کہ انہیں ابھرنے دیں، جب مسلمانوں کی اپنی محفوظ آبادیاں ہوں گی تو آپ وہاں کل کارخانے بھی تعمیر کرسکیں گے، اور آپ کو اپنی تجارت کے لئے ایک مناسب مارکیٹ بھی ہاتھ آجائے گا، اس لئے یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے باشعور اور معاشی اعتبار سے مستحکم طبقے اس حقیقت کو محسوس کریں، وہ دور دراز بسنے والے غریب بھائیوں کو اپنے سینے سے لگائیں، انہیں مناسب قیمت پر اور ادائے گی کی مہلت کے ساتھ زمینیں فراہم کریں اور مسلمان نسبتاً زیادہ بسائیں کہ اس میں نہ صرف ان کی حفاظت ہے بلکہ وہ آپ کی حفاظت کے لئے بھی بہترین ڈھال کا کام کریں گے۔

(۲۰۰۴ء)

مردم سوزی

انسانیت سوزی کا بدترین نمونہ

تو اے مظلومانِ گجرات! اور صد آہ اے ستم زدگانِ دنیائے بے ثبات! جو مظالم تم بے گناہوں پر ڈھائے جا رہے ہیں وہ کیوں کر ان کا بیان ہو؟ قلم کا جگر شق ہو جائے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، کہ اگر پتھروں کو دیکھنے کی قوت میسر ہوتی تو شاید وہ بھی اس بربریت کو دیکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے اور سمندر کو دیکھنے والی آنکھیں نصیب ہوتیں تو شاید ان کے بھی سوتے خشک ہو جاتے۔ ایسا جور و جفا جنہیں دیکھ کر درندے بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں، وہ ایسا ظلم و ستم جنہیں سن کر جہنم کے ستم شعار لوگوں کی روح بھی وجد میں آ جائے، زبان، قلم کیا بیان کر سکے۔ ان مظالم کے شایانِ شان مرثیہ کہنے والی آنکھوں کے حقیر اور مختصر سے آنسو ان انسانیت سوزی پر کیا قربان ہوں، اگر قلب و جگر کی آنکھیں ہوتیں اور وہ لازم و ملزوم ہوتے تو خونِ جگر کے آنسو بہا کر سکتیں تو شاید کچھ اس غم کو بیان ہو سکتا ــــــ صد ہزار رحمتیں ہوں تمہاری جانِ پرسوز اور روحِ شہادت شعار پر، جو تم بے گناہی کی سزا پا رہے ہو اور جنہیں صرف اس لئے آتشِ نمرود میں جھونکا جا رہا ہے کہ تمہاری صفت وارثی پر لگی ہے کہ وہ خود تو آزادی کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور دین برحق کا علم تھامے ہوئے ہیں؟ ــــــ تم پر خدا کی بے پناہ رحمتیں ہوں، اور تمہارے ستم گروں پر خدا کی لعنت ہو۔"

کتنی عجیب بات ہے کہ جو لوگ اہنسا اور عدم تشدد کی بات کرتے ہیں، جو انسانی ضرورت کے لئے جانوروں کو ذبح کرنے کو بھی منع کرتے ہیں، ان کا قتل عام پوری دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ خون خواری وحشی آشنائی سے ان کو لطف آتا ہے۔ مردم سوزی کا

تماشائیوں کی آنکھوں کو روشن کرتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ غلیظ پیالہ میں بھر جانے کی تاکید ہے۔ جہاں تک پہنچے اتنا ہی شودر کی موت بجلی گرتی ہے۔ چنانچہ منوسمرتی میں ذات والوں کے بارے میں شودر کے لئے جو قوانین مقرر کیا تھا ان میں دو دفعات اس طرح ہیں:

> اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لے کر توہین کرے تو دس انگلی لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کر کے اس کے حلق میں اتار دی جائے۔
>
> (۲۷۱:۸)
>
> اگر وہ غرور کی وجہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجا اس کے منہ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے۔ (۲۷۲:۸)

مرتد کو سزا دینے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اسلام سے پہلے خاص طور پر ان لوگوں کو سزا دی جاتی تھی، جو اپنے دینی مذہب سے منحرف ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں دو واقعات کا ذکر خود قرآن میں بھی ملتا ہے۔ ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور دوسرے اصحاب الاخدود (خندق والوں) کا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں پیدا ہوئے تھے، جس میں ستاروں کی پوجا کی جاتی تھی، بتوں کی پوجا عام تھی، اور بڑے بڑے بت تراش کر رکھے ہوئے تھے۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بت پرست بھی تھے اور چاند، سورج اور ستاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے ایک مباحثہ بھی ہوا۔ ان میں بادشاہ پرستی کا مرض بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں بادشاہ وقت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ہونے والے مکالمہ کو نقل کیا ہے۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت ہی بردبار، نرم خو اور شفیق انسان تھے، اور انہوں نے ہر طرح اپنی قوم کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا چاہا، جس میں بادشاہ وقت بھی تھا، لیکن وہ آپ کی ان خیر خواہانہ کوششوں کو خاطر میں نہ لائے، اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے، بالآخر حکومت اور عوام نے مل کر یہ طے کیا اور فیصلہ کیا کہ آپ کو نذر آتش کر دیا جائے، اور جب دونوں کی بحث کی باقی نہ رہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا، اور اس طرح لا تعداد

کے رضامند ہو کر جلنے کی اپنے رب سے یہ بھی درخواست نقل کی گئی ہے کہ اس آگ سے بچانے کا سروسامان کیا جائے، کیوں کہ خدا کی راہ میں اپنے گوشت و پوست کو جلانے اور اپنی ہڈیوں کو کوئلہ بنانے سے بڑھ کر کسی مومن و باشعور کے لئے اور کیا عمل ہو سکتا ہے!

قرآن مجید میں دوسرا واقعہ "اصحاب الاخدود" (خندق والوں) کا آیا ہے، (البروج: آیت نمبر ۴-۱۰) — یہ حق پرست عیسائی تھے، جو دینِ حق پر ایمان رکھتے تھے، اس کی پاداش میں ان کے لئے گہری خندقیں کھودی گئیں اور انھیں آگ سے پاٹ دیا گیا، پھر جو اہلِ ایمان تھے انھیں ایک ایک کر کے اس خندق میں پھینکا جاتا، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتے، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں اس طرح کے کئی واقعات متعدد صحابہؓ سے منقول ہیں، اسی لئے اہلِ علم کا خیال ہے کہ ایسے واقعات ایک سے زیادہ دفعہ پیش آئے ہیں، تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض واقعات میں بیس سے چالیس ہزار افراد اسی طرح زندہ نذرِ آتش کر دیئے گئے۔

خود عیسائیوں میں جو مذہبی جھگڑے کھڑے ہوئے اور مختلف مذہبی فرقوں کا وجود ہوا تو جو فرقہ طاقت حاصل کر لیتا وہ اپنے مخالفین کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے مذہبی عدالتیں قائم کرتا، قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے جان ڈیون پورٹ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مذہبی عدالت کے احکام سے ہلاک کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہونچتی ہے (رحمۃ للعالمین: ۲/۲۵۱) عام طور پر یہ سزائے قتل اسی طرح جاری ہوتی تھی کہ مقدمہ کی معمولی سماعت کے بعد ملزم کو زندہ جلا دیا جاتا تھا، صرف اسپین میں جو عیسائی مخالف مذہبی عدالتوں کے حکم پر زندہ نذرِ آتش کر دیئے گئے ان کی تعداد تیس ہزار سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے، پروفیسر لیکی نے "تاریخ اخلاق یورپ" میں ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں۔

ارتداد اختیار کرنے والوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متبعین پر بھی جب لوگ قابو پا جاتے تو ان کو نذرِ آتش کرنے میں انھیں خوب لطف آتا، صلیبی جنگوں کے درمیان جب ایک مرحلہ میں بیت المقدس پر عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ستر ہزار مسلمانوں کو بشمول بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے شہید کیا ہی، لیکن یہودیوں کو ان کی مقدس قربان گاہ میں جمع کر کے ایک ساتھ نذرِ آتش کر دیا ——— اسلام سے پہلے خود عربوں میں بھی انسان سوزی کی

بہادری خوبی جانی تھی، منذر بن امرء القیس جنگ اُوارہ میں قبیلہ بنو شیبان پر غالب ہوا تو اس نے ان کی عورتوں کو زندہ جلانا شروع کر دیا، اور بعض لوگوں کی منت سماجت پر بڑی مشکل سے اس سے باز آیا، عمرو بن منذر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نذر مانی تھی کہ بنو دارم پر غلبہ پانے کے بعد اس کے سو آدمیوں کو زندہ جلا دوں گا، چنانچہ وہ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوا، قبیلہ کے ننانوے افراد ہاتھ آ گئے، اس نے ان سب کو نذر آتش کر دیا، ایک شخص کی کمی باقی رہ گئی، بدقسمتی سے اس وقت ایک دوسرے قبیلہ کا ایک شخص وہاں سے گذر رہا تھا، اس نے جلتے ہوئے گوشت کی بو محسوس کی تو آگے بڑھ کر جھانک کر دیکھا کہ شاید کھانا پک رہا ہے، عمرو نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کو بھی آگ میں جھونک دیا تا کہ اس کی نذر کی تکمیل ہو جائے، زمانۂ جاہلیت کے شعراء نے ان قاتلین انسانیت کی بہادری اور شجاعت کے طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے: المحبر ق ۱۱ ص ۱۹۹-۲۰۰)

ہندوستان میں انسان سوزی کی ایک شرمناک رسم شوہر سے عشق اور محبت کے عنوان سے بھی پائی جاتی تھی، جو عورتیں بیوہ ہو جاتی تھیں، ایک تو انہیں دوسرے نکاح کی اجازت نہیں تھی، خواہ وہ کتنی ہی کم عمر ہوں، لیکن بیوہ عورتوں کے لئے مثالی طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دی جاتیں، اور اس کو "ستی" سے موسوم کیا جاتا، ایک تو ستی کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس کو باعث اجر و ثواب اور سبب سعادت قرار دیا جاتا، اس لئے عورتیں خود رضاکارانہ اس اندوہناک عمل کے لئے تیار ہو جاتیں، دوسرے بعض اوقات شوہر یا اس لڑکی کے خاندان والے بھی اسے اس غیر انسانی فعل پر مجبور کرتے، اور اس طرح آئے دن بے قصور بے گناہ عورتیں اس رسم کی بھینٹ چڑھا دی جاتیں۔

اسلام نے اس غیر انسانی حرکت کو ختم کرنے اور ایسے ظالمانہ طریقہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کی نتیجہ خیز کوشش کی، اسلام نے کہا کہ یقیناً بعض جرائم ایسے ہیں، جن پر قتل کی سزا دینا جرم کے سد باب کے لئے ضروری ہے، لیکن اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ جرم پوری طرح ثابت ہو جائے، اور وہ جرم واقعی اس درجہ کا ہو، دوسرے قتل بھی ایسے طریقہ پر ہو جو مقتول کو بہت زیادہ اذیت پہنچانے والا اور تکریم انسانیت کے پہلو کو مجروح نہ

کرنے والا نہ ہو۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر جانور کو ذبح کرو تو بہتر طریقہ پر کرو، اور کسی مجرم کو قتل کرنے کی نوبت آئے تو قتل میں بھی بہتر طریقہ اختیار کرو، اگر کوئی بالفعل فطرت انسان جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو جانور کو جلا دینے کا حکم ہے، کیوں کہ اگر وہ چلتا پھرتا رہے تو اس سے اس کا چرچا پھیلے گا اور جب کسی چیز کا چرچا ہونے لگتا ہے تو اس سے بھی اس چیز کا چلن بڑھ جاتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں بھی یہ حکم دیا گیا کہ اولاً اس کو ذبح کر دیا جائے پھر اس کے گوشت و پوست جلا دیئے جائیں۔

آپ ﷺ نے عین میدانِ جہاد میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کسی دشمن کو آگ میں جلانے کی سزا دی جائے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک مہم پر روانہ فرمایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم فلاں اور فلاں شخص کو پاؤ تو انہیں آگ میں جلا دینا، پھر جب ہم اپنی مہم پر روانہ ہونے لگے تو فرمایا کہ میں نے فلاں اور فلاں شخص کو جلا دینے کا حکم دیا تھا، لیکن آگ سے عذاب دینا صرف اللہ ہی کا حق ہے، اس لئے ایسا نہ کرنا، البتہ اگر وہ تمہارے ہاتھ آئیں تو انہیں قتل کر دینا: **ان النار لا یعذب بہا الا اللہ فان وجدتموھما فاقتلوھما** (بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر ۳۰۱۶) ــــ یہ بات متعدد روایتوں میں آئی ہے کہ آگ میں جلانے کی سزا دینا خدا ہی کے شایانِ شان ہے، کسی اور کو اس کا حق نہیں۔

اسلام میں کسی کو جلانے کی سزا نہیں دی جا سکتی، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور دوست ہو یا دشمن، نیز وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو، انسان تو کیا، جانوروں کو بھی جلانے کی ممانعت ہے، قرآن مجید میں پیغمبر خدا حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ میں چیونٹیوں کے جلانے کا ذکر آیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ممکن ہے پچھلی شریعتوں میں اس کی اجازت رہی ہو، لیکن شریعتِ اسلامی میں کسی حیوان کو بھی آگ میں جلانے کی سزا دینا درست نہیں (دیکھئے: احکام القرآن ۳: ۱۱۱۱) ــــ بلکہ بعض روایات میں جنگ کے موقع پر بلا وجہ سرسبز درختوں اور کھیتوں کو جلانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، گویا نباتات کو بھی بلا وجہ جلا کر نذرِ آتش کر دینا درست نہیں، چہ جائیکہ انسان اور حیوان، اسی لئے اسلامی تاریخ میں

شاید ہی ایسی کوئی مثال مل سکے کہ مسلمانوں نے اپنے مفتوحین کے ساتھ یہ سنگ دلانہ سلوک روا رکھا ہو۔

عجیب بات ہے کہ جو لوگ دوسروں کو دہشت گرد اور امن شکن قرار دیتے ہیں وہ خود انسانیت کے خلاف ایسے گھناؤنے جرم کا منصوبہ بند طریقہ پر ارتکاب کر رہے ہیں کہ درندے بھی ان کی درندگی پر شرمسار ہوں، اور آتشِ ظلم بھی ان کو دیکھ کر پانی پانی ہو جائے۔ — الٰہی! ان ننگِ انسانیت ظالموں کو ہدایت دے، اور اگر ان کے لئے ہدایت مقدر نہیں تو اس زمین پر اُنس و محبت کی جو بستی تو نے بسائی ہے، اسے ایسے جفا شعار لوگوں اور درندہ نما انسانوں سے پاک فرما دے!!

(۳ مئی ۲۰۰۲ء)

درندگی کی فتح

آج کل بہت سی ایسی الیکٹرانک مشینیں ہیں جن میں مشین کی اندرونی کیفیت کے اظہار کیلئے اسکرین لگے ہوئے ہیں۔ مشین میں کہیں سے بھی کوئی خرابی ہو تو فوراً اسکرین پر اس کا سگنل نمودار ہوتا ہے اور جان لیا جاتا ہے کہ مشین کے فلاں پرزہ میں خرابی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی شکل میں جو خوبصورت، مجسم، معتدل اور نازک مشین بنائی ہے اس میں بھی انسانی کیفیات کے اظہار کیلئے علامتی سگنل رکھے گئے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق انسان کی جسمانی کیفیات سے ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ بہت سی بیماریاں چہرہ، آنکھ، ہونٹ، زبان اور ناخنوں کی رنگت سے پہچانی جاتی ہیں۔ نابض کی حرکت کے ذریعہ ہیجان کا علم ہوتا ہے۔ یہ گویا خود انسانی جسم میں لگے ہوئے اسکرین ہیں جن کے ذریعہ انسان کی اندرونی جسمانی کیفیات کا علم ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی کیفیات کیلئے بھی قدرت کا ایک نظام ہے جسے سر کی آنکھوں سے دیکھا تو نہیں جا سکتا لیکن محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انسان کوئی بھلائی کرے تو اس میں خوشی کا احساس ہوتا ہے، کوئی برائی کر گذرے تو خواہ وقتی سی لذت اور سرمستی کا باعث ہو لیکن بعد میں پچھتاوے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، ندامت و شرمندگی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو شرمسار محسوس کرتا ہے۔ یہ وہی اخلاقیات کا اسکرین ہے جو آدمی کو اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں حقیقی صورتحال سے آگاہ کرتا ہے۔

انسان کی اسی قوت احساس کو "ضمیر" کہا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کئی ارشادات میں انسان کی اس فطری استعداد کی طرف اشارہ فرمایا ہے، مثلاً ایک صاحب نے کچھ سوال کیا تو آپ نے فرمایا: "اپنے دل سے سوال کرو"۔ اصل میں بعض دفعہ انسان کوئی کام

کرنا ہو جاتا ہے لیکن اس کا ضمیر اس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جب نفس کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسا کرنا بھی چاہتا ہے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کیلئے یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی مستند و معتبر شخص سے اس کے جواز کی سند حاصل کرے، ایسے موقع پر انسان عجیب الٹ پھیر اور ہیرا پھیری کے ساتھ سوالات کرتا ہے تاکہ اس کے نفس کے تقاضوں کے مطابق جواب مل جائے، ایسے ہی مواقع کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ خود اپنے ضمیر سے اس بارے میں سوال کر کے دیکھو، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "گناہ وہ ہے جس سے تمہارے دل میں کھٹک پیدا ہو"۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں انسان کی اسی فطری قوت کی طرف اشارہ ہے جو برائی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو تھامنے کی کوشش کرتی ہے۔ انسان کا اس سے محروم ہو جانا نہایت ہی محرومی اور کم نصیبی کی بات ہے، کہ انسان گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے اور اس کا ضمیر اس کو جھنجھوڑ نہ پائے، اس لئے کہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کی نعمت عطا فرمائی ہے اور خیر و شر کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اگر شر کی طاقت اسے برائی کی طرف دعوت دیتی ہے تو خیر کی قوت اسے برائی سے روکتی ہے۔ اس معاملہ میں عقل و شعور اس کیلئے ممد و معاون بنتی ہے اور اس کی فطرت سلیم بدی کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو کھینچتی ہے اور کسی نے ایک دفعہ برائی کر لی تو اس پر شرمسار کرتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور طریقہ پر بھی فطرت انسانی کی اس صلاحیت کو سمجھایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ دو طاقتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو اسے شر کی طرف بلاتی ہے، دوسری وہ جو اسے خیر کی طرف بلاتی اور شر سے روکتی ہے۔ پہلا شیطان ہے اور دوسرا فرشتہ" (مشکوۃ المصابیح حدیث ۷۴ باب فی الوسوسہ جلد ۱ ص ۲۰)۔ پھر اگر انسان سے برائی سرزد ہو ہی جائے تو وہ از سر نو بدی سے نیکی کی طرف حرکت کرتا ہے، اسی کو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان غلطی کرتا ہے۔ لیکن بہتر خطا کار وہ ہے جسے غلطی کرنے کے بعد اپنے کئے پر پچھتاوا ہو۔

آپ نے اپنے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ غلطی پر پچھتاوا فطرت انسانی کا تقاضا اور اس کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ جیسے خیر اور بھلائی کے داعی ہیں ویسے ہی

کتنے ہی بے قصوروں کو اپنی درندگی کا نشانہ بناتے ہیں لیکن کیا کبھی یہ بات سنی گئی کہ شیر کو اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہوتی ہو، سانپ رات کے اندھیروں میں کتنے لوگوں کو ڈس کر اپنی پیاس بجھاتا ہے لیکن کیا کبھی اسے اپنی اس حرکت پر پچھتاوا بھی ہوا ہے؟ نہیں کیونکہ درندوں کی فطرت میں چیرنا اور پھاڑنا ہی ہے... وہ ظلم کر کے خوش ہوتا ہے۔ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اسے سکون ملتا ہے۔ اسے کبھی اپنی ظلم و زیادتی پر پچھتاوا نہیں ہوتا ہے۔ ندامت و شرمندگی ان درندوں کی ڈکشنری ہی میں نہیں ہے۔ وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی کو اس سے محروم رکھا ہے۔

لیکن انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان کیسا بھی برا ہو اور کتنا ہی گیا گذرا ہو۔ اس کی فطرت سلیمہ اسے نیکی کی طرف بلاتی اور برائی سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ کبھی انسان کا ضمیر سو جاتا ہے۔ لیکن یہی فطرت انسانی اسے جگاتی اور بیدار کرتی ہے۔ اسی لئے ایسے تو بہت سے واقعات پیش آتے ہیں کہ ایک شخص بڑا ظلم پیشہ ہے اس نے قتل کا ارتکاب کیا لوگوں کی جان اور عزت و آبرو سے کھیلا، ان کے مال و اسباب لوٹے لیکن جب نشہ جور و ستم اترا تو اب ضمیر نے اسے ملامت کرنا شروع کیا۔ یہ ضمیر کی چوٹ اتنی بڑی اور موثر ہوتی ہے کہ اس کا چین و سکون چھین لیتی ہے۔ اسے بے چین کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت سی ہو جاتی ہے۔ احساس کی یہ شدت بعض دفعہ ذہنی توازن کو بھی متاثر کر دیتی ہے۔ ایسے مجرمین ماہرین نفسیات سے رجوع ہو کر اپنی کہانی سناتے ہیں اور ذہنی تناؤ اور اندرونی بے چینی کے علاج کے طلب گار ہوتے ہیں۔

لیکن جب انسان بے ضمیر ہو جاتا ہے تو اسے نہ اپنے جرم پر کوئی ملامت ہوتی ہے نہ مظلوموں کی آہ و فغان اسے تڑپاتی ہے اور نہ اس کا ضمیر اس کے دل سنگ کے دروازے پر کوئی دستک لگاتا ہے۔ ایسا انسان درندوں سے بھی بڑھ جاتا ہے کیوں کہ درندہ اس کی پیاس تو ایک دو انسان یا جانور کا خون پی کر بجھ جاتی ہے لیکن ایسے درندہ صفت انسانوں کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ سیکڑوں ہزاروں انسانوں کا خون بھی اسے آسودہ نہیں کر پاتا۔ اس کو انسانی لہو میں وہ لذت ملتی ہے جو کسی بلا نوش بادہ خوار کو جام جم کے پینے میں، جیسے ایک سلیم الفطرت انسان

گلاب کی خوشبو، رنگ، پھلواری اور سبزہ زار کو دیکھ کر خوش ہوتا اور مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح یہ جفا شعار شیطان نما درندہ انسان کی تڑپتی اور جلتی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر رہ جاتے ہیں اور لذت و سرور محسوس کرتا ہے۔ ایسے انسانوں پر شیطان درندے بھی شرمندہ اور انگشت بدنداں ہوں کہ یہ کیسی مخلوق ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ کہ جسے زمین پر اصلاح کیلئے پیدا کیا تھا لیکن اس نے اپنی تخریب اور فساد میں ہم درندوں سے بھی آگے قدم بڑھا لیا ہے۔

ایسے درندہ صفت لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں کیوں کہ خدا نے اس کائنات میں یہی نظم رکھا ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹے اور شبنم کے ساتھ شعلے بھی رہا کریں۔ ایسے ہی درندہ صفت انسانوں میں ایک نمایاں نام نریندر مودی کا ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ امن و آشتی اور صلح و رواداری کے داعی و نقیب مہاتما گاندھی جی بھی جس جگہ پیدا ہوئے اور نریندر مودی جیسے شخص نے بھی اسی زمین میں جنم لیا۔ درد اور درد کا دوا، یعنی زخم بھی اور زخم کا مرہم بھی بھارت واسیوں کو اسی گجرات سے مل رہا ہے۔ مودی کی ظلم و زیادتی اور محروم آزادی وطنوں آشنائی پر تو جتنا افسوس کیجئے کم ہے۔ لیکن اس سے زیادہ افسوسناک اور شرمناک بات یہ ہے کہ گجرات کے لوگوں نے جبر و ظلم کے جذبات رکھنے کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ ایک بے ضمیر شخص کو رسوا کرنے کی بجائے اسے عزت دی گئی ہے۔ ظلم کے ہاتھ تھامنے کی بجائے اسے مزید طاقتور بنا دیا گیا ہے۔ یہ اور زیادہ شرمناک بات ہے اور انسانیت، جمہوریت اور رواداری کے نام پر کلنک ہے۔

دہشت گردی اور ظلم و جبر کی اس فتح میں غیر مسلم پارٹیوں کا کیا قصور ہے؟ اسے تو وہ جیتیں، لیکن اس میں ہم مسلمانوں کی غفلت شعاری اور کوتاہی کو کیا دخل ہے؟ اس کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر بنانے اور ان کے دلوں سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکالنے میں کیا محنت کی؟ اپنے پڑوسیوں سے اپنے تعلقات کو بہتر کرنا وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے اور اس پر ہر جگہ اور ہر سطح سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے۔ سماج ہی انسان کا اصل محافظ ہے اور اس کیلئے معتدل اور خوشگوار تعلقات

ضروری ہیں، یہ کام ایک دو دن میں نہیں ہو سکتا، اس کے لئے مسلسل اور متواتر محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم حوصلہ نہ ہاریں اور مناسب طور پر اس سمت میں کوشش کریں تو مختصر مدت میں ہم برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر کر سکتے ہیں اور فرقہ پرست طاقتوں کا مقابلہ کرنے میں ہمیں کامیابی ہو سکتی ہے۔

دوسری ضروری بات حکمت اور مصلحت اندیشی سے متعلق ہے کہ کس وقت کس بات کا کیا اثر ہوگا؟ کوئی بات محل اور ماحول کے لحاظ سے کہی جاتی ہیں اور کوئی بات چھپا کر رکھی جاتی ہیں، اس کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع سے جب حضرت نعیم بن مسعود مسلمان ہوئے تو آپ نے انہیں اپنا ایمان چھپانے کا مشورہ دیا، کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کا مفاد اسی میں تھا۔ گجرات میں حالات اور آفات سے ... میں متعدد ایسی ہاتھ لگی ہیں۔ ان ایجنٹوں کو ... پر پولیس نے تو غنڈہ گردی کا ثبوت دیتے ہوئے فساد سے بچنے کی ... ان نے ... دوست کو محفوظ رکھا اور جو دوست ... سے ہو سکے تھے ... بھیجا، یہاں تک کہ ... بحال ہوئی۔ اسی طرح ملک پر بچارے مراد برآئی اور زندگی نے انسانیت پر اور ظلم نے انصاف پر فتح حاصل کی۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے جذبات پر ہوش کو غالب رکھیں اور جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے حقائق اور واقعات کو ملحوظ رکھیں۔

{۲۶ ستمبر ۲۰۰۲ء}

ایک مظلوم کا مقدمہ انصاف کی عدالت میں

مسلمانوں نے آزاد ہندوستان میں بہت سے غم دیکھے ہیں، جو بھلائے نہیں جا سکتے، وہ زخم کھائے ہیں، جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتے، اپنے عزیزوں اور بزرگوں کی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں، کبھی عزت و آبرو کی قربانی بھی دینی پڑی، دین حق پر استقامت کی پاداش میں دل سے اور اس ملک کے چپہ چپہ کو اپنے لہو کے انمٹ نقوش سے لالہ زار کر دیا ہے، لیکن ۶ دسمبر کا زخم ایسا ناسور ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوتا، اور جب تک دوبارہ یہاں اللہ کا گھر نہ بن جائے اور اس کے میناروں سے اللہ کی کبریائی اور توحید کی اذان بلند نہ ہونے لگے اس وقت تک اس غم کا مداوا نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کی آئندہ نسلیں بھی اس غم کو فراموش نہ کر سکیں گی، کیونکہ یہ غم متاع حیات بن چکا ہے اور اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

فرقہ پرست عناصر کہتے ہیں کہ بابری مسجد رام جی کی جائے پیدائش کے مقام پر بنائی گئی ہے، یہ دعویٰ عقل و نقل اور تاریخ و آثار ہر پہلو سے غلط ہے، اولاً تو یہ بات ہی متعین نہیں کہ کیا رام جی کا حقیقی معنوں میں وجود تھا یا محض ایک افسانوی نام اور طلسماتی کردار ہے؟ کیونکہ رام جی سے وابستہ جو تاریخ ہندو مذہبی کتابوں میں بیان کی گئی ہے اس کے توہماتی اور دیومالائی ہونے میں کسی حقیقت پسند ہندو دانشور کو بھی شک و شبہ نہیں، اسی لئے بہت سے ہندو دانشوروں کو بھی خیال ہے کہ رام جی کی حیثیت ایک افسانوی کردار کی ہے نہ کہ حقیقی شخصیت کی۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ رام جی کا حقیقی وجود تھا اور آپ ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے تو سوال یہ ہے کہ ایودھیا سے کون سا خطہ مراد ہے؟ کیونکہ حال ہی میں آثار قدیمہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ایس ڈی ایس راؤ نے انکشاف کیا ہے اور ثبوتوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ اصل ایودھیا ہریانہ کا مقام "بنداولی" ہے (قومی آواز، دہلی، ۱۰ مارچ ۱۹۹۸ء) واضح ہو کہ سنسکرت

دور آثارِ قدیمہ کے ماہرین بھی سے ہیں، ایودھیا کے ایک پنڈت جی کا دعویٰ ہے کہ رام جی کی پیدائش کی اصل جگہ رام چبوترہ ہے اور اس سلسلے میں ان کے پاس ثبوت موجود ہے، اس طرح کے دعوؤں کو بالکل نہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شہر کسی نام سے معروف تھا وہ اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے کافی دور پہنچ گیا، شہر کے باشندے اور کاروباری نقل مکانی کرتے رہے اور پھر وہی دوسری جگہ اسی شہر کے نام سے موسوم ہوگئی۔

اگر ایودھیا وہی جگہ ہے جو اس وقت "ایودھیا" کہلاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس شہر میں رام جی کی پیدائش کس جگہ پر ہوئی؟ کیونکہ اس وقت ایودھیا میں تقریباً دو تین ایسے مندر موجود ہیں جن کی بابت ان مندروں کے متولیوں کا دعویٰ ہے کہ یہی رام جی کی جائے پیدائش ہے، پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں رام جی کی اصل جائے پیدائش معلوم کرنے کے لئے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اس کمیٹی نے کافی تلاش و جستجو کے بعد دو مقامات کے بارے میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ رام جی کی جائے پیدائش ہو، ان میں سے ایک کا نام "رام جنم استھل" رکھا اور دوسرے کا "رام جنم بھومی"۔ یہ دونوں جگہیں بابری مسجد (DISPUTEDMOSOUE) کے علاوہ ہیں، بابری مسجد کے محل وقوع کے رام جی کے جائے پیدائش ہونے کا ذکر مفسد اور تفرقہ انداز گروہوں سے پہلے نہ کسی تاریخی کتاب اور سفرنامے میں ہے اور نہ ہندو بھائیوں کی مذہبی کتابوں میں۔

اگر یہ بات فرض بھی کرلی جائے کہ رام جی کی جائے پیدائش وہی جگہ ہے تو بھی اس بات کا ثبوت مطلوب ہوگا کہ اس جگہ پر مندر بھی بنایا گیا تھا؟ اور اگر اس مقام پر مندر کے پائے جانے کا کوئی ثبوت ملتا ہے تب بھی یہ بات محتاجِ دلیل ہے کہ مسلمانوں نے اسی جگہ جبراً مسجد بنائی ہے، کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقام کے باشندوں نے اس جگہ کو مسلمانوں سے فروخت کردیا ہو اس لئے کہ مسلمانوں کے یہاں مسجد کی زمین خرید و فروخت نہیں کی جاسکتی لیکن دوسری قوموں کے یہاں مذہبی عبادت گاہوں کے بارے

میں ایسا تعمیر نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ یورپ میں یہودی اور عیسائی بے تکلف اپنے چرچ فروخت کرتے رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے اس مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کیا تھا لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابل یقین ہے، کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا گیا بھی ہو۔ بابر نے خود ترکی زبان میں "بابر نامہ" تحریر کیا ہے نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے، بابر نامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۲ میل دور مقیم ہوا تھا۔ چنانچہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی تحریری تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب ایودھیا آئے ہوں۔ (بابر صفحہ ۹۳) پروفیسر آر۔ اے۔ تھور (یونیورسٹی آف راجستھان) نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا۔ (بابر صفحہ ۹۶)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہو اس کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج و مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے۔ اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بابر کٹر مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا۔ منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، ماسٹر شیو پرشاد نے اپنی کتاب "آئینہ تاریخ" کے پہلے حصہ میں بابر کے عدل و انصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے، اس کے دور میں نظم حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے، وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا، پروفیسر آر۔ اے۔ تھور کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جا سکے، پروفیسر سری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم روا رکھا ہو، پروفیسر آر۔ پی۔ ترپاٹھی لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا (بابر صفحہ ۸۰) مشہور محقق سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپنی کتاب "مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری" میں بابر کی

بابر کی رواداری اور حسنِ سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، پروفیسر بنرجی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ رویہ اور کلیدی عہدوں پر ہندوؤں کے فائز کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مندروں اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے۔ اور پروفیسر سری واستو نے اپنی پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے قطعی میل نہیں کھاتے (بابر صفحہ ۹۸) یہاں تک کہ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو گاؤکشی سے منع کیا ہے تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ ۱۹۹۵ء میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے۔

> "میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں رام چرت مانس، بالمیکی رامائن کے کسی دوسرے مجموعے میں ایسا کوئی ذکر نہیں ہے کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی گئی ہو۔ ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو، رام چندر جی کی جنم استھلی وہاں واقع ہوئی ہو جہاں بابری مسجد تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کر کے بنایا گیا ہے، اس مقصد کے لئے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی ظاہر کئے کہ مسجد کے ستون غیر اسلامی ہیں وغیرہ، ورنہ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کیا تھا، اکبر کو چونکہ وحدتِ ادیان کا جنون سا تھا، اس لئے اس نے اس سے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی رکھوا دی، ۱۹۴۷ء سے پہلے غالباً بابری مسجد کے کسی فریق کے سلسلے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے، مارچ ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ جب یہ مسئلہ

عدالت میں گیا، اس وقت ہندو فریق نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کو بڑی گرمی اور برسات سے بچانے کے لئے چبوترہ کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے؛ لیکن ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کو عدالت نے یہ عرضی رد کر دی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود ہندو بھائیوں کے یہاں بھی مندر کے انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔

پھر غور کیجئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھنا جائز نہیں، گو کہ فرض اس سے ادا ہو جاتا ہے؛ لیکن مغصوبہ زمین پر نماز ادا کرنے والا گنہگار ہے اور ظاہر ہے کہ مسجدیں ثواب کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں نہ کہ گناہ کے لئے، تو کوئی مسلمان کیسے ایک زمین غصب کر کے مسجد تعمیر کر سکتا ہے؟ اس لئے نہ نقل اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، نہ تاریخ کی گواہی اس کے حق میں ہے، نہ آثار سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ عقل ہی اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، اس لئے بابری مسجد کا مسئلہ اس ملک کی جمہوریت اور نظام عدل کے لئے ایک چیلنج اور امتحان ہے، جب تک اس مظلوم مسجد کو انصاف نہیں ملے گا اس ملک کی جمہوریت اور رواداری کا چہرہ داغ دار رہے گا۔

(یکم دسمبر ۲۰۰۰ء)

دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

یوں تو اللہ تعالیٰ کا ہر حکم بندہ کے لئے واجب التعمیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی نسبت سے جو گناہ بظاہر معمولی نظر آتا ہے، وہ بھی غیر معمولی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں وہ ہیں جن سے دین و شریعت اسلامیہ کی شناخت متعلق ہے، انہی ہی چیزوں کو قرآن مجید نے شعائر اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ بات فرمائی ہے کہ ان کی حرمت پامال نہ کرو: لا تحلوا شعائر الله (مائدہ: ۲) اسی کو قرآن میں دوسری جگہ "حرمت اللہ" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (الحج: ۳۰) اور بتایا گیا ہے کہ جو اللہ کی حرمتوں کی عظمتوں کو برقرار رکھے گا، وہ اس کے لئے اس کے پروردگار کے نزدیک بھلائی کا سامان ہوگا: فهو خير له عند ربه (الحج: ۳۰) یہ بھی ارشاد ہوا کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم نیک دل اور خدا ترس ہونے کی علامت ہے: ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب (الحج: ۳۲)

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کیا، اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب نے انہیں آ پکڑا، قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سفینۂ نجات بنایا، یہ بھی اللہ کی ایک نشانی تھی، آپ کی قوم نے کشتی کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کا برتاؤ کیا، اور بالآخر پوری قوم غضب خداوندی کی شکار ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر اونٹنی کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، جسے قرآن نے "ناقة الله" یعنی اللہ کی اونٹنی کا نام دیا ہے، اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم اسی عذاب میں گرفتار ہوئی کہ صفحۂ ہستی سے نام و نشان تک مٹ گیا، اس طرح کے کتنے ہی عبرت خیز واقعات ہیں، جو قرآن اور بعض دوسرے آسمانی

آبادیوں میں شعائر کی حیثیت سے نمایاں ہوتی ہیں۔

مساجد بھی شعائرِ اسلام میں داخل ہیں، یہ اللہ کی عبادت و بندگی کا مرکز ہیں۔ مسجد کو دیکھتے ہوئے خدا کی یاد آتی ہے، یہ اللہ کی بندگی کیلئے بنائی گئی ہیں، اپنا خالق و مالک یاد آتا ہے، یہیں سے شب و روز اور بار بار اللہ کی توحید و کبریائی کی آواز بلند ہوتی ہے، اسی لئے یقیناً مسجدیں شعائر اللہ میں داخل ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے احترام کا خصوصی حکم دیا، اور تاکید فرمائی گئی ہے کہ کوئی بات احترامِ مسجد کے خلاف نہ ہونے پائے، یہاں تک کہ آپ نے خرید و فروخت کی بات چیت تک سے منع فرمایا، مسجد کی عظمت و تقدس کے لئے یہ بات کافی ہے کہ قرآن کریم نے کئی جگہ پر مساجد کی تعمیر کی تحریک فرمائی ہے۔ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے مبارک ہاتھوں سے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی، جو خود قرآن مجید میں موجود ہے، اور مسجد نبوی میں پیغمبر اسلام ﷺ کے پتھر اٹھانے کا ذکر حدیث میں آیا ہے، اسی لئے خدا کی نظر میں اس کے گھر کی جو عظمت و حرمت ہے، اور اس کی حرمت و مرتبہ کی رعایت جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔

اسی لئے مساجد کی بے حرمتی کرنے والے اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے، بے حرمتی پر خدا کا ہاتھ ضرور انہیں آ پکڑے گا، قرآن مجید نے اس طرح کے ایک واقعہ کی طرف بہت واضح لفظوں میں اشارہ کیا ہے، اور وہ یمن کے حاکم ابرہہ کی بے حرمتی کا واقعہ ہے۔ ابرہہ یمن کا فرماں روا تھا، اور یمن میں اس وقت عیسائیت کو غلبہ حاصل تھا، وہ یہ چاہتا تھا کہ عربوں کا رخ جو بیت اللہ کی طرف ہے، وہ یمن کی طرف ہو جائے، چنانچہ اس نے ایک بہت عظیم الشان گرجا "قلیس" نام سے تعمیر کیا، اور عربوں سے خواہش کی کہ اب وہ کعبۃ اللہ کے بجائے یمن آکر اس گرجا کا طواف کیا کریں، اس کوشش میں ممکن ہے کہ ساتھ ساتھ معاشی مفاد کا خیال بھی کار فرما رہا ہوگا کہ اس طرح سارے لوگوں کے آنے کی وجہ سے یمن کی تجارتی منڈی اور زیادہ وسیع ہو جائے گی، اور یہاں کے لوگوں کو مالی فوائد حاصل ہوں گے۔

لیکن عربوں کے دل میں کعبۃ اللہ کی عظمت تھی، وہ ہرگز اس طرح انگیز نہ کر سکتی تھی، اسی لئے بعض سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق بعض عربوں کی جانب سے کلیسا کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ ابرہہ نے طے کر لیا کہ اسے کعبہ پر چڑھائی کرنی ہے۔ چنانچہ ابرہہ ہاتھیوں کا ایک لشکر جرار لے کر حجاز کی طرف بڑھا اور مکہ سے بالکل قریب آ گیا، عین اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابابیل پرندوں کا ظہور ہوا، جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں کنکری سی رکھی تھی، انھوں نے یہ کنکریاں برسائیں، وہ کیا ہاتھی اور کیا ہاتھی بان؟ سبھی قرآن کی زبان میں "کھائی ہوئی بھوسی کی مانند" ہو گئے۔ (الفیل) خدا کی قدرت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کی تذلیل کا کیسا سامان کیا کہ ایک معمولی پرندہ اور اس سے بھی زیادہ معمولی کنکریوں کے ذریعہ اس لشکر کا صفایا کر دیا گیا، یہ انسان کی تحقیر کی نہایت ہے!

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اس مبارک گھر کو ظالم و جابر لوگوں کی دستبرد سے بچائے رہیں گے، فلم یسلط جبار قط (مجمع الزوائد ۳/۲۹۹) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ قرب قیامت میں ایک فوج کعبۃ اللہ پر حملہ آور ہو گی، جب یہ فوج مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء نامی جگہ پر پہنچے گی تو پورے کے پورے لوگ اول تا آخر زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔ فاذا کانوا ببیداء من الارض یخسف باولھم و آخرھم (بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۱۸)

اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو چیزیں اسلام کے شعار کے درجہ میں ہوں، ان کی خاص اہمیت ہے، اور ان کے ساتھ بے حرمتی اسی قدر عذاب و عقاب کا موجب، چنانچہ اذان سنت ہے نہ واجب، لیکن اگر کسی جگہ تمام لوگ اذان کے ترک کر لینے پر اتفاق کر لیں تو یہ اس کے شعار دین کی بے حرمتی ہے، اس لئے ان سے جہاد کا حکم ہے، مشہور فقیہ علامہ شامی امام محمد کا قول نقل کرتے ہیں:

لو اجتمع اھل بلدۃ علی ترکہ قاتلناھم علیہ (ردالمحتار: ۲/۲۰۰)

اگر کسی شہر کے لوگ ترک اذان پر اتفاق کر لیں تو اس بات پر ان سے جہاد کیا جائے۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں پیش آیا، یہ ایسا شرمناک واقعہ ہے کہ شاید اس پر شیطان کو بھی اپنی کم حوصلگی کا گلہ ہوا ہوگا، شاید ہی انسانی کوئی مثال ملے کہ اس شور و ہنگامے کے ساتھ علی الاعلان ہندو طاقت اخلاق و قانون کی تمام حدود کو پامال کرتے ہوئے کسی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کیا گیا ہو، منہدم ان غنڈوں نے نہیں کیا ہو جو غنڈہ گرد ہونے کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، بلکہ ان غنڈوں نے کیا کہ جن کی سیاسی قیادت ہندوستان کی سیاسی افق پر ابھرا ہوا بن چکی تھی، مسلمان نہتے اور مجبور تھے ستم رسیدہ اور کمزور تھے، پولیس نے ایودھیا میں غنڈہ کارسیوکوں پر گولیاں نہ چلا کر جو کچھ بارود بچا رکھا تھا، بے قصور اور بے ضرر مسلمان اپنے سینوں پر ان گولیوں کو بے تکلف خرچ کیا، اور کتنے ہی جوان اور بوڑھے اور عورتیں اور بچے خاک و خون میں تڑپ اٹھے۔ جو لوگ اقتدار کے نشہ میں مست تھے وہ سمجھتے تھے کہ کسی مظلوم کا ہاتھ ان کی گردن تک نہیں پہنچ سکے گا؟ شاید انہیں اللہ کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔

لیکن مقام عبرت ہے کہ اللہ نے کس طرح ان کو ذلیل و رسوا کیا ہے، کلیان سنگھ جن کی ریاستی حکومت میں یہ سب کچھ ہوا، ان کو خود ان کی پارٹی نے ایسا بے آبرو کر کے نکال باہر کیا کہ کم اس کی مثال ملے گی، ارون نہرو اور بوٹا سنگھ راجیو گاندھی کے زمانہ میں شیلا نیاس کرانے کے ذمہ دار تھے، ارون نہرو تو ایسی سیاسی موت مرے کہ نام و نشان بھی باقی نہ رہا، اور بوٹا سنگھ جو کسی زمانہ میں وزیر داخلہ تھے، آج جیل کی ہوا کھانے کے لئے تیار ہیں، نرسمہا راؤ ایسے مغرور وزیر اعظم تھے کہ کوئی ان کے سامنے پر نہیں مار سکتا تھا، لیکن آج ایسے بے دست و پا ہیں کہ عدالت نے ان کے لئے جو سزا مقرر کی ہے، اس پر کوئی آنسو بہانے اور اظہار افسوس کرنے والا بھی نہیں، اور "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں" کی مثال بنے ہوئے ہیں، مسجد کی شہادت میں لاتور اور عثمان آباد کے شیو سینک سب سے آگے آگے تھے، زلزلہ نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا، کہ اپنی ہولناکی اور تباہ کاری کے اعتبار سے وہ تاریخ کے مشہور زلزلوں میں سے ایک ہو گیا، سورت کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ جو حیوانیت برتی گئی، اور کھلے عام عورتوں کی بے آبروئی کی گئی، سورت والوں نے پلیگ کی وبا کی

صورت میں اپنے اس عظیم کو جوڑ رکھا ہے، اور جن لوگوں نے قصد کیا، جن زندگی کی ٹولی ہوتی
باقی تھی انہوں نے اپنے ترجمہ کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایسی بھی ایک عظیم ہستی ہیں۔ جو آج روشن
تحریر کرتے ہیں۔ یعنی وہ اب خداوندی کا پیمان وہی وفا کرتے ہیں، جو خدا کے دین اپنی
طاقت پہ نازاں ہیں، اور یہی طاقت ان پر قربان کردیتے ہیں۔

انکساری تو یہ ہے مجھ جیسا تو ہے

(۲۰؍اکتوبر ۲۰۰۰ء)

تم صرف پیچھے ہٹے ہو!

رسول اللہ ﷺ نے موتہ کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کیا۔ ان حضرات نے مقابلہ بھی بہادری کے ساتھ کیا، لیکن مقابلہ میں جم نہ سکے اور بالآخر فرار اختیار کرنی پڑی۔ جب مدینہ واپس آئے تو سارے شرم کے چھپے پھرتے تھے اور آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، کہتے تھے کہ ہم لوگ تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، نحن الفرارون۔ آپ ﷺ دلوں کے رازداں اور حکیموں سے بڑھ کر حکیم تھے، موقع و محل کی خوب پہچان رکھتے تھے اور انسانی نفسیات سے خوب واقف تھے، آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ موقع زجر و توبیخ اور شرمساروں کو مزید شرمسار کرنے کا نہیں، بلکہ ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے کا ہے۔ آپ ﷺ نے لطف و کرم کا لب و لہجہ اختیار کیا اور فرمایا کہ تم بھاگے نہیں ہو بلکہ تم اس لئے پیچھے ہٹے ہو کہ پیچھے آکر دوبارہ حملہ کرو، تم نے اس لئے پسپائی اختیار کی ہے کہ نئی کمک ساتھ لے کر مقابلہ پر آؤ، انتم الکرارون، انتم العکارون، یعنی اس واقعہ کو "بزدلی" کے بجائے "حکمت عملی" کا واقعہ بنا دیا، گویا یہ ایک طرح کی فوجی تدبیر ہے کہ پیچھے ہٹ کر پھر مقابلہ کیا جائے۔ یہ ایک جنگی چال ہے نہ کہ شکست و ہزیمت۔

انسان دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور ایک کا اندر کی دنیا سے۔ باہر کی دنیا میں ضروری ہے کہ اس کام کے لئے مطلوبہ وسائل اختیار کئے جائیں، فوجی اور سپاہی ہے تو اسلحہ اور حملہ کرنے اور دفاع کرنے کے آلات سے لیس ہونا چاہئے، تجارت کا تجربہ اور ضروری سرمایہ رکھتا ہو، طالب علم ہے تو اس کے پاس کتابیں ہوں اور اچھے اساتذہ ہوں، اس کا دوسرا تعلق انسان کے اندر کی دنیا سے ہے اور اس کا سرمایہ حوصلہ، ہمت اور یقین ہے۔

کسی بھی اہم کام کے لئے حوصلہ اور یقین سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ اس بات کا حوصلہ کرنا کہ اس کام کو کر سکتے ہیں اور اس بات کا یقین کہ اس کام کو ضرور اس کے انجام تک پہنچا کر رہے گا اور اپنے آپ پر اعتماد کرنا ہی کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ راستے کی مشکلات آسان کرتا ہے بلکہ ان کی طرف توجہ ہٹا دیتا ہے، ہمت و حوصلے کی طاقت ظاہری وسائل کی کمی کا بدل ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ تاریخ میں کتنے ہی واقعات آپ کو مل جائیں گے کہ ایک بے سروسامان شخص اٹھا، نہ اس کے پاس فوج تھی، نہ حکومت اور نہ مادی وسائل، لیکن بلند حوصلگی، عالی ہمتی، اپنے مقصد پر یقین اور خود اعتمادی نے اس کو اتنی طاقت بہم پہنچائی کہ اپنے زمانے کے فراعنہ کی گردنیں بھی اس کے سامنے خم ہو گئیں اور وہ ان طاقتوں کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو گیا، اور ایسی مثالیں بھی آپ کو مل جائیں گی کہ وسائل کی فراوانی اور تعداد کی کثرت کے باوجود پست حوصلگی اور کم ہمتی نے پوری قوم کو غلامی میں پابند زنجیر کر دیا۔

مسلمانوں نے بھی بحیثیت قوم اس کا خوب تجربہ کیا ہے، غور کیجئے کہ وہ مسلمان ہی تھے جو عرب کے ریگزار سے اٹھے اور افریقہ و یورپ سے مشرق بعید تک ابر رحمت کی طرح چھا گئے، محض سولہ سال کے ایک نوجوان نے سندھ پر دھاوا بول کر ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کو اسلام اور اسلامی نظام کی نعمت عظمیٰ سے ہمکنار کیا اور یہیں پر اپنی فتح مندی کے نقوش ثبت کئے اور وہ بھی مسلمان ہی تھے جنہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود علمی اور فنی لٹریچر کو عربی زبان میں منتقل کیا، تحقیق و ریسرچ کا جو چراغ یورپ میں بجھ چکا تھا اور جہاں کسی سائنسی تحقیق اور نظریہ کا پیش کرنا بھی گردن زدنی جرم تھا، وہاں علم و فن کی نئی بزمیں آراستہ کیں اور تحقیق و اکتشاف کی ایک نئی دنیا کو وجود بخشا، یہ در اصل اسی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا کرشمہ تھا۔

اور وہ بھی مسلمان ہی تھے کہ جب تاتاریوں کا فتنہ اٹھا تو چند تاتاریوں کا وجود پوری مسلمان فوج کی شکست کے لئے کافی ہوتا تھا اور ایک تاتاری عورت بھی دسیوں مسلمان مردوں کو تہ تیغ کر سکتی تھی اور آج ہماری بدنصیب آنکھیں اس منظر کو دیکھ رہی ہیں کہ

مسلمانوں کے پاس دنیا کے بہترین معاشی وسائل ہیں۔ تجزیاتی فکری وسائل بھی وہ غنی ہیں اور صلاحیتیں بھی ہیں، لیکن علم و تحقیق کے میدان میں ان کا حصہ صفر ہے اور علمی سطح پر ان کا شمار پسماندہ اقوام میں ہے۔ اس میں بڑا دخل احساسِ کمتری کا ہے۔ جب کسی قوم میں پست حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہمت ہار دیتی ہے تو پھر حرکت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور وہ دشوار گزار راہیں طے نہیں کر سکتی۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ کسی بھی باعزت قوم کے شایانِ شان نہیں۔ سیاسی اعتبار سے وہ ایک منتشر انبوہ ہیں، افرادی قوت کے لحاظ سے ملکی سیاست پر ان کا کوئی اثر نہیں، معاشی اعتبار سے ان کی پسماندگی ضرب المثل ہے، نہ تجارت میں ان کا قابلِ لحاظ حصہ، نہ صنعت میں۔ سب سے افسوسناک بات مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور زبوں حالی ہی ہے، جس نے ان کو سیاسی شعور سے بھی محروم رکھا اور معاشی بدحالی سے دوچار کیا ہے، اس لئے کہ اس دور میں ملازمت ہی نہیں، اعلیٰ درجے کی صنعت و تجارت بھی تعلیم کی رہینِ منت ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ خود کوئی سیاسی قوت نہیں ہیں، اس بات نے عام طور پر مسلمان قائدین کو بے حسی کا شکار اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ مسلمان تجارت میں اترنے کا حوصلہ نہیں پاتے، معمولی تجارتوں پر قانع ہیں، صنعت اور کاروبار آج مقابلہ کا اصل میدان ہے اور سخت محنت اور اعلیٰ صلاحیت کے بغیر کوئی اسے سر نہیں کر سکتا، اس میدان میں قدم رکھنے سے بھی مسلمان گھبراتے ہیں۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ مسلمان طلبہ ایک طرح کی احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، اعلیٰ مقابلاتی امتحان میں شرکت کا تناسب مسلمان طلبہ کا بہت معمولی ہے۔

ملک میں جہاں مسلمانوں نے بہت سے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، وہیں ایک ایسے ادارہ یا مہم کی بھی ضرورت ہے جو مختلف میدانوں میں ان لوگوں کی اخلاقی مدد کرے اور حوصلہ افزا مشورے دے، جن کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور وہ پست حوصلگی کے باعث میدانِ مسابقت چھوڑنے لگیں۔ کتنے ہی مسلمان طلبہ ہیں جو ساتویں جماعت کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں لیکن جماعت دہم تک نہیں پہنچ پاتے، کتنے مسلمان تاجر

ہیں جو ابھرتے ہیں لیکن کسی وقتی واقعہ کے نتیجے میں ہمت ہار کے اپنے میدان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ یہی حال ہر شعبۂ زندگی کا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو ہمت دلائی جائے اور ان کو اپنی جدوجہد جاری رکھنے پر آمادہ کیا جائے۔ ان کو اس تجربہ سے آگاہ کیا جائے کہ بعض طلبہ میٹرک میں فیل ہو گئے لیکن پھر مسلسل اور مردانہ وار کوشش نے ان کو اس لائق بنا دیا کہ انہوں نے اعلیٰ مسابقتی امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ تجارتی نقصان نے ان کو دیوالیہ کر دیا لیکن بلند حوصلگی کے ساتھ محنت نے ان کو از سر نو کھڑا کر دیا۔ اسی طرح ان کو شکست اور بے یقینی کے دلدل سے نکال کر خود اعتمادی اور یقین سے بہرہ ور کیا جائے کہ شکست کے احساس اور پست ہمتی کے ساتھ کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی!!

(۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء)

* * *

چشمِ صیاد بہر سو نگراں آج بھی ہے

اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو عقیدہ دہرا امتیاز کھینچتا ہے وہ توحید خالص کا عقیدہ ہے۔ ''توحید خالص'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اکیلا ہے، نہ کوئی اس کا باپ ہے اور نہ ماں، نہ بیوی اور نہ اولاد، نہ خاندان اور کنبہ۔ اپنی صفات اور اختیارات میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور بے مثال ہے۔ حیات و موت، رزق میں وسعت اور تنگی، صحت اور بیماری، امن و سکون سے محرومی کی تمام کنجیاں اسی نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں، نہ کوئی طاقت کا دیوتا ہے، نہ کوئی تقسیم رزق کی دیوی۔ توحید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، کوئی دوسرا ان میں شریک و سہیم نہیں، عبادت اور بندگی اللہ ہی کی کرنی ہے، دعا اللہ ہی سے مانگنی ہے، اللہ ہی سجدہ کا مستحق ہے، سوال و دعا کرنے کی جگہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، ذات دوسروں کی پوجا، ان کو سجدہ کرنا اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا، یعنی توحید ذات میں بھی ہے، ''صفات'' میں بھی اور ''حقوق'' میں بھی۔

اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں وہ تو صریح شرک کے داعی ہیں یا اگر توحید کے قائل ہیں تو بالواسطہ شرک میں مبتلا ہیں۔ کوئی خدا کے لئے اولاد کا قائل ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ خدا نے کسی کو کائنات کے نظام کے لئے کارندہ بنا رکھا ہے اور اپنے اختیارات کو مختلف دیوتاؤں کے حوالہ کر دیئے ہیں، کوئی زبان سے خدا کو ایک کہتا ہے لیکن اپنی پیشانی مختلف چوکھٹوں پر جھکاتا ہے، خالص اور بے آمیز توحید اسلام کی خصوصیت ہے اور یہ انسانیت کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، یہ توحید مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور در در ہاتھ پھیلانے سے نجات دیتی ہے، انسانی مساوات و برابری کا یقین پیدا کرتی ہے اور کم

نسل کی بنیاد پر انسان اور انسان کے فرق کو مٹاتی ہے اور اسلام کی تمام تعلیمات کے لئے عنوان کا درجہ رکھتی ہے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں جتنے پیغمبر اور رسول آئے، ان سب کا اصل مشن یہی دعوتِ توحید تھا، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین تھے اور ضروری تھا کہ آپ ﷺ کے ذریعہ تصورِ توحید کو اس درجہ راسخ کر دیا جائے کہ ہمیشہ کے لئے علمی اور استدلالی اعتبار سے تصورِ شرک مغلوب اور مفتوح ہو جائے، آپ ﷺ نے اس دعوت کے لئے بے حد تکلیفیں اٹھائیں، گالیاں، کوچوں میں آبلہ پائی کی، چوٹیں کھائیں، پتھر کھائے، کڑوی کسیلی برداشت کی، فاقہ مستیوں سے گزرے اور ہر طرح کی تکالیف اٹھاتے ہوئے ایک ایک شخص کی خوشامد کی کہ ”لا الٰہ الا اللہ“ کا اقرار کرو اور کامیابی سے ہمکنار ہو ” قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا “۔

اسلام سے پہلے عقیدۂ شرک کو ایسا فکری غلبہ حاصل تھا کہ جو مذاہب توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے، وہ بھی شرک سے اپنا دامن بچا نہیں پاتے تھے۔ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید ہی کی تھی، لیکن بتدریج بدھ مت ایک مشرکانہ مذہب بن گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ایک ڈیڑھ صدی کے اندر ہی عیسائیت تثلیث کے سانچے میں ڈھل گئی، خود ہندو مذہب کے قدیم مآخذ کو دیکھا جائے تو ان میں بھی نمایاں طور پر توحید کی تعلیم ملتی ہے، لیکن اس وقت ہندو مت شاید دنیا میں مشرکانہ تصور کا سب سے بڑا نمائندہ ہے، جس کے پاس دیویوں اور دیوتاؤں کی اتنی بڑی فوج ہے کہ ان کا شمار کرنا بھی آسان نہیں۔

یہ اسلام کی انقلابی شان ہے کہ اس نے اس فکر کی کایا پلٹ کر کے رکھ دی اور عقیدۂ توحید کو ایسا غالب کیا کہ جو مشرک مذاہب تھے وہ بھی اپنے اندر توحید کے عناصر تلاش کرنے لگے، عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا، جس نے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا انکار کیا، ہندوؤں میں آریہ سماجی تحریک اٹھی جس کا مقصد مورتی پوجا کی مخالفت تھی، بہت سے مشرک مذاہب تو وہ تھے جو اسلام کی آمد کے بعد ناپید ہو گئے، یا ان کا دائرہ

اتنا محدود ہو گیا کہ ان کا شمار نہ ہونے میں ہے۔

ہندوستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہندو مذہب نے پہلے تو دوسرے مذاہب کو بزورِ طاقت ختم کرنے کی کوشش کی، بدھ مت اور جین مت اس کی مثال ہیں، لیکن جب یہ بات ممکن نہ ہو سکی تو اس نے دوسرے مذاہب کو اپنے اندر جذب کرنے کی تدبیر کی اور اس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی، بدھ مت اور جین مت عملاً اس وقت ہندو مت ہی کی ایک شاخ ہے، یہی حال گرونانک جی کے قائم کئے ہوئے "سکھ مت" کا ہوا۔ اسلام کے ساتھ بھی ہندو مت نے اپنی اس تاریخ کو دہرانا چاہا، وحدتِ ادیان کا تصور اور اس تصور کے تحت ہندو دھرم کی مشہور "بھگتی تحریک" اسی کی کوششوں کا حصہ ہے، بعد کو اکبر اور دارا شکوہ جیسے فرماں رواؤں کے ذریعہ اس تحریک کی تقویت کا سامان کیا گیا، جس کو اورنگ زیب عالمگیر جیسے صاحبِ علم، صاحبِ دل اور بالغ نظر مدبر نے ناکام کر دیا، جو اقبال کی زبان میں "ترکشِ مارا خدنگِ آخریں" کا مصداق تھا۔

جو لوگ ہندوستان کو صرف ہندو مذہب کے زیر سایہ دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ بات پریشانی کا باعث ہے کہ آخر صدیوں کی کوششوں کے باوجود مسلمان ہندو مذہب اور تہذیب میں کیوں ضم نہیں کئے جا سکے؟ اس لوہے کے چنے کو کس طرح چبایا جائے؟ اس کے لئے پہلے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ مسلمان تنگ آکر اسلامی تصورات اور اسلامی تہذیب کا دامن چھوڑ دیں، لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور دنیا نے محسوس کیا کہ ایک مسلمان کے لئے اپنا آخری قطرۂ خون دے دینا زیادہ آسان ہے، لیکن وہ اپنے مذہب اور دین سے دستبردار نہیں ہو سکتے، پھر مسلمانوں کے شخصی قانون کو نشانہ بنایا گیا کہ اگر یہ قوانین ختم ہو جائیں تو مسلمان اور برادرانِ وطن کے درمیان تہذیبی فاصلہ ختم ہو جائے گا اور شاید اس طرح وہ اس قوم کو اپنے ساتھ جذب کر لیں گے، لیکن ملتِ اسلامیہ ہند کی وحدت نے اس سازش کو بھی ناکام کیا۔

اس پس منظر میں فرقہ پرست عناصر نے محسوس کر لیا ہے کہ فکر و عمل کی اصل جڑ تعلیم گاہیں ہیں، جب تک تعلیم گاہوں سے توحید اور شرک کی اس دوئی کو مٹایا نہ جائے، یہ

مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا، اسی تناظر میں ایک طرف دینی درسگاہوں کو بدنام کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے، جو ادارے حقیقی معنوں میں انسانیت کے علمبردار ہیں، ان کو دہشت گرد کہا جارہا ہے اور دوسری طرف سرکاری درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلی لائی جارہی ہے کہ وہ عملاً ہندو مذہب کا تعارف اور اس کی دعوت بن جائے اور دوسری قوموں میں کمتری اور محرومی کا احساس پیدا ہو، اس کے ساتھ ساتھ "وندے ماترم" اور "سرسوتی وندنا" پڑھنے کی تحریک شروع کی جارہی ہے، وندے ماترم مشرکانہ نظم ہے، جس میں زمین کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے، یہ ایک ایسے قوم دشمن شخص کی نظم ہے جو انگریزوں کی آمد پر خوشی مناتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بوتا ہے، سرسوتی بھی ہندو بھائیوں کے یہاں تعلیم کی دیوی ہیں، "سرسوتی وندنا" کا مطلب سرسوتی جی کی پوجا کرنا ہے، ان تمام تدابیر کا اصل مقصد و نشانہ یہی ہے کہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کو ہندو مذہب اور تہذیب میں جذب کرلیا جائے، وہ شرک سے مانوس ہوجائیں اور توحید کے پاکیزہ تصور سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں یا کسی اور قوم سے ان باتوں کا مطالبہ درحقیقت اس بات کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی اعتقادات اور تصورات سے سبکدوش ہوکر اکثریت کے مذہبی افکار کو قبول کرلیں، یہ بالواسطہ تبدیلی مذہب کی سازش ہے، یہ محض قومی مسئلہ نہیں، بلکہ خالص مذہبی اور اعتقادی مسئلہ ہے اور مسلمانوں کے لئے مذہبی اعتبار سے گویا یہ موت وزیست کا مسئلہ ہے۔

یہ نہ صرف اقلیتوں کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ ہمارے اس کثیر قومی ملک کے سیکولر کردار اور جمہوری اقدار کا بھی علانیہ قتل ہے، اس لئے یقیناً یہ ایسی بات ہے جو ہر محب وطن شہری کو تڑپادے اور اس ملک سے پیار رکھنے والوں کو بے چین کردے۔

اسلام میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سب سے زیادہ مقدس مقامات ہیں، لیکن یہاں کی خاک بھی ان کے لئے قابل پرستش نہیں، انبیاء کرام اور محمد رسول اللہ ﷺ ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ برگزیدہ شخصیتیں ہیں، لیکن وہ ان کی "وندنا" اور "بندگی" کے بھی قائل

نہیں، اس لئے وہ کیوں کر اپنے مطالبات کو پورا کر سکتے ہیں؟ پھر مسلمانوں نے اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی ہے، اگر انہوں نے عقیدہ و مذہب کے معاملہ میں جبر کا یہ راستہ اختیار کیا ہوتا تو شاید یہاں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ نہیں ہوتا اور پورا برصغیر ایک مذہب اور ایک تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوتا، لیکن مسلمانوں نے مذہب و عقیدہ، تہذیب و تمدن یہاں تک کہ زبان کے بارے میں بھی کبھی جبر و دباؤ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

ان حالات میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ:

۱) وہ زیادہ سے زیادہ نجی عصری درسگاہیں قائم کریں، تاکہ سرکاری درسگاہوں کی اس "مذہبی دہشت گردی" سے محفوظ رہ سکیں۔

۲) نصاب تعلیم میں ہونے والی زہرآلود تبدیلیوں اور تاریخ لکھنے کی کوشش کا پوری قوت سے مقابلہ کریں اور سرکاری درسگاہوں میں "وندے ماترم" کے صرف ترنم ہی کی مخالفت نہ کریں، بلکہ ملک کے سیکولر کردار اور دستوری تحفظات کے پس منظر میں اس بات کی مہم چلائیں کہ کوئی بھی مذہبی نظم سرکاری اسکولوں میں پڑھائی نہ جائے۔

۳) گاؤں گاؤں قریہ قریہ دینی تعلیم کے جز وقتی اور ہمہ وقتی مراکز قائم کریں، اس بات کا نظم کریں کہ کوئی مسلمان بچہ دین کی بنیادی تعلیم سے ناآشنا نہ رہے، نیز مسلمان اپنے زیر انتظام عصری درسگاہوں میں بنیادی دینی تعلیم کا اہتمام کریں اور طلبہ و طالبات کو اسلامی تہذیب سے قریب کریں۔

۴) دینی مدارس اس وقت ہمارے ملک میں اسلامی اقدار کی حفاظت اور اسلام کے خلاف فتنوں کی مدافعت کا سب سے بڑا مرکز ہیں، ان کو تقویت پہنچائیں اور ان پر کوئی آنچ نہ آنے دیں۔

۵) اپنے بچوں کے دلوں میں شرک کی نفرت، ایمانیات اور عقیدۂ توحید کو ان کے دلوں میں خوب راسخ کریں۔

۶) نئی نسل کو منظم طور پر مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی، علمی، ادبی اور سیاسی تاریخ سے روشناس کریں۔ ہندوستان کی سچی اور حقیقت پر مبنی تاریخ انہیں پڑھائیں، تاکہ

مسلمان بچے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں اور وہ یہ سمجھنے کے موقف میں ہوں کہ ہم نے ہندوستان کو لوٹا نہیں، بلکہ اس ملک کو سنوارا ہے اور اس کو بہت کچھ دیا ہے۔

۷) برادرانِ وطن میں تعلیم یافتہ سنجیدہ اور سادہ ذہن لوگوں کو تحریری اور اجتماعی اور تقریری و تحریری طور پر بتائیں کہ ہندو سے مراد اور اس قسم کی باتوں کا مطالبہ کرنا گویا ان سے اپنے دین و مذہب سے بے تعلق ہو جانے کا مطالبہ ہے۔

اگر ہم نے اس وقت اس جانب توجہ نہیں دی تو نہ معلوم مستقبل کا نقشہ کیا ہوگا؟؟ کہ:

گوشۂ امن نہیں آج بھی بلبل کو نصیب
چشمِ صیاد بہر سو نگراں آج بھی ہے

{۱۳ دسمبر ۱۹۹۸ء}

پھر کسی صلاح الدین ایوبیؒ کی ضرورت ہے!

۳۴ سال پہلے عالمِ اسلام پر ایک ایسی کاری ضرب لگی جس کا درد ہر باشعور مسلمان کو تڑپاتا ہے اور جس کی ٹیس ہر صاحبِ ایمان اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے، یہ زخم تھا ۷ جون ۱۹۶۷ء کو مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس پر اسرائیل کے قبضہ کا، افسوس کہ ہم مسلمان یہاں تک کہ مسلم ممالک بھی اس ناقابلِ فراموش واقعہ کو فراموش کرتے جارہے ہیں، کسی قوم کے لئے سب سے بڑی محرومی کی بات یہ ہے کہ وہ لٹ جائے اور اسے لٹنے کا احساس نہ ہو، وہ اپنے سرمایۂ قلم سے بھی محروم ہو جائے، اور محرومی کا احساس بھی اس کے دل و دماغ سے رخصت ہو جائے، علامہ اقبال نے خوب کہا ہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بیت المقدس وہ مقدس مقام ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے یکساں طور پر متبرک ہے، یہیں معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو عالمِ بالا کا سفر کرایا گیا، پیغمبرِ اسلام ﷺ نے نبوت کے بعد سولہ ماہ سے زیادہ عرصہ تک اسی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمائی، اسی لئے یہ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر کے کچھ عرصہ بعد سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے بیت المقدس کی بھی تعمیر فرمائی تھی، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت مسیح علیہ السلام اور کتنے ہی انبیاءِ کرام کی حیاتِ طیبہ اسی مبارک مقام سے متعلق رہی ہے، شہر بیت المقدس کے قرب و جوار میں بھی مختلف مزارات ہیں، جو مختلف پیغمبروں سے منسوب ہیں، اسی لئے

اسلام کی نگاہ میں اس شہر اور اس مسجد کی خاص اہمیت ہے۔

ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ سے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ حشر و نشر کی سرزمین ہے، یہاں آؤ اور نماز ادا کرو کہ اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنا دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نماز ادا کرنے کے برابر ہے، ان صاحب نے استفسار کیا کہ اگر میرے اندر وہاں تک جانے کی استطاعت نہ ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کم سے کم تیل کا ہدیہ ہی بھیج دو جو وہاں چراغ میں کام آئے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۱۴۰۷)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی، اس میں ایک دعا ایسی حکومت کی تھی جو آپ کے بعد کسی کو میسر نہ آئے اور اس میں ایک دعا یہ بھی تھی کہ جو اس مسجد میں صرف نماز کے لئے آئے تو اس کے گناہ اس طرح معاف ہو جائیں گویا وہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین دعاؤں میں سے دو تو قبول ہو ہی گئی، اور مجھے امید ہے کہ یہ تیسری دعا جو مغفرت سے متعلق تھی، وہ بھی مقبول ہو گئی ہوگی (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۱۴۰۸) اور یہ روایت تو حدیث کی متعدد کتابوں میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خاص طور پر تین ہی مسجدوں کے لئے سفر کرنا درست ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۱۴۰۹، ۱۴۱۰) اس لئے مسلمانوں کو اس مقدس اور متبرک مقام سے ہمیشہ قلبی اور جذباتی تعلق رہا ہے۔

اسلام سے پہلے یہ شہر بار بار تخت و تاراج کیا گیا، خاص کر چھٹی صدی قبل مسیح بابل کے حکمراں بخت نصر نے اس شہر اور اس کے مقدس مقامات کی جس طرح اینٹ سے اینٹ بجائی اور ایک لاکھ یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا، وہ تاریخ کے اہم واقعات میں سے ایک ہے، یہودی جو اپنے آپ کو اس شہر کا اصل وارث سمجھتے ہیں صرف تقریباً ۷۳ سال ہی اس شہر پر برسر اقتدار رہے، حضرت عمرؓ کے عہد میں ۶۳۶ء میں بیت المقدس کا علاقہ حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے فتح کیا، مسلمان چاہتے تھے کہ شہر میں خون ریزی نہ ہو اور صلح کی صورت نکل آئے، عیسائیوں نے یہ شرط لگائی کہ خلیفۃ المسلمین

خود آکر اس معاہدے پر دستخط کریں۔ حضرت عمرؓ نے اسے قبول فرمالیا، اور مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر رجب ۱۶ھ میں بیت المقدس تشریف لائے۔ بیت المقدس سے پہلے ہی جابیہ نامی مقام پر اسلامی لشکر نے حضرت عمرؓ کا استقبال کیا، وہیں عیسائی رہنما بھی آگئے، اور معاہدۂ صلح کی تحریر عمل میں آئی۔ اس معاہدے کے تحت عیسائی باشندوں کی جان و مال، مذہبی مقامات، حضرت مسیحؑ کی مورتیوں وغیرہ کی حفاظت کی ضمانت دی گئی، چونکہ عیسائی یہودیوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی اس خواہش کو بھی قبول فرمایا، اور یہودیوں کی الگ آبادی بنائی گئی۔

اس کے بعد سے یہاں برابر مسلمان حکمراں رہے یہاں تک کہ گیارہویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگیں شروع ہوئیں، اور ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ کو عیسائی دوبارہ فاتحانہ بیت المقدس میں داخل ہوئے، انہوں نے شہر میں ایسا قتل عام مچایا کہ بچے، بوڑھے، جوان اور مرد و عورت کو بلا امتیاز تہہ تیغ کیا گیا، شہر میں لاشوں کے انبار لگ گئے، خود مغربی مورخین نے اس خوں آشامی کا اعتراف کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ صرف ایک دن میں شہر اور اس کے مضافات میں ستر ہزار افراد شہید کئے گئے، یہ سلوک ٹھیک اس کے برعکس تھا، جو حضرت عمرؓ اور مسلمان فاتحین نے عیسائیوں کے ساتھ روا رکھا تھا، سقوط بیت المقدس کے اس واقعے نے پورے عالم اسلام کو بے چین اور بے سکون کر کے رکھ دیا، یہاں تک کہ ۱۱۶۹ء میں سلطان نورالدین زنگی جیسے خداترس بادشاہ کے بھیجے ہوئے مجاہد اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی مصر کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے، اور شام کے علاقے فتح کرتے ہوئے ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو فتح کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے احسان فراموش عیسائیوں کے ساتھ ایسی رحم دلی کا سلوک کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ملے گی، چنانچہ خود عیسائی دنیا (جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا تھی) پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ آخر کار تو ۹۱ سال کے بعد قبۃ الصخرہ پر لگائی گئی سنہری صلیب اتاری گئی، اور اس کی جگہ "ہلال" نصب کیا گیا، جب ہی سے ہلال مسلم ملکوں کا شعار سمجھا جانے لگا۔ یہ اکیانوے سال کا عرصہ مسلمانوں کے لئے بڑا تکلیف دہ اور غم انگیز عرصہ تھا، کہ پورے

عالم اسلام کی آنکھیں بے سکون اور دل بے قرار تھے۔

خلافت عثمانیہ ترکیہ کے دور میں ہی یہودیوں نے سازشیں بھی شروع کر دی تھیں۔ لیکن خلیفہ نے کسی قیمت پر یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت نہیں دی، بالآخر مغربی سازشوں سے خلافت عثمانیہ کا سقوط ہوا، اور ۱۹۴۸ء میں عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گھونپ دیا گیا، یہ ظلم بڑھتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کا قبلہ اول ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا، میرے خیال میں پہلی صلیبی جنگ کی شکست اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سب سے بڑا حادثہ اور سب سے اندوہناک سانحہ تھا، کہ اگر اس واقعہ پر آسمان خون کے آنسو بہاتا اور زمین کا سینہ شق ہو جاتا تو بھی باعث تعجب نہ تھا، لیکن آہ! ہم مسلمانوں کی بے حسی اور بے شعوری کہ ہماری نسلوں نے تو اس واقعہ کو بھی اپنے ذہنوں سے مٹا دیا ہے، اور مسلمان حکمراں اسرائیل سے ایسا کتراتا اور عاجز و مجبور فلسطین مانگ رہے ہیں، کہ شاید کوئی فقیر بھی ایسی الحاح و لجاجت سے دست سوال دراز نہ کرتا ہوگا، اور کیوں نہ ہو، کہ "بے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"!

صورت حال یہ ہے کہ ہزار خوشامد کے بعد عربوں سے کچھ وعدے کئے جاتے ہیں اور پھر بلا ادنیٰ جواز کے ان سے انکار کر دیا جاتا ہے، ۱۳ ستمبر تک فلسطین کے سلسلے میں قطعی معاہدہ کی تاریخ طے تھی اور خیال ہوتا تھا کہ شاید مسلمان قبلہ اول کی واپسی کا مژدۂ جانفزا سنیں گے، لیکن ہوا تو کیا ہوتا؟ اب طرح طرح کے شکوک و شبہات کی گھٹائیں چھائی جا رہی ہیں اور ڈر لگتا ہے کہ خدانخواستہ اقتدار کا لالچی گروہ بیت المقدس کے حق سے ہی دست بردار ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو اس محرومی کے ساتھ فلسطینی مسلمانوں کے لئے ایک جسد بے روح ہی ہوگی۔

اگر مسلمان اپنی صفوں میں وحدت کا ثبوت دیتے اور عالم اسلام ٹکڑیوں میں بٹ نہ گیا ہوتا، قومی تعصب اور علاقائیت کے غیر اسلامی نعروں نے عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں کی صورت میں بانٹ نہ دیا ہوتا تو آج مسلمانوں کو ایک حقیر گداگر کی طرح ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آتی، بلکہ وہی اس سرزمین کی قسمت کا مالک ہوتے، انسان کی

طلب اور اس کی تڑپ کے اعتبار سے نصرت الٰہی متوجہ ہوتی ہے، جب انسان کا ذہن بھی طلب سے خالی ہو اور خدا کے بجائے ظاہری و فانی سہاروں پر انسان نے انحصار کر رکھا ہو تو ان کے ساتھ کیوں کر خدا کی مدد ہو سکتی ہے؟ عرب ممالک پر قومیت کا ایسا نشہ مسلط ہوا کہ عرب بنا علاقہ کے اسلام کے بجائے عرب قومیت کے نام سے اپنے قضیے کا آغاز کرتے تھے، اور مذہب کے بجائے خالص قومی و نسلی حیثیت سے اس مسئلہ کو پیش کرتے تھے، اس سے بڑھ کر اپنے خالق و مالک سے بغاوت کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اسی لئے افغانستان میں نہتے اور بے کس و بے سرو سامان مجاہدین نے روس جیسی بڑی طاقت کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ بوسنیا میں ہر طرح کی اعانت سے محروم دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمان اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن فلسطین میں ایسا کچھ نہ ہو سکا، خود فلسطینی تحریک میں بھی جب تک مخلص مجاہدین اور تحریک حماس کی شرکت نہ ہوئی کامیابی کی منزل دور سے دور تک ہوتی رہی، آج اگر اسرائیل یاسر عرفات سے گفتگو کرتا ہے تو یہ عرب قوم پرستوں کی جدوجہد کا نتیجہ نہیں بلکہ مخلص مجاہدین کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس لئے پھر ضرورت ہے کہ قبلۂ اول کی محرومی کا احساس مسلمانوں کو تڑپائے، اور یہ تڑپ خدا کی طرف ان کو متوجہ کرے، جب ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت متوجہ ہو سکتی ہے، اور مسلمانوں کا قبلۂ اول ان کو واپس مل سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج پھر عالم اسلام کو وقت کے صلاح الدین کا انتظار ہے، خدا کرے وہ وقت جلد آئے اور مسلمان عالم کو اس ذلت و نکبت اور رسوائی سے نجات ملے، جس سے وہ اس وقت دوچار ہیں!!

(۱۵/ ۹/ ۲۰۰۰)

تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں!

جس وقت یہ سطریں قارئین کی نظروں سے گزر رہی ہوں گی، نہ معلوم حوصلہ مند، غیور اور خوددار افغانوں کی سرزمین پر کیا گزر رہی ہوگی؟ وہ افغان جنہوں نے پورے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اختیار کر لینے کے باوجود افغانستان میں ان کے قدم جمنے نہیں دیئے، اور جن کی غیرت ایمانی اور حمیت افغانی نے روس جیسے ملک جو کسی خطۂ ارض میں ایک بار قدم رکھنے کے بعد وہاں سے ہٹنا نہ جانتے تھے، اور سربزیری اور شرمندگی جس کی لغت میں نہیں تھی، بھی ہمت جواں اور حوصلۂ لازوال کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، اور یہیں سے سوویت یونین کا بکھراؤ شروع ہوا، اب اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے متکبر طاقت امریکہ اس لٹی پٹی بے سروسامان لیکن غیرت ایمانی سے معمور قوم سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہے، افغانوں کی جگہ کوئی اور قوم ہوتی تو نہ جانے کتنی بار امریکہ کے سامنے رکوع و سجود بجا لا چکی ہوتی، لیکن یہاں قوم کی ہمت مردانہ ہے کہ وہ اب بھی خم ٹھوک کر کہہ رہی ہے کہ:

ادھر آؤ ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

دیکھئے! یہ آزمائش کیا رنگ لاتی ہے، مغربی لٹیروں کے ہاتھوں کیسی کیسی انسانیت سوزیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، اور مغرب کی روایتی وحشت گردی اور آبائی صلیب جنوں آشائی کیا رنگ لاتی ہے؟ اللھم زلزل اقدامھم و خذھم اخذ عزیز مقتدر!

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب عیار فطرت قوم یہودیوں کی سازش ہے، جس کا مقصد عالم اسلام کو بدنام کرنا، امریکہ اور مغربی ملکوں کو مسلمانوں کے بارے میں بدگمان کرنا اور

صدر بُش یہودیوں کے بارے میں جو ایک گونہ موافق ذہن رکھتے ہیں، اس ذہن کو توڑنا ہے، انتخاب کے وقت بُش اور یہودیوں کے درمیان جو رنجش ہے، اسے امریکی قوم نے واضح طور پر اس کو محسوس کیا ہے۔ پھر بُش کا بیٹا جس کی یہودی کو نکالنے کی، اور بُش جو بُش کا یہودیوں سے بعد معروف ہے، اگر بیٹا بھی ایک اہم منصب کے حامل ہوئے۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کی طرف نفرت کا رخ موڑنے کے لئے یہودیوں نے یہ بات ضروری محسوس کی ہوگی کہ اسامہ بن لادن کا ہوا کھڑا کیا جائے، چنانچہ امریکی خفیہ ایجنسی کی ایک رپورٹ میں خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ حادثہ میں اسرائیلی خفیہ ادارے ''موساد'' کا ہاتھ ہوسکتا ہے، مگر اندیشہ اس بات کا ہے کہ یہودی سازش بہت ہی خوبصورتی سے اس کو ایسا منظر میں ڈال رہے ہیں کہ امریکہ کو دوبارہ ایک نئی جنگ میں جھونک دے۔

دنیا کے قانون میں یہ بات مسلّم شدہ ہے کہ سزا مجرم کو دی جاتی ہے، نہ کہ ملزم کو، ملزم وہ ہے جس پر جرم کا الزام ہو، اور مجرم وہ ہے جس پر یہ الزام ثابت ہوگیا ہو۔ اسامہ بن لادن کے معاملہ میں طالبان یہی کہتے ہیں کہ اگر ان کے جرم کا ثبوت پیش کردیا جائے تو وہ انہیں حوالہ کرنے کو تیار ہیں، باوجودیکہ افغانستان اور امریکہ کے درمیان مجرموں کی حوالگی کا کوئی معاہدہ نہیں ہے، پھر بھی افغانستان کی طرف سے یہ پیشکش ان کی فراخدلی اور انصاف پروری کو ظاہر کرتی ہے، اور عین مطابق انصاف ہے۔ لیکن امریکہ کا ایک ہی بےجا اصرار ہے کہ اسامہ کو زندہ یا مردہ اس کے حوالہ کردیا جائے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حادثہ پیش آیا، اور جس طرح اس میں بے قصور جانیں ضائع کی گئیں، وہ انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ بات ہے، اور اس سے امریکہ جیسی سپر طاقت کا سیکورٹی نظام مشکوک ہوکر رہ گیا ہے، اور ایک اکیلی سپر طاقت کے لئے اس طرح کا واقعہ پیش آجانا بہت رسوا کن امر ہے، لیکن محض اپنی ہیبت کو دور کرنے کے لئے بغیر تحقیق کسی کو اپنے جور و ستم کا ہدف بنادینا کیا دہشت گردی سے بڑھ کر دہشت گردی نہیں ہوگی؟

دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کیا تمام انسانوں کے خون کی قیمت برابر ہے، یا ایک خطہ میں بسنے والے انسانوں کا خون زیادہ اہم اور دوسرے خطہ میں بسنے والے انسانوں کا

کم اہم ہے؟ فرق درست نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غیر مسلموں کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح ہیں، دماؤھم کدمائنا و اموالھم کاموالنا۔ امریکہ خود جس دہشت گردی کا مرتکب ہو رہا ہے اور جس طرح اس نے انسانی خون کو ارزاں کیا ہے، جنگ کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔ ۱۹۴۵ء میں اس نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا، جس میں ۷۰ ہزار اشخاص بیک لمحہ موت کی نیند سو گئے، اور اتنے ہی زخمی ہوئے، اور صرف تین دنوں بعد ناگاساکی پر دوسرا بم گرایا، جس میں چالیس ہزار افراد بیک وقت لقمۂ اجل بن گئے، اتنے ہی زخمی ہوئے، اور اب تک اس خطہ میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ معذور اور ناقص الخلقت، اور زمین اتنی بنجر ہو گئی ہے کہ اب تک سبزہ کی روئیدگی سے محروم ہے۔ عراق میں امریکہ کی بے جا پابندیوں کی وجہ سے لاکھوں بچے مر چکے ہیں، اور کتنے ہی مریض ہیں جو دواؤں کے لئے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں، امریکہ کی کھلی ہوئی پشت پناہی کی بنا پر اسرائیل ہر دن بے قصور فلسطینیوں کا قتل عام کر رہا ہے، کیا ان انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے اور کیا یہ دہشت گردی نہیں بلکہ انسانیت نوازی ہے؟

عجیب بات ہے کہ مغربی ممالک مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں، بلکہ مغرب کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اسلام اور دہشت گردی مترادف الفاظ ہو گئے ہیں، حالانکہ دہشت گردی تو اصل میں مغرب کا طرۂ امتیاز رہا ہے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم کن قوموں کی دین ہے؟ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں ۱۰۰ لاکھ فوجی ہلاک، ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ معذور اور ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ لاپتہ ہوئے، اور دوسری جنگ عظیم میں ساڑھے تین کروڑ آدمی مارے گئے، اور دو کروڑ معذور ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد روس نے معذور فوجیوں کے لئے مصنوعی اعضاء بنانے اپنے کارخانوں کو جو آرڈر دیئے وہ تو دیئے ہی، جب یہ کافی نہ ہوئے تو ۳۰ لاکھ مصنوعی پیر بنانے کا آرڈر امریکی کارخانوں کو دیا، اور یہ سب کچھ معذور فوجیوں کے لئے۔ عام شہری جو معذور ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں، فرانس نے الجزائر پر جو مظالم ڈھائے، برطانیہ اور پرتگال نے اپنی نو آبادیات پر جو جور و ستم روا

رکھا اور امریکہ نے ویتنام میں جو جنونی آتش فشانی کی، وہ تاریخ کبھی بھلا نہ سکے گی۔ فلسطین پر تو ستم ہیں، بوسنیا میں جس طرح مسلمانوں کا قتل عام ہوا، بے قصوروں سے عقوبت خانے سجائے گئے، عورتوں کی کھلے عام عصمت دری کی گئی، اور سینکڑوں مسجدیں شہید کر دی گئیں، اور اذیت رسانی کے ایسے واقعات پیش آئے کہ شاید ہی ظلم و جور کی تاریخ میں اس کی مثال مل سکے، یہ سب مغرب کی دہشت گردی کی ادنیٰ مثال ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی اس وقت دہشت گردی کی مذمت میں پیش پیش ہے، اور وزیر داخلہ جناب ایڈوانی بار بار ممبئی بم دھماکہ کی یاد دلاتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ دھماکہ دہشت گردی کا واقعہ ہے، لیکن کیا بھاگلپور اور مراد آباد کا قتل عام، ممبئی اور سورت میں بربریت کا ننگا رقص، ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے خلاف خونی یلغار اور عیسائی مبلغین پر انسانیت سوز حملے، دہشت گردی نہیں ہے؟ جب ہم دہشت گردی کی مذمت کریں تو اس میں تفریق و امتیاز نہ ہونا چاہئے، اور ہمیں اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ شدت پسند غیر قانونی گروہوں کے مقابلہ قانون کی پابند کسی ریاست یا مملکت کی دہشت گردی زیادہ شرمناک، زیادہ ناقابل افسوس اور زیادہ قابل مذمت ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ وقت نہایت نازک اور صبر آزما ہے کہ ایک مسلم ملک کو بے ثبوت اور بلا دلیل ظلم و جور کا ہدف بنایا جا رہا ہے، تمام باطل طاقتیں اپنے ناپاک عزائم کے لئے متحد ہیں، اور مسلمان حکومتیں حقائق کا سامنا کرنے سے آنکھیں چرا رہی ہیں، اور بزدلی کا شکار ہو کر "بے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" کی حقیقی تصویر بنی ہوئی ہیں، ان حالات کی عکاسی رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے والے دسترخوان پر گرتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا: کیا اس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس وقت بڑی تعداد میں ہو گے، لیکن تمہارے اندر "وہن" پیدا ہو جائے گا، صحابہ نے دریافت کیا: "وہن" کیا شئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ لوگ تم پر جری ہو جائیں گے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی وجہ دو باتیں ہوں گی: حب الدنیا و کراہیۃ الموت "زندگی کی

محبت، اور موت کو خوف" (ابوداؤد)

اس وقت واقعہ ہے کہ یہودی، عیسائی اور مغربی طاقتیں اسلام کے خلاف متحد ہو کر کھڑی ہوگئی ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے تین باتیں نہایت اہم ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اور اللہ سے اعداء دین اور معاندین اسلام کے مقابلہ کے لئے نصرت غیبی کی طلب، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صلوۃ اور صبر کے ذریعہ اللہ کی مدد کے طالب ہو، استعینوا بالصبر والصلوۃ صلوۃ کا ترجمہ نماز سے کیا جاتا ہے، لیکن صلوۃ دراصل رجوع الی اللہ کا عنوان ہے، کیوں کہ نماز کی کیفیت ایسی کیفیت ہے جس میں انسان اپنا سراپا خدا کے حضور رکھ دیتا ہے، اور یہ خدا کی طرف رجوع کرنے کی کامل ترین صورت ہے، چنانچہ اس وقت مسجدوں میں دعاء اور قنوت نازلہ کا اہتمام ہونا چاہئے۔ دوسری ضروری چیز حکمت و تدبیر ہے، تدبیر کیا ہے؟ عقل کو جذبات پر اور ہوش کو جوش پر غالب رکھنے کا نام، اسی کو قرآن نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے، اور اسی کو حدیث میں "فراست ایمانی" کہا گیا ہے، بعض اوقات حکیمانہ فیصلے کے لئے اپنے جذبات کا آپ خون کرنا پڑتا ہے، لیکن اسی میں وسیع تر مستقبل کی بھلائی اور فلاح مضمر ہوتی ہے۔

تیسری ضروری چیز امت کی وحدت اور اس کی شیرازہ بندی ہے، اس وقت مسلمانوں کا باہمی اختلاف و انتشار ضرب المثل بن چکا ہے، اور مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح تک یہ بکھراؤ موجود ہے، اگر اس وقت عالم اسلام متحد ہوتا تو مغربی طاقتوں کے لئے ایسی بے دلیل وحشت ستم انگیزی کی شاید جرأت نہ ہوتی، خود ہم ہندوستان کے حالات دیکھیں، کہ ایک طرف فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں، مسلم اداروں اور تحریکات کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی ہیں، اور صیہونی اور صلیبی طاقتوں سے ان کا ربط مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے، اور دوسری طرف ہم اپنے فروعی مسائل میں مناظرہ کی مجلس گرم کر رہے ہیں، اور ایک دوسرے کی تذلیل و تحقیر کی مہم چلا رہے ہیں، یہ نہایت ہی افسوس ناک صورت حال ہے، اور ہماری فراست ایمانی اور غیرت اسلامی

کے لئے کھلا ہوا چیلنج ہے۔

گو حالات بہت ابتر ہیں، لیکن اسلام بارہا ایسی ابتلاؤں اور آزمائشوں کا مقابلہ کر چکا ہے، اور یقین ہے کہ اعدائے دین کسی قدر بھی ظلم و تعدی اور فریب و عیاری کی راہ اختیار کریں وہ حق و راستی کے چراغ کو بجھا نہ پائیں گے۔ اور یہ نور اپنے اوج کمال کو پہنچ کر ہی رہے گا۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون!!

(..........)

کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟

اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیا کے سب سے متعصب ملک نے ایک اپنے چھوٹے سے پس ماندہ ملک کو کسی دلیل اور حجت کے بغیر اپنی دست درازی اور ستم رانی کا نشانہ بنا رکھا ہے جو قدرتی طور پر زلزلہ زدہ، سونامی سے متاثر، مفلوک اور سالہا سال سے جنگی حالات سے دوچار ہے، اور جو ایک عرصہ سے دو بڑی بڑی طاقت کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکا ہے، اس قوم کی غیرت وحمیت کا حال یہ ہے کہ اس پسماندہ اور نہتے ملک کا مغرب ومشرق کی طاقتوں نے بار بار امتحان لیا ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس امتحان میں پورا اترا ہے، جن لوگوں کو اپنے دست وبازو پر ناز تھا، اس بے دست وپا قوم نے ان سے پنجہ آزمائی کی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت نے انہیں ان کی بد اعمالیوں کا مزا چکھایا ہے، خدا کرے کہ پھر اس غیبی طاقت کو جوش آئے اور اس عہد کا فرعون پاش پاش ہو کر رہ جائے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

سوال یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے ان مظلوم اور نہتے بھائیوں کی اخلاقی مدد کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے، انہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ ___ رسول اللہ ﷺ نے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے؛ یعنی دل سے برا سمجھے، اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی قدرت دیں گے، وہ اسے روکنے کی کوشش کرے گا (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۴۰) ___ ظلم وجور سے بڑھ کر کوئی منکر اور برائی نہیں، یہ تو دنیا میں شرک سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ دنیوی احکام کی حد تک شرک کو گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن ظلم اور زیادتی ہے، جو کسی

ضرور یہ قابل قبول نہیں ہوسکتا، تاہم یہ بات کہ جو شخص پہلے سے اس عقیدہ پر ہو اسے قتل کرنا جائز ہو، لیکن اگر کوئی شخص ان کو ان کے دین سے نکالنے کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہو یا کسی کو قتل کر رہا ہو تو وہ اس کا حق ہے، پس ظلم سب سے بڑی برائی ہے، اور اپنی طاقت و صلاحیت بھر اس کی مخالفت واجب ہے!

مخالفت اور ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ترک تعلق بھی ہے، اور ظالموں کے ساتھ ترک تعلق کی تعلیم خود قرآن مجید نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود و النصاری اولیاء، بعضھم اولیاء بعض، ومن یتولھم منکم فانہ منھم، ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین (المائدۃ:۵۱)

اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو دوست رکھے گا، وہ ان ہی میں سے ہوگا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

اس آیت میں ایک جامع لفظ "دوست نہ بناؤ" کا استعمال کیا گیا ہے، یہ ایک معنی خیز تعبیر ہے، جس میں قلبی لگاؤ کی محبت، فکر و نظر کی تائید، سماجی زندگی کی مشارکت اور دنیوی معاملات و تعلقات سب شامل ہیں، یہ کوئی مذہبی تعصب پر مبنی حکم نہیں ہے، بلکہ ظلم کے خلاف ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، اس آیت کے اخیر میں ظالموں کا تذکرہ کرکے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ جو یہود و نصاریٰ ظلم و جور پر کمر بستہ ہوں، مسلمانوں کے لئے اپنی طاقت و قدرت کے مطابق ان سے بے تعلقی برتنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس حکم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و

اخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون (الممتحنۃ ۹)

بیشک اللہ تم لوگوں کو ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع کرتے ہیں، جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تم کو تمہارے گھروں سے نکالا، اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، اور جو ان سے تعلق رکھیں، وہ بھی ظالم ہیں۔

گھروں سے نکالنا، محض دین کی بنا پر آمادۂ قتل وقتال ہونا اور جو لوگ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں کو ویران کرنے پر تلے ہوئے ہوں، ان کو مدد پہنچانا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل ہونے کی بنا پر یہودیوں اور نصرانیوں سے بے تعلق رہنے کا حکم دیا گیا ہے، غور کیجئے کہ کیا آج امریکہ و برطانیہ ان جرائم کے مرتکب نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بوسنیا میں مسلمانوں کے قتلِ عام میں در پردہ برطانیہ نے ظالم سربوں کی مدد کی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج ان ممالک کی جفا کاریوں اور ستم انگیزیوں کی وجہ سے افغانستان کے بے آسرا مسلمان اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہیں؟ کیا یہ اس ظالم اسرائیل کے ناصر و مددگار نہیں ہیں، جو آئے دن بے قصور فلسطینی مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے ہیں؟ اور جنہوں نے لاکھوں فلسطینیوں کو اپنے ہی وطن میں رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا ہے؟ قرآن نے جن یہود و نصاریٰ سے بے تعلق ہونے اور رشتۂ محبت کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، ان مغربی طاقتوں میں ان میں سے کون سی بات نہیں پائی جاتی؟

جناب بخشی نے اس جنگ کو تہذیبی اور صلیبی جنگ کا نام دے کر کیا اس بات کا صاف اعلان نہیں کر دیا کہ انہیں افغانستان کے بے آب و گیاہ صحراؤں اور خشک پہاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کا اصل نشانہ وہ لوگ ہیں، جو اپنی سرزمین میں اس سرزمین کے باسیوں کی رضامندی سے اللہ کے دین کو جاری و قائم کرنا چاہتے ہیں، نہ وہ کسی ملک سے قرض کے طلب گار ہیں، نہ انہوں نے پڑوسی ملک کی طرح سوشل

رہا یہ کہ ناسپاسی مغرب کے دروازہ پہ پہنچایا ہے، ان کا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کے اس حصہ زمین پر، جو خود ان کے قبضہ میں ہے، خدا کے دین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، تو کیا ایسے افراد دین سے بے تعلقی واجب نہ ہوگی؟

لا ينهكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين
ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا
اليهم، ان الله يحب المقسطين ۔ (الممتحنہ: ۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

جو غیر مسلم بھائی انصاف کی روش پر قائم ہوں، وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں، اور ہمارے برادرانہ سلوک اور حسن اخلاق کے مستحق ہیں، اور ان کے ساتھ زیادتی کسی طور جائز نہیں —— بے تعلقی کا حکم ان لوگوں سے ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ اور معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہو، یہ سمجھنا کہ کسی خاص شخص کی حوالگی یا کسی خاص مطالبہ کی تکمیل مغربی طاقتوں کو مطمئن کر دے گی، اور اسلام کے خلاف بغض و عناد کی جو آگ ان کے سینوں میں سلگ رہی ہے، اسے بجھانے میں کامیاب ہو جائے گی، محض ایک طفلانہ خیال ہے، اس عناد کا اصل نشانہ اسلامی فکر و عقیدہ، اسلامی تہذیب و ثقافت، اور اسلامی نظام حیات ہے، قرآن نے یہود و نصاریٰ کی نفسیات اور ان کے اندرونی جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے، اور یہ جس قدر رسول اللہ ﷺ کے عہد میں سچی ہو اتھی، اسی قدر آج بھی ہے کہ:

لن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع
ملتهم، قل ان هدى الله هو الهدى ولئن اتبعت اهواء
هم بعد الذي جاءك من العلم، مالك من الله من ولي

ولا نصیر۔ (البقرہ ۱۲۰)

یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آپ ان کے دین کے پیروکار نہ ہو جائیں، آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی ہے، اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ کے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

قرآن نے اس میں یہود و نصاریٰ کے اندرونی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ دورِ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے اب تک عالمِ اسلام میں جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اس کے واضح شواہد ہیں، اس لئے جب تک مسلمان اپنے مذہبی تشخصات اور اپنے ثقافتی امتیازات کو خیر باد نہ کہہ دیں اور پوری طرح مغربی فکر اور مغربی ثقافت کے سامنے جبینِ تسلیم خم نہ کر دیں، ان کی تشفی نہیں ہو سکتی، اور ظاہر ہے کہ مسلمان کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے اس لئے کہ وہ دین کے لئے سب کچھ کھونے کو "پانا" اور اللہ کی راہ میں رگِ گلو کٹانے کو "جینا" تصور کرتے ہیں، اور یہ ان کے ایمان و عقیدہ کا حصہ ہے۔

اس پس منظر میں ہم مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ ملک کی رائے عامہ کو حقیقت پسند بنائیں، اور انہیں حقیقی صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مدد دیں۔ منصف مزاج ہندو بھائیوں (جن کی آج بھی اس ملک میں اکثریت ہے) کو ساتھ لے کر حکومتِ ہند سے خواہش کریں کہ وہ اپنی غیر وابستہ پالیسی پر قائم رہے، اور امریکہ کی آنکھ بند کر کے حمایت نہ کرے، ورنہ اندیشہ ہے کہ کل ہو کر ان کا ہاتھ اسی طرح ہمارے ملک کی طرف بھی بڑھے گا، اور انہیں ہمارے ساتھ بھی تحکمانہ رویہ اختیار کرنے کی جرأت پیدا ہوگی۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امریکہ اور برطانیہ کی تجارتی اشیاء کا بائیکاٹ کریں کہ یہ بھی منکر پر ناراضگی کے اظہار اور ظالم سے بے تعلقی برتنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔

اور ہم بحیثیت مسلمان ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ اس سلسلہ میں جو صورت بھی اختیار کرنا ہمارے لئے ممکن ہو، ہم اس سے دریغ نہ کریں، یہ انسانی فریضہ ہے، یہ شرعی ضروری ہے اور حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی کا تقاضا ہم سے یہ پوچھ رہی ہے کہ کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟؟

(۱۲/۱۰/۲۰۰۹ء)

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!

مغربی قومیں بظاہر رواداری، انسانیت دوستی، وسعت نظر اور تہذیب کی علمبردار بنی ہوئی ہیں اور دوسروں کے مقابلہ میں انسانی حقوق کی حفاظت کا تو گویا انہوں نے بیڑا اٹھا رکھا ہے؛ لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے، یہ حقیقی تصویر نہیں؛ بلکہ اس پر چڑھایا ہوا خوبصورت اور دیدہ زیب غلاف ہے، اس قوم کا باطن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد اور عداوت سے بھرا ہوا ہے، گو وہ اپنی اس اندرونی کیفیت کے چھپانے کا بڑا مشاق ہے؛ لیکن جیسے برتن لبریز ہو جانے پر تو پانی چھلک ہی جاتا ہے، اسی طرح رفتہ رفتہ ان کے حقیقی ارادے کبھی کبھی حرف شکایت بن کر زبان پر آ ہی جاتے ہیں، دشمنانِ اسلام کی نفسیات اور ان کی کیفیات کے بارے میں قرآن مجید کا کیا خوب ارشاد ہے:

قد بدت البغضاء من أفواههم وما تخفي صدورهم أكبر، قد بينا لكم الآيات إن كنتم تعقلون۔ (آل عمران: ۱۱۸)

بغض ان کے منہ سے ظاہر ہوا چاہتا ہے اور ان کے سینوں نے جو کچھ چھپا رکھا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور ہم نے دلائل کو کھول کر بیان کر دیا ہے، اگر تم لوگ دانش سے کام لو۔

یہ حقیقت اس وقت ظاہر ہوئی، جب جناب بش صدر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کو "صلیبی جنگ" کے معنی خیز لفظ سے تعبیر کیا، ورنہ یہ کوئی نئی بات نہیں، مغربی قومیں ہمیشہ ... نائب وزیر خارجہ امریکہ نے ۱۹۶۷ء میں صاف کہا تھا کہ ہم یورپ اور مسلمانوں کے درمیان ہر قیمت پر صلیبی جنگیں جاری رکھیں گے، اور فرانس نے مراکش میں جنگ و جدال کے بارے میں پوری صفائی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جنگ ہلال اور صلیب کے درمیان ہے،

بوسنیا میں عیسائی مظالم سے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا کہ صلیبی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، بلکہ صرف عنوان اور اسلوب بدل گیا ہے، اگست ۱۹۹۲ء میں بوسنیائی شہر ترلے کے ایک سرب پادری ''بواصل'' نے کہا: ''بوسنیا کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ایک جنگ مقدس ہے۔'' یہ سب اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ صلیبی جنگوں کی ذہنیت ابھی یورپ کے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہے، اور اس وقت عالم اسلام اس کا واحد نشانہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خوں آشامی اور محسن کشی مغرب کی فطرت کا ایک حصہ ہے، عیسائی کلیساؤں نے اپنے دورِ اقتدار میں جو مظالم ڈھائے ہیں، کون تاریخ آشنا اس سے ناآشنا ہوگا، کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں ۱۱،۵۰ لاکھ اشخاص کو کلیسا نے پوپ کی حکم عدولی پر نہایت ہی بے دردی کے ساتھ اور سخت اذیتوں سے تڑپا تڑپا کر سولی پر چڑھا دیا، ۱۴۸۱ء سے ۱۴۹۹ء تک صرف ۱۸ سال کے عرصے میں ملحدین کی تفتیش کرنے والے محکمہ نے ایک ہزار دس افراد کو زندہ جلا دیا، ۶۸۶۰ انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے، سائنس دانوں اور دانشوروں پر عرصۂ حیات تنگ تھا، کہا جاتا ہے کہ محکمہ تفتیش نے ۳۲ لاکھ سے زیادہ اہلِ علم کو زندہ نذرِ آتش کر دیا، پارملی (Pamlli) کو صرف یہ کہنے پر کہ ''ستارے اپنی جگہ سے نہیں گرتے'' بے تحاشہ تازیانے لگائے گئے، کامپلینڈ (Campland) کو محض اس عقیدہ کی بنا پر کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی دنیائیں ہیں، ۲۳ دن تک جیل بھیجا گیا، بعض سائنس دانوں کو صرف یہ کہنے کے جرم میں کہ انسان کی رگوں میں خون حرکت کرتا ہے، سخت ترین سزائیں دی گئیں، گیلیلیو (Galileo) یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ زمین متحرک ہے، عیسائی علماء اسے خلاف مذہب تصور کرتے تھے، اس بنیاد پر اسے قید بامشقت کی سزا دی گئی، حد یہ تھی کہ مردوں کے خلاف بھی عقیدہ کی تفتیش کی جاتی تھی، اور کسی میت کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ بدعقیدہ تھا تو اس کی جائداد ضبط کر لی جاتی، ورثہ محروم کر دئے جاتے، اور مخبری کرنے والوں کو ۳۵ روپے سے ۵۰ فیصد تک اس کا ترکہ دے دیا جاتا تھا۔ (مغربی تمدن کی ایک جھلک، سید مجتبیٰ موسوی: ۲۲،۲۳)

۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۰ء تک مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگوں کا سلسلہ رہا، جب مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور فراخدلی

کا مظاہرہ کیا، نبی ﷺ کی فوج نے بچوں، عورتوں، بوڑھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے آگے بڑھتی اور مفتوحین کے ساتھ ایسا سلوک کرتی کہ درندوں نے بھی خواب و خیال میں اس کا تصور نہ کیا ہوگا۔ خود عیسائی مورخین کا بیان ہے کہ جب بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو یہ حال تھا کہ گذرنے والے گھوڑے زانوں تک خون میں ڈوب جاتے تھے، اور ہر طرف انسانوں کے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں نظر آتے تھے۔

اس وقت جو مغربی ممالک انسانیت دوستی کا علم اٹھائے ہیں، خود ان کا کیا حال ہے؟ گذشتہ ۱۱ سی آئی اے کی سازش سے ۱ لاکھ ۴۰ ہزار افراد کا قتل عام ہوا۔ الجزائر میں فرانس نے ظلم و بربریت کا جو ننگا رقص کیا ہے، وہ استعماریت کی تاریخ کا نہایت سیاہ باب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دس لاکھ مسلمان اس جہاد آزادی میں قربان ہوئے، اور اب جمہوریت کو کچل کر فرانس کے تعاون سے جو فوجی حکومت قائم ہے، ان کے ہاتھوں تہ تیغ ہونے والوں کی تعداد بھی تقریباً ۲۰ ہزار ہے۔ (اسلام اور مغرب ۱۱۰)

امریکہ اور یورپ کی نواز اسرائیل کی ستم انگیزیاں اور دہشت خیزیاں بھی در اصل مغرب ہی کے کھاتے میں ہیں، ستمبر ۱۹۸۲ء میں صابرہ اور شتیلہ میں فلسطینیوں کا جو قتل عام کیا گیا، اس کی روداد اتنی دردناک ہیں کہ ان کو پڑھنا بھی حساس دلوں کے لئے ایک آزمائش ہے۔ لبنان کے پولیس اور اسپتالوں کے ریکارڈ کے مطابق صرف ۲ جون تا ۲۶ اگست ۱۹۸۲ء میں قریب ۱۸ ہزار فلسطینی اسرائیلی بمباری سے شہید ہوئے، اور اسرائیل کی درندگی کے جو واقعات ہر دن سامنے آتے رہتے ہیں، وہ ناقابل بیان ہیں، اقوام متحدہ کی پابندیوں کی جب سے ۶۰ سے زیادہ قراردادیں اب تک ردی کا ٹکڑا بن چکی ہیں، یہ سب مغرب کی شرافت کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔

یورپ کی انسانیت سوزی کی سب سے کھلی ہوئی مثال بوسنیا میں ہونے والے مظالم اور انسانیت کش واقعات ہیں، بوسنیہ میں بوگومل نامی عیسائی فرقہ پر رومن کیتھولک نے سخت ترین مظالم ڈھانے شروع کئے تھے، اس فرقہ کے لوگ عاجز تھے، انہوں نے ترکی خلیفہ سے ان کے علاقہ میں فوج کشی کی التجا کی، تاکہ انہیں اس ظلم سے نجات مل سکے۔ چنانچہ سلطان محمد ثانی

نے بوسنیا پر فوج کشی کی، اور صرف ایک ہفتہ کے اندر سترہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے، کیونکہ سربیا کی عوام خود اپنے حکمرانوں کے مظالم سے پریشان تھی، اور انہیں مسلمانوں کی صورت نجات دہندہ مل گئے تھے۔ سینکڑوں سال بعد سربوں نے نہایت سفاکی کے ساتھ اس کا انتقام لیا۔ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، زندہ انسانوں کے سینوں پر خنجروں سے صلیبیں بنائی گئیں، والدین کو بچوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا، مسلمانوں کے تن سے جدا کئے ہوئے سروں سے فٹبال کھیلے گئے، مسجدیں شہید کی گئیں، قیدیوں کی آنکھیں نکال دی گئیں، لوگوں کو زندہ نذرِ آتش کیا گیا، ہزاروں عورتوں کی برسرِ عام عصمت ریزی کی گئی، انہیں زبردستی حاملہ کیا گیا، تاکہ وہ سرب بچوں کو جنم دیں، زندہ انسانوں کے سر ہتھوڑے سے توڑ دیئے گئے، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے، بچوں کے سر کاٹ کر ان کے سامنے پیش کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بوسنیا اور اس کے گردو پیش کے علاقہ میں مغربی وحشت ناکیوں کے واقعات اتنے تکلیف دہ ہیں، کہ سخت دل سے سخت دل آدمی بھی انہیں سننے کی تاب نہیں لاسکتا، اور پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں جاپان پر جو مظالم ہوئے، وہ بھی ان ستم انگیزیوں کے مقابلہ ہلکے محسوس ہوتے ہیں، کیونکہ ان بمباریوں میں تو یکلخت لوگ زندگی کے قفس سے آزاد ہوگئے تھے، لیکن قلبِ یورپ نے ان مظلوموں کو تڑپا تڑپا کر مارا اور مسلسل قتل کیا گیا، عزت و آبرو کا قتل، جسم و جان کا قتل، آنکھوں کے سامنے معصوم نونہالوں اور بے زبان آبگینوں کا قتل، تاریخی ورثہ اور قومی یادگاروں کا قتل، ہر قتل ایسا کہ دلوں کو تڑپا دے، اور زبان سے گویائی چھین لے۔

عجیب بات ہے کہ جتنے انسانیت سوز ہتھیار بن رہے ہیں، وہ سب مغرب ہی کا تحفہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس وقت امریکہ کے پاس دو سو چالیس ہزار، روس کے پاس ۴۸ ہزار اور برطانیہ کے پاس پندرہ ہزار صرف میگاٹن بم ہیں، جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرنے والے بم سے کئی ہزار گنا زیادہ طاقت ور ہیں، ایک محقق کا تجزیہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں اسلحہ سازی اور جنگ میں جتنی رقم خرچ ہوئی ہے، اس سے پچاس سال تک دنیا کے تمام لوگوں کو مفت غذا اور دو تہائی آبادی کے لئے مکان فراہم کیا جا سکتا تھا، لیکن مغرب کو موت کی سوداگری کا جو شوق ہے، اسی کی وجہ سے مہلک ہتھیاروں کی صنعت اس وقت سب سے بڑی

صنعت ہے، اور دن رات اسی سے متعلق رہتا ہے کہ کس کوشش کی جا رہی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسان ہلاک ہوں اور آبادیاں ویران کی جا سکیں، اور حیرت ہے کہ یہی تاجرانِ اسلحہ مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہراتے ہیں۔

افسوس کہ مغرب ہندی کے تمدن اور روز رائج کیا، غرض تمام وسائل سے محروم کیا نے مسلمانوں کو مظلوم ہونے کے باوجود ظالموں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، حالانکہ مغرب کی تاریخ کا ایک ایک حرف بے گناہوں کے خون سے سرخ فام ہے، اور اس کے جرائم پر سے آواز آ رہی ہے کہ

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

(۲۸/ستمبر ۲۰۰۱ء)

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

افغان جنگ کا ایک مرحلہ تمام ہو چکا ہے، اور اس میں قوتِ مسلم کی جو رسوائی ہوئی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط، مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کے ناجائز قبضے اور جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ کی واپسی کے بعد عالمِ اسلام کے لئے یہ سب سے بڑا حادثہ ہے، یہ عدل پر ظلم کی فتح اور دلیل و حجت کی طاقت پر آہنی فولادی طاقت کا غلبہ ہے، یہ اصول و قانون کے مقابلہ لاقانونیت کی جیت ہے، اس نے مغرب کی تنگ نظری اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے دوہرے معیار اور ناانصافی کو بے نقاب کر دیا ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ایشیائی اور ترقی پذیر ممالک کو مغربی طاقتوں کا محکوم بن کر رہنا پڑے گا، اور اگر وہ اپنے حقوق کے معاملے میں سرخمیدگی کے بجائے سرفرازی کا راستہ اختیار کریں گے تو کسی دلیل و حجت کے بغیر ان کا سر کچل دیا جائے گا۔

دراصل طالبان اس وقت اسلام کی فرمانروائی اور اس کی حکمرانی کی صلاحیت کی ایک علامت بن گئے تھے، طالبان کی آمد سے پہلے افغانستان میں امن اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں تھی، طوائف الملوکی کی کیفیت تھی، مختلف علاقے مختلف کمانڈروں کے زیرِ اختیار تھے، اور ہر گروہ اپنے مخالفین کے ساتھ نہایت سفاکی سے پیش آتا تھا، ان حالات میں طالبان ابرِ رحمت بن کر اس ملک کی فضاء میں اترے، اور بہت کم عرصے میں پورا ملک ان کے زیرِ نگیں آگیا، وہ جس علاقے میں گئے، وہاں امن، اخلاقی و دینی سلوک، اسلامی اخوت اور انسانی محبت کی سوغات لے گئے۔ جہاں دن دوپہر میں دکانیں لوٹ لی جاتی تھیں، وہاں یہ حال ہو گیا کہ لوگ رات میں بھی اپنی دکان کو مقفل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

کمیونسٹوں کے عہد اقتدار میں اس بات کی منظم کوشش کی گئی کہ مسلمان اسلامی تہذیب کو خیرباد کہہ دیں۔ منصوبہ بند طور پر بے حجابی اور بے اخلاقی کو فروغ دیا گیا اور زندگی کے ہر گوشے میں لادینی ثقافت کا رنگ گھولنے کی کوشش کی گئی۔ طالبان نے نہایت کامیابی کے ساتھ سماج میں پھیلے ہوئے اس زہر کا علاج کیا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات اس میں غلو اور افراط کے واقعات بھی پیش آئے، لیکن اس سے زیادہ غیر جمہوری واقعات دوسرے ملکوں و حکومتوں میں پیش آتے رہے ہیں، اس لئے وہ کبھی اس قدر ناقابل برداشت بھی نہ تھے جو ایک ملک کے دوسرے ملک میں مداخلت کا جواز فراہم کرتے ہوں۔

مغرب کو افغانستان کا یہی اسلامی کردار کھٹکتا رہتا تھا، کیوں کہ افغانستان نے یہ بات ثابت کردی تھی کہ اسلام بحیثیت مرتب دینی نظام کے آج بھی نہ صرف قابل نفاذ ہے، بلکہ دنیائے انسانیت کی کامیاب رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مغرب نے معاشی پابندیاں لگا کر ہر چہار طرف سے خشکی سے گھرے ہوئے اس ملک کو مفلوج کرنے کی کوشش کی اور سمجھا کہ اس طرح افغان مغربی طاقتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن انھوں نے نہایت ہی استقامت کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور حکومت کے ذمہ داروں اور عہدیداروں نے ایسی سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی اختیار کی کہ دیکھنے والوں کو خلافت راشدہ کا دور یاد آجاتا تھا، ملک کے پچانوے فیصد حصہ پر قابض ہونے کے باوجود ان کو ملک کا جائز حکمراں تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا، اور انھیں بین الاقوامی سطح پر تنہا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی، لیکن انھوں نے خدا پر بھروسہ رکھا، اور انسانی سہاروں کی فکر نہیں کی، نہ کبھی انھوں نے قرض کے ہاتھ پھیلائے، نہ کسی سے اعانت و امداد کے طالب ہوئے، اور یہ بھی وضاحت کرتے رہے کہ اس ملک کا اسلامی نظام یہاں کے باشندوں کی مرضی سے ہے، اور ہم اسے کسی دوسرے ملک پر تھوپنا نہیں چاہتے۔

گیارہ ستمبر کو امریکہ کی بے آبروئی کے واقعہ کے بعد بھی امریکہ کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کر سکا جو وضاحت کردے کہ اس واقعہ میں اسامہ بن لادن، القاعدہ یا افغانستان کی شرکت کو بتاتا ہو، بلکہ متعدد قرائن اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ اصل میں یہ سب کچھ

یہودیوں کی کارستانی تھی، جس کی تاریخ سازشوں، ریشہ دوانیوں اور دہشت گردی کے واقعات سے پُر ہے، لیکن چونکہ افغانستان کی سیاسی شناخت مغرب کی نظر میں یہودی تھی اس لئے بلا ثبوت اور بلا حجت مکمل افغانستان پر حملہ اور وحشیانہ انتقامی فوجی کارروائی کی گئی۔ جس نے ہزاروں بے قصوروں کی جان لے لی، اور ایک جائز حکومت کو حق حکمرانی سے محروم کر دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ کسی ملک سے خطرہ کب اور کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس ملک کو فتح کر لیا جائے تو وہ ملک قبضہ میں آجاتا ہے، لیکن نظریہ کی طاقت ملک اور حکومت سے زیادہ ہوتی ہے، اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، بالخصوص اس صورت میں جبکہ کوئی ایسا مذہب مد مقابل ہو جو آفاقی حیثیت کا حامل ہو۔ مغرب پر گو مذہب عیسائیت کا غلبہ ہے، لیکن وہ ایک غیر مذہبی نظام حیات کا نقیب ہے، کلیسا اور حکومت کی جنگ کے بعد عملی زندگی سے مذہب کو نکال باہر کیا گیا ہے، اور قیصر کو "خدا" سے زیادہ با اختیار بنا دیا گیا ہے۔

اس نظام حیات کا لب لباب ایسی زندگی ہے جو اخلاق اور آخرت کے جواب دہی کے تصور سے بے نیاز ہے، جو ایسی مطلق آزادی کا داعی ہے کہ اس میں بہت سی مسلمہ اخلاقی قدروں کی گنجائش نہیں رہ جاتی، جس میں شرم و حیا کو خود قابل شرم سمجھا جاتا ہو، جو شخص کوئی ادارہ عشرت سامانی میں کسی طرح مخل نہ ہوتا ہو، انسان کی خواہشات اور جنسی لذتوں کے حصول میں دو چیزیں ہیں: جنس اور مال، یہ دنیا پرست نظام حیات ان دونوں کو کھلی آزادی اور بے قید اجازت عطا کرتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مغرب میں بہت سی برائیوں کے ساتھ نمایاں طور پر دو چیزوں نے بہت فروغ پایا، ایک تو غیر قانونی جنسی تعلق، یہاں تک کہ وہ رشتے جن سے جنسی اتصال کے بارے میں تو فطرت انسانی ابا کرتی ہے، ان پر بھی کوئی قدغن باقی نہیں رہی، اور ہم جنسی جیسے غیر فطری اور صحت انسانی کے لئے مضرت رساں فعل کو بھی قانونی اجازت دے دی گئی۔

معاشی میدان میں سرمایہ داروں کو اس بات کی پوری چھوٹ دے دی گئی کہ وہ جیسے چاہیں کمائیں، اور جس طرح چاہیں منظم ہو کر غریبوں کا استحصال کریں، چنانچہ لوگوں کو شخصی

پرستانہ زندگی کا خوگر بنادیا گیا، اسبابِ عشرت کی فراہمی کو آسان کردیا گیا، اور اس طرح سودی نظام کو ایسا مستحکم کیا گیا کہ آج مغرب زدہ ممالک میں سود سے بچ کر کسی کاروبار کا انجام دینا دشوار ہوگیا ہے، اور خود مغربی ممالک میں تو روز مرہ کی ضروریات میں بھی سود سے بچنا مشکل ہوگیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ غریب مزدور پوری زندگی کماتے اور سود بھرتے ہوتے ہیں، اور دولت مندوں کی تجوریاں ان کے لہو سے سدا آباد رہتی ہیں۔

مغرب کے استحصالی نظام کے مقابلہ کمیونسٹ تحریک اٹھی ہوئی جو مزدوروں کے استحصال کے خلاف برسرِ پیکار تھی، اور سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ظلم تصور کرتی تھی، لیکن اشتراکی نظام چونکہ کسی مثبت فکری بنیاد پر وجود میں نہیں آیا تھا، بلکہ منفی سوچ اور ردِ عمل کے طور پر اس کی نشو ونما ہوئی تھی، اس لئے وہ افراط و تفریط سے خالی نہیں رہا، انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی اور سرکاری ملکیت، مزدوروں کے لئے حقِ ملازمت، اور شخصی آزادی کا اس حد تک گلا گھونٹ دیا کہ اس نظام کے خلاف کسی زبان کو جنبش کی بھی اجازت نہیں، وہ امور تھے جنہوں نے اشتراکی نظام کے بت کو سو سال سے بھی کم عرصہ میں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

اب دنیا میں اس انسانی نظامِ حیات کے مقابلہ اسلام کے سوا کوئی اور نظامِ حیات نہیں، کیوں کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس کا دائرہ مسجد تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ہمہ گیر نظام ہے، جس نے انفرادی اور شخصی زندگی سے لے کر سماجی زندگی، معاشی و سیاسی نظام اور بین ملکی تعلقات تک ہر گوشہ کا احاطہ کیا ہے، اور بحیثیت مسلمان ہر صاحبِ ایمان کے لئے اسلام کی ان وسیع الاثر تعلیمات پر ایمان رکھنا ضروری ہے، پھر یہ ایسا معتدل، متوازن، فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور عہد کے تقاضوں کے مطابق ہے کہ انسانی فطرت اور عقلِ سلیم بے اختیار اس پر لبیک کہتی ہے، اس میں شخصی آزادی بھی ہے، لیکن اس کی معقول حدود ہیں، اس میں معاشی مسابقت کی حوصلہ افزائی بھی ہے، لیکن استحصال کی اجازت نہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہے، لیکن مرد و عورت کے درمیان صلاحیت کا جو قدرتی فرق پایا جاتا ہے، اس کا لحاظ بھی ہے، اس میں صلح و امن اور بین ملکی

تعلقات سے متعلق ہدایات بھی ہیں، لیکن یہ رنگ و نسل، جنس کسی ایک گروہ کو پوری انسانیت پر مسلط ہو جانے کا موقع نہیں، اس میں افراد و اشخاص کی صلاحیتوں میں پائے جانے والے تفاوت کا لحاظ بھی ہے، لیکن بحیثیت انسان، انسانی وحدت و مساوات کا تصور بھی۔

پھر چوں کہ یہ دین قدم قدم پر انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور انسانی ضرورتوں کا پاسدار ہے، اس لئے یہ ایک عملی دین ہے، ایک ایسا دین جو افلاطون و ارسطو کے تخیلات کی طرح محض کتابوں کے صفحات میں نہیں رہا، بلکہ ایک ہزار سال سے زیادہ بڑی حد تک زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری رہا ہے، اور اس نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مغربی اقوام کو اصل پریشانی یہی ہے کہ ان کے جدید اباحیت پسندانہ آزادانہ نظامِ حیات کو پورے عالم تک وسعت دینے میں سوائے اسلام کے کوئی اور مزاحم نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ کمیونزم کے زوال کے بعد سے اس طرح کی باتیں شروع کر دی گئی تھیں کہ اب اس کے بعد ان سے بڑا مد مقابل اسلام ہے، بوسنیا کی جنگ کے موقع پر برطانیہ کے وزیر اعظم جان میجر نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ہم یورپ کے قلب میں کسی مسلم مملکت کو برداشت نہیں کر سکتے، اس لئے بوسنیا میں سفاکی کا شب و روز مشاہدہ کرتے رہے، اور انسانیت اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کو سربوں کی خوں آشامی اور غارت گری پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا، چیچنیا اور کوسووو میں بھی انسانیت سوزی کا ننگا رقص ہوتا رہا، اور مغربی اقوام کو اس وقت مظلوموں کی دادرسی کا کوئی خیال نہیں آیا، ایران نے اسلامی نظام کا علم اٹھایا، تو عراق کو اس کے خلاف اکسایا گیا، پھر عراق کی طاقت کو توڑنے کے لئے ایک خاص منصوبہ کے تحت عراق، کویت جنگ کرائی گئی، اور اب کسی دلیل و ثبوت کے بغیر افغانستان کی طالبان حکومت کو نشانہ بنایا گیا، اور صدر امریکہ جناب بش اس کو تہذیبی اور صلیبی جنگ قرار دے کر دل میں چھپے ہوئے بغض کو اپنی زبان تک لے آئے۔

دراصل کسی نظریہ اور نظامِ حیات کا مقابلہ نظامِ حیات ہی سے ہو سکتا ہے، تلوار و آہن سے زمین فتح کی جا سکتی ہے، اور ملکوں کو تخت و تاراج کیا جا سکتا ہے، لیکن دلوں کی

دنیا نہیں جیتی جا سکتی، اور نہ اس دوسرے کی مملکت کو اپنا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔ غور کیجئے کہ ایرانیوں، تاتاریوں اور مغلوں نے ابتدائی دور میں عالم اسلام پر کیسی یلغاریں کیں؟ ایسا لگتا تھا کہ ان کی تلوار اور خنجر سیلاب کے آگے اسلام خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا، لیکن ان قوموں کے پاس قوت تھی، سپاہی تھے، تیر و شمشیر کی کثرت تھی، معرکہ کارزار کے لئے مطلوب سواریاں تھیں، لیکن ان کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے، اور ان کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی قابل عمل نظامِ حیات، اور قلب و روح کو اپنی طرف کھینچنے والی کوئی فکر سلیم موجود نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک و زمین اور حکومت و اقتدار کے فاتح قلب و نگاہ کے مفتوح بن گئے، اور جو طوفان اسلام کو تہ و بالا کرنے کے لئے اٹھا تھا وہی مدتوں اس دینِ حق کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیتا رہا، اسی کو اقبال نے کہا ہے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
مل گیا پاسباں کعبہ کو صنم خانے سے

مغرب پر اسلام کی جاذبیت، اس کی کشش، قلب و روح میں اتر جانے کی صلاحیت، فکر و نظر پر چھا جانے کی لیاقت اور اپنے متبعین میں حق و راستی کے لئے آتش انقلاب سلگا دینے اور جوشِ جنوں بھر دینے کی اہلیت کا خوف چھایا ہوا ہے۔

افسوس کہ ہم مسلمان بھی آج کل واقعات کو مادی نتائج کے پیمانوں میں تولنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور ظاہری ظفرمندی و فتح سامانی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں، لیکن اسلام میں اصل کامیابی یہ ہے کہ آدمی آخر دم تک اپنے آپ کو حق پر ثابت قدم رکھے، سچائیوں کے لئے "کھونا" "کمانا" ہے۔ حق و راستی کے لئے "کھونا" "پانا" ہے، اہلِ جنوں کو اپنی منزل کے لئے لٹ جانے میں بھی لطف آتا ہے، اس صحابی کے واقعہ کو یاد کیجئے کہ دشمن نے تیر مارا، اور جان نکل رہی ہے، لیکن اس وقت بھی زبان اپنی شاد کامی و کامرانی کا نعرہ بلند کرتی ہے کہ "فزت ورب الکعبۃ" (رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا) پیغمبروں کو اپنا وطن چھوڑنا۔ بے وطنی اور جلاوطنی کو قبول کرنا پڑا، بعض انبیاء گذرے ہیں کہ آرہ ان کے جسم مبارک کو دو لخت کر دیا گیا، تو کیا نعوذ باللہ یہ انبیاء ناکام رہے؟ ہرگز نہیں! کیوں کہ اپنے

مقصد میں آخری درجہ کی کوشش اور اس کے لئے سب کچھ نثار و قربان کر دینے ہی اصل کامیابی ہے۔

مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہئے اور یہ عزم رکھنا چاہئے کہ وہ ہر طرح کی آزمائش سے گذریں گے، لیکن ہمیشہ حق کے طرفدار اور اسلام کے علمبردار بن کر رہیں گے۔ اور دنیا کو سمجھ لینا چاہئے کہ یلغار کے مظالم یا افغانستان کی جنگ سے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں کئے جاسکتے اور نہ ان کے ایمان کا سودا کیا جاسکتا ہے، یہ وہ نشہ ہے کہ جس قدر اتارنے کی کوشش کی جائے اسی قدر چڑھتا جاتا ہے، یہ وہ پودا ہے کہ جس قدر تراشا جاتا ہے اسی قدر سربلند اور سایہ دار ہوتا جاتا ہے۔ قلعے مسمار کئے جاسکتے ہیں، کاشانے ویرانے میں تبدیل کئے جاسکتے ہیں، پہاڑ کی چوٹیوں کو خاکستر بنایا جاسکتا ہے، آتش فشاں بجھائے اور دریاؤں کے رخ موڑے جاسکتے ہیں، ملکوں کے جغرافیے تبدیل ہو سکتے ہیں اور تختِ اقتدار پر بیٹھنے والوں کو تختۂ دار کی زینت بنایا جاسکتا ہے، لیکن دلوں میں جو ایمان کی چنگاریاں سلگی ہوئی ہیں، اسے بجھایا نہیں جاسکتا، اور ذہن و دماغ کی مملکت پر ایمان کی حکمرانی کے جو نقش دوام ثبت ہیں انہیں مٹایا نہیں جاسکتا، اس لئے اقبال کا شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بے تکلف زبان پر آتا ہے کہ ؎

اگر افغانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(۲۱ـ دسمبر ـ ۲۰۰۱ء)

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

جب انسان پر کوئی مصیبت اور آزمائش آئے تو ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ادفع بالتی ھی احسن السیئة (مومنون ۹۶)

بری بات کے جواب میں بہتر طریقہ اختیار کرو

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس جانب بھی متوجہ فرمایا ہے کہ یہ بہتر طریقہ جواب (دفع بالاحسن) دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرتا ہے، یہ صبر آزما ہے، لیکن کامیابی کی کلید ہے:

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة، ادفع بالتی ھی احسن، فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم، وما یلقٰھا الا الذین صبروا، وما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم

(السجدہ ۳۴،۳۵)

نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو، ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے وہ دلی دوست ہو جائے، اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو قوت برداشت رکھتے ہوں، اور یہ بات اسے حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے۔

یہ "بہتر بات" کیا ہے؟ قرآن ہی نے اس کو ان آیات سے پہلی آیت میں بیان فرمایا ہے:

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا

وقال اننی من المسلمین (فصلت ۳۳)

اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور خود بھی نیک عمل کرے، اور کہے میں فرماں برداروں میں سے ہوں؟

بہتر بات سے "دعوت الی اللہ" مراد ہے، دعوت دشمن کو دوست بناتی ہے۔ دعوتِ حق کی علمبردار قوم کو نصیب ہو سکتی ہے، البتہ اس کے لئے صبر، قوتِ برداشت اور حسنِ تدبیر کی ضرورت ہے، صبر کے معنی صرف چوٹ کھا کر خاموش رہنے کے نہیں ہیں، بلکہ صبر بڑے مقصد کے لئے چھوٹی اور جزئی باتوں کو چھوڑنے اور موجودہ حالات میں بے برداشت ہونے کے بجائے حکمت و تدبیر سے کام لینے کے ہیں۔

اس وقت عالمی حالات مسلمانوں کے لئے بظاہر بہت حوصلہ شکن اور ہمت کو پست کرنے والے ہیں، اچھی خبروں کے لئے کان ترستے ہیں، خوش کن نتائج کو دیکھنے کے لئے آنکھیں سراپا انتظار ہیں، سکون و طمانیت دینے والی اطلاعات کے لئے قلوب بے چین ہیں، بظاہر ہر طرف ظلمت کی گھٹائیں ہیں اور اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، لیکن مومن کا کام یہ ہے کہ وہ ان اندھیروں میں بھی روشنی تلاش کر لے، ناامیدیوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں سے بھی امید کی کرنیں اسے نظر آئیں اور وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، صحابہ کا یہی طریقہ تھا، وہ ناموافق حالات میں بھی ایسے پہلو تلاش کر لیتے تھے، جس سے طمانیت ہو اور جس سے ان کا خدا راضی ہو جائے، لوگ انہیں خوف دلاتے کہ پوری دنیا تمہارے مقابلہ پر جمع ہو گئی ہے، اور وہ کہتے ہمارے لئے خدا کافی ہے، حسبنا اللہ و نعم الوکیل، ان کے ایمان میں ایسی وحشت انگیز خبروں سے اضافہ ہی ہو جاتا، لوگ انہیں ان کے رفقاء کی شہادت کا طعنہ دیتے اور وہ اسے اپنے بھائیوں کے لئے انعام تصور کرتے۔

اس وقت حالات گو ہمت شکن ہیں، لیکن اس میں ایک پہلو خیر کا بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے اور اسلام کے بارے میں جاننے کا جو رجحان اس وقت پیدا ہوا ہے، کم از کم پچھلے پچاس سال میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اسلام کے خلاف میڈیا کی زہر افشانی اور اس کے نتیجہ میں اسلام کو جاننے کی خواہش کو دیکھتے ہوئے سیرت کا وہ واقعہ یاد آتا ہے

کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب حج کا موسم آتا یا کوئی بڑا بیرونی میلہ لگتا تو آپ کی طرف سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لئے اہلِ مکہ طرح طرح کی باتیں کرتے، اور زیادہ تر یہ کہا جاتا کہ آپ جادوگر یا مجنون ہیں، (والعیاذ باللہ) اور ایسا جادو جانتے ہیں، جس کے ذریعہ والدین اور اولاد اور شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے ہیں، لیکن یہی پروپیگنڈہ آپ کی طرف لوگوں کی توجہ کا باعث بن جاتا، باہر سے آنے والوں میں ایک کھوج پیدا ہو جاتی کہ آخر یہ کون شخص ہے جس کی مخالفت اس شدومد سے کی جارہی ہے؟ یہی تجسس لوگوں کو بارگاہِ نبوت تک لاتا، پھر وہ آپ سے متاثر ہو کر اور اپنا دل نورِ ایمان سے بھر کر واپس ہوتے، یہ آپ کی دعوتی زندگی کا وہ پہلو ہے کہ آپ کا طریقہ تھا کہ آپ بری بات کا جواب "بہتر بات" یعنی عمدہ طریقے پر صورت میں اللہ سے دیتے، لوگ گالیاں دیتے، اور آپ ان کے لئے ایمان کی دعا فرماتے، لوگ برا بھلا کہتے، اور آپ کی راہوں میں کانٹے بچھاتے، اور آپ ان پر میٹھے بول کے پھول برساتے، اور کہتے: قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا۔ (خدا نے حق سے اپنا رشتہ جوڑ لو تو تم کامیاب ہو گے) لوگ آپ کے خلاف زہر افشانی کرتے لیکن آپ کی زبانِ مبارک سے کبھی ان کی ذات کے لئے کوئی تلخ کلمہ بھی نہیں نکلتا، لوگ آپ کی ذات کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے، اور آپ شب و روز خدا کی توحید کا اعلان فرماتے، لوگ نفرتوں کی آگ سلگاتے، اور اس کی آنچ کو تیز تر کرنے کی کوشش کرتے، اور آپ محبت کی پھوار سے اسے بجھانے کی راہ اختیار کرتے۔

یہی وہ "طریقہ احسن" ہے جس کی قرآن نے ہدایت کی ہے اور جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کا پیکر ہوں، موجودہ حالات میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم نفرت کا جواب محبت سے دیں، مشتعل کر دینے والی باتوں کا جواب سنجیدہ، مدلل اور حقیقت پسندانہ اسلوب میں دیا کریں، تو اس طرح ہم اس شر کو اپنے لئے سرچشمۂ خیر بنا سکتے ہیں، صورتِ حال یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد وسط دسمبر تک کی اطلاع یہ ہے کہ امریکہ میں ۳۵ ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں سالانہ قبولِ اسلام کی شرح

۲۵ ہزار ہے لیکن ۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد اس میں چار گنا اضافہ ہو گیا ہے (ماہنامہ الحق جنوری ۲۰۰۲ء ص ۳۳) پوری دنیا میں اسلامی ویب سائٹس کے وزیٹرز کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

سعودی عرب میں امریکہ کے سفیر تارکوتو کی ڈیلی نے قبول اسلام کا اعلان کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریاض کے ایک مرکز دعوت میں پورے رمضان المبارک اس سال ہر دن اوسطاً ۵ غیر مسلم آ کر اسلام قبول کرتے رہے، جب کہ صرف ریاض میں اس طرح کے تقریباً ۳۰ مراکز ہیں۔ (صوت ساتھی بحوالہ عرب نیوز ۲۷ نومبر) یہ بات قارئین کے علم میں ہوگی کہ جو امریکی فوج سعودی عرب آئی تھی، اس کی گذری مدت میں بھی مسلمان سماج سے متاثر ہو کر ان میں سے دو ہزار سپاہیوں نے اسلام قبول کر لیا، اس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شکست مسلمانوں نے کھائی ہے نہ کہ اسلام نے، مسلمانوں کے زوال کی تاریخ میں اکثر اسلام کے مفتوح بنتے رہے ہیں، اور آج بھی یہ تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ منصوبہ بند پروپیگنڈہ کا جواب منصوبہ بند دعوت سے دیا جائے، اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ہر علاقہ اور ہر ملک میں اسلام کا تعارف پیش کریں، اسلام نے امن و آشتی، صلح، رواداری اور محبت کا جو پیغام انسانیت کے لئے دیا ہے، اس پیغام کی خوشبو سے ہم پوری دنیا کی فضا کو معطر بنا دیں، اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع فراہم کریں کہ اسلام محبت اور انسانی اخوت کو جلا دینے والا بارود، بم نہیں، بلکہ انسانیت کو اخوت و بھائی چارہ کی خوشی سے ہمکنار کرنے والا مذہب ہے۔

ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریہ قریہ، شہر شہر، محلہ محلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک اجتماعات رکھیں، اور قرآن و رسول ﷺ کی جو تعلیم دیتا ہے اس کو خوش اسلوبی سے پیش کریں۔ ان آیات کے ترجموں پر مشتمل ورقے طبع کرائیں، اور اسے برادران وطن تک پہنچائیں، تیلگو اور مقامی زبان کے اخبارات تک ایسے مضامین پہنچانے کی کوشش کریں، گو اس سلسلہ میں انگریزی اخبارات کا رویہ ایک حد تک غیر

حقیقت پسندانہ رہا ہے، اور یہ شکایت عام ہے کہ اسلام کے خلاف تو بے سروپا باتیں آتی ہیں انہیں تو بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں، اور اس کے جواب میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اسے بہت کم قابل التفات سمجھتے ہیں۔ لیکن اس میں ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، ہم اس بات کی کوئی منظم کوشش نہیں کرتے کہ ایسے مضامین اور مراسلات کا تجزیہ، غیر جذباتی اور مدلل جواب دیں، اور انگریزی اخبارات کے ذمہ داروں تک پہنچ کر انہیں مسلمانوں کی شکایات کی طرف متوجہ کریں، ہم اشتعال و احتجاج کے بجائے انہیں قائل کریں، اس طرح ہم انگریزی اخبارات تک بھی رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ ایک ایسے ذریعہ ابلاغ تک ہمیں رسائی حاصل ہوئی ہے، جس میں اپنی بات اپنی زبان اور اپنے قلم سے پہنچانے کا پورا موقع حاصل ہے، اس میں ہم نہ کسی سہارے کے محتاج ہیں، اور نہ کثیر وسائل کے، اور اس وقت یہ سمجھدار اور باشعور لوگوں تک رسائی کے لئے نہایت وسیع الاثر ذریعہ ہے، اس کے علاوہ دوسرے ذرائع ابلاغ بھی ہیں جن کے ذریعہ ہم لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ان وسائل و ذرائع سے استفادہ کریں، اور جذبات کے بجائے حکمت و تدبیر اور اشتعال کے بجائے صبر و استقامت کی راہ اختیار کریں، اسی طرح ممکن ہے کہ یہی طوفانِ مغرب مسلمانوں کو ایک نئے ساحل سے ہمکنار کردے، بقول شاعرِ اسلام علامہ اقبال:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

(۱۵ فروری ۲۰۰۱ء)

بہار ہو کہ خزاں

کامیابی و ناکامی دونوں ہر انسان کی زندگی کا ساتھی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں غلبہ اور کامیابی حق ہونے کی اور مغلوبیت و ہزیمت ناحق ہونے کی کسی بات سے متعلق ہو یا کسی انسان و جماعت سے متعلق ہونے کی دلیل نہیں، ایسا ہوتا تو کبھی کفر کو اسلام پر غلبہ کی نوبت حاصل نہ ہوتی، جبکہ بہت سے مواقع پر اہل حق اور خود انبیاء کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، بدر کی لڑائی بے سروسامانی کی تھی، اس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی لیکن احد میں خود حضور ﷺ موجود تھے، لیکن پہلے مرحلہ میں فتح اور دوسرے اور آخری مرحلہ میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، کیونکہ جنگوں میں بھی فتح کے لئے سبب کا اصول موجود ہے۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان کا خاتمہ ایمان کے ساتھ ہو جائے، یہی اصل کامیابی ہے۔ اگر یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہو جب بھی انسان ناکام نہیں، اور غلطی کی تلافی ہر صورت ضروری ہے، ورنہ بظاہر نتیجہ اس کے حق میں ہو جائے۔

اصل میں یہ دونوں حالتیں اہل ایمان کے لئے امتحان کی ہیں، مومن وہ ہے کہ جب فتح مند ہو اور کامیابی اس کے قدم چومے، تو اس کا سر جھکا ہوا ہو، اس کی زبان پر خدا کی حمد ہو، اس کی پیشانی اللہ کے سامنے خم ہو رہی ہو، یہ قرآن مجید نے دعا کی، گردنوں میں جتنا تواضع ہو جائے، فتح و ظفر کے باوجود آپ نے ایک ایک سے نمایاں اور عجز و فروتنی اس کے ایک ایک عمل سے ہویدا ہو، جس سے اس کا اخلاق نمایاں ہو، ان کے سینے دشمنوں کی طرح نرم ہو جاتے، فتح مکہ کا موقع ہے، اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کے لئے اور آپ ﷺ کے جاں نثاروں کے لئے خوشی کا کیا موقع ہو سکتا تھا، جہاں سے نکالا گیا، جلاوطن کیا گیا، وطن چھوڑ کر نکلنے پر مجبور کیا گیا اور سر پر انعام مقرر ہوا، آج وہی سرزمین تھی، آپ نے استقبال

کے لئے دل کی آنکھیں بچھائے ہوئے ہے اور دس ہزار جان نثاروں کا لشکر جرار اپنا سر رکھ آپ ﷺ کے قدموں میں نچھاور کرنے کو تیار ہے۔ یہ موقع ہے پرجوش نعروں کا، دشمنوں پر ظلم و ستم، فقرہ بازیوں اور طعنہ اندازیوں کا حساب چکتا ہوا اور سر غرور سے اونچا نہ ہو تو جشن فتح کا کیا لطف رہے؟ لیکن آج آپ ﷺ پر عبدیت و بندگی کا رنگ ہر دن سے بڑھ کر ہے، اونٹنی پر سوار ہیں، زبان مبارک حمد الٰہی سے تر ہے، تواضع سے سر مبارک جھکا ہوا اور بار بار اونٹنی کی کوہان سے لگ جاتا ہے، مکہ میں داخل ہوئے تو حضرت ام ہانی کے گھر کو اپنی میزبانی سے رونق بخشی اور وہیں غسل کر کے نماز شکر ادا فرمائی۔

اگر کبھی ہزیمت ہو، شکست ہو، ظاہری ناکامی سے انسان دو چار ہو تو اس وقت بھی توازن قائم رکھے، صبر و استقامت کی راہ اختیار کرے اور اللہ ہی کی طرف رجوع کرے۔ طائف کے واقعے سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ واقعہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں پیش نہیں آیا، آپ ﷺ اہل مکہ سے مایوس بڑی امیدوں کے ساتھ طائف پہنچے تھے، لیکن اہل طائف کا سلوک اہل مکہ سے بھی برا ثابت ہوا، پتھروں کی بارش نے جسم مبارک کو لہولہان کر دیا تھا، آپ ﷺ اس دکھ بھری گھڑی میں اللہ سے رجوع ہوئے اور ایسی درد انگیز دعا فرمائی کہ آج بھی قلب سلیم اس سے لرز اٹھتا ہے، مگر اس وقت بھی زبان مبارک پر اپنی قوم کے لئے دعا کے الفاظ ہیں اور خدا کے رحمان سے کوئی گلہ نہیں؛ بلکہ ایک ایک لفظ سے صبر و رضا اور عہد و وفا ظاہر ہے۔

ایمان انسان کے اندر خدا کی خشیت پیدا کرتا ہے، جس انسان کے اندر خدا کا خوف اور اس پر یقین پیدا ہوتا ہے وہ پوری دنیا سے بے خوف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ یقین رکھتا ہے کہ نفع و نقصان کے فیصلے دنیا میں نہیں آسمان میں ہوتے ہیں، خدا کی مشیت کے بغیر نہ کوئی اسے نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، ایمان انسان کو بے ضمیری اور اصولوں پر سمجھوتے سے باز رکھتا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں پر کیا کچھ آزمائشیں نہ آئیں، وہ کن کن ابتلاؤں سے نہیں گزرے؟ اور ان کو راہِ حق سے منحرف کرنے اور کفر و شرک سے سمجھوتہ کرنے کے لئے ترغیب و تحریص کے کیا کیا وسائل اختیار نہ کئے گئے؟ مال و زر کے، اعلیٰ

عہدوں کے، حکومت و اقتدار کے اور حسن و جمال کے، فکر و ایمان کی قوت نے کبھی پائے استقامت میں تزلزل نہیں آنے دیا، مسلمان جہاں کہیں بھی رہے، اس کی پیشانی صرف خدا کے سامنے جھکی ہے، وہ دولت کے سامنے سپر نہیں ڈال سکتا، وہ بلندی ہمت و حوصلہ سے محروم نہیں ہو سکتا، وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کر سکتا، وہ ایمان فروش نہیں ہو سکتا اور اس کے دین و ایمان کا سودا نہیں کیا جا سکتا۔

''اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے'' یہ احساس اس کو موجوں سے کھیلنے کا حوصلہ بخشتا ہے اور وہ سرد و گرم کو سہتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے، ہر حال میں اللہ کی طرف نگاہ ہو، یہی ایک مسلمان کے لئے اصل اسوہ ہے۔

جب انسان پر یہ وقت آئے، ایسے حکمراں مسلط ہوں، ایسے لوگ حکمرانی سے قریب پہنچ جائیں جن سے ظلم و جبر اور حق تلفی و ناانصافی کا اندیشہ ہو تو اپنے اعمال پر نگاہ کرنی چاہئے، کیوں کہ انسان کے اعمال ہی کے مطابق اس کو احوال بھی پیش آتے ہیں۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا، قتل عام کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو ایک بزرگ نے فرمایا کہ ہماری بداعمالیوں نے نادری صورت اختیار کرلی ہے: ''شامت اعمال ما صورت نادر گرفت!'' اس لئے ایسے حالات دعوت دیتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں اور اپنے حالات پر نظر کریں کہ کہیں ہماری بداعمالیوں نے تو ہم کو یہاں تک نہیں پہنچایا ہے، فرقہ بندی، افتراق، باہمی رسہ کشی، رجوع الی اللہ کی کمی، احکام الٰہی کے ساتھ بے نیازی اور دین سے بے تعلقی نے تو ہم کو اس صورت حال سے دوچار نہیں کیا ہے؟

غرض مومن کی نگاہ ہر حال میں خدا کی طرف ہونی چاہئے، نہ فتح مندی اسے مغرور کرے، نہ ظاہری شکست مایوس و پست ہمت۔

بہار ہو کر جزاس ۱۱ اپریل ۱۱۰۰

(۲ / مارچ ۱۹۹۸ء)

بیسویں صدی کا سبق

بیسویں صدی گذر چکی ہے اور ہم لوگ اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں، زندہ قوموں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ماضی سے سبق لیتی ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کا نقشہ تیار کرتی ہیں، اسی لئے قرآن مجید میں انبیاء اور ان کی قوموں کے گذشتہ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان واقعات میں عبرت و موعظت کے جو پہلو ہیں، انہیں نمایاں فرمایا گیا ہے تا کہ اگلی قومیں ان کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں اور اس چراغ کی روشنی میں اپنا سفر طے کریں۔ پس امت مسلمہ کا یہ طریقہ ہونا چاہئے کہ ماضی سے سرسری طور پر نہ گذر جائے، بلکہ اس کا جائزہ لے، خود اپنا محاسبہ کرے اور اس کی روشنی میں مستقبل کے لئے لائحہ عمل طے کرے۔ اس لئے ہمیں بھی گذری ہوئی صدی کا جائزہ لینا چاہئے اور اس کو اپنے لئے آئینہ بنا کر اپنے اجتماعی چہرہ کو سنوارنے اور آراستہ کرنا چاہئے۔

اس صدی میں متعدد ایسے حادثات ہوئے ہیں، بلکہ پیہم ہوتے رہے ہیں جنہوں نے بار بار دردمند دلوں کو بے چین اور آنکھوں کو اشکبار کیا ہے اور امت پر ایسے ایسے طوفان آئے ہیں کہ بہت سی قومیں اس سے معمولی واقعات پیش آنے پر بکھر کر رہ گئیں اور ان کا نام ونشان تک مٹ گیا، لیکن ان میں سے تین واقعات ایسے ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور جو ہمیشہ مسلمانوں کو بے سکون اور مضطرب رکھیں گے۔ ان میں پہلا واقعہ خلافت عثمانیہ ترکی کے سقوط کا ہے، جو ۱۹۲۴ء میں پیش آیا۔ خلافت عثمانیہ اخیر زمانہ میں گو اثر ونفوذ کھو چکی تھی اور شوکت وشکوہ سے محروم ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی اجتماعیت اور عالم اسلامی وحدت کی ایک علامت تھی، چنانچہ افریقہ سے لے کر ہندوستان تک جمعہ کے خطبوں میں خلیفۂ عثمانی کا نام لیا جاتا تھا، دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آتی،

ایوانِ خلافت کی طرف توجہ دی تو اس کا اتحاد گو کمزور تھا مگر ترکی کو یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا لیکن اس کی صدائے حق مغرب و مشرق کے ایوانوں میں حکومت و عزت کے لئے تہدید تھی۔ مغربی دنیا کو صلیبی جنگوں میں عالمِ اسلام سے جو پے در پے شکستیں اٹھانی پڑی تھیں اور بڑی سازشوں کے باوجود خلافتِ اسلامیہ کے شیرازہ کو بکھیرنے سے قاصر رہے تھے، اس چیز نے ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ جب تک خلافت کو ختم نہیں کیا جاتا اور مسلمانوں کی اجتماعیت اور وحدت کا یہ علامتی ادارہ ختم نہ ہو جائے گا، عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کرنا اور اپنی مرضیات کے تابع کرنا اپنے مقاصد کے لئے ممکن نہ ہوگا، چنانچہ انہوں نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا، چنانچہ ایک زبردست سازش کے نتیجہ میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے عالمِ اسلام میں قومیت اور وطنیت کے فتنہ کو نہایت ہی قوت کے ساتھ ابھارا گیا، عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا گیا اور خود عالمِ عرب میں بھی مختلف علاقوں میں علیحدہ قومیت کے نعرے لگائے گئے، اور جنگِ عظیم میں جرمنی اور اس کے اتحادیوں کی شکست نے ترکوں کو بے وزن کر کے رکھ دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکا کر کے خود ترکوں میں بھی اپنی قومی عظمت کا صور پھونکا گیا اور اس طرح خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، اور پورا عالمِ اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔

خاتمہ خلافت کے پیچھے خاص طور پر یہودی سازش کارفرما تھی، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ افسوس ناک حقیقت کافی ہے کہ جس یہودی نے ہمارے آخری عثمانی خلیفہ سے بیت المقدس اور فلسطین میں یہودیوں کے زمین خریدنے کی اجازت مانگی تھی اور کہا تھا کہ اگر خلیفہ اس درخواست کو قبول کر لیں تو ترکوں سے ذلیل ہوئی خلافت کے پورے قرضے یہودی ادا کر دیں گے، وہی یہودی مصطفیٰ کمال پاشا کی طرف سے الغاءِ خلافت کا پروانہ لے کر خلیفہ عبدالمجید کے پاس گیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس گہری سازش اور دور رس منصوبہ بندی کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کا چراغ بجھایا گیا اور عالمِ اسلام کو فوجی اعتبار سے بے اثر کرنے کے لئے اسے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا جو کسی بیرونی دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز و قاصر ہے، پھر یوں کہ عالمِ اسلام کے اکثر حصے

پر مغرب کی استعماری طاقتیں براجمان تھیں، اس لئے ان ملکوں کو آزاد کرتے ہوئے ان چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے درمیان بھی سرحدی جھگڑے برقرار رکھے گئے، تاکہ یہ کبھی اپنی باہمی آویزشوں سے آزاد نہ ہونے پائیں اور ہمیشہ صلیبی اور صہیونی طاقتوں کا لقمۂ تر بنی رہیں۔

چنانچہ خلافت کے سقوط کے بعد جلد ہی فلسطین میں اس اسرائیلی حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کا صدیوں سے یہودی خواب دیکھتے تھے اور جو ۱۹۴۸ء سے آج تک عالم اسلام کے قلب میں ایسا ناسور ہے جس سے امت کا پورا وجود کراہ رہا ہے۔ آخر یہی اسرائیل توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کے قبلۂ اول مسجد اقصیٰ پر قابض ہوا اور نہ صرف فلسطین بلکہ مصر و اردن اور شام تک کے ایک بہت بڑے علاقہ پر صرف چھ دن کے عرصہ میں بزور طاقت قبضہ کرلیا۔ یہ اس صدی کا دوسرا بڑا حادثہ ہے جو مسلمانوں کے لئے المناک بھی ہے اور شرمناک بھی، کہ ایک چھوٹا سا ملک غاصبانہ مسلمانوں کے قبلۂ اول پر قابض ہے اور پچاس سے زیادہ عرب اور مسلم ممالک مل کر اس کو بازیاب کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ اگر عوام کا خوف نہ ہو تو بعض عرب قائدین تو مقام مقدس کا سودا کرنے کو بھی تیار ہیں۔ اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ اور فلسطینی بھائیوں پر جور و ستم جس قدر افسوسناک ہے اس سے زیادہ حسرت عالم اسلام کی بے بسی، اعداء اسلام سے ان کی قربت اور اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت سے ان کی محرومی پر ہوتی ہے۔ صلاح الدین ایوبی سے پہلے جب بیت المقدس صلیبی طاقتوں کے قبضہ میں گیا اور کم و بیش ۹۰ سال مسلمان اپنے اس مقدس مقام سے محروم رہے تو اس وقت امت کا ایک ایک فرد بیت المقدس کے حصول کے لئے بے چین تھا اور سلاطین اسلام سمجھتے تھے کہ صرف یہی ان کا مقصد وجود ہے، لیکن آج اسلامی ممالک اس معاملہ میں اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ گویا کوئی اہم واقعہ ہی نہیں، اور اگر بعض مسلم حکمرانوں کو اپنی عوام کے احتجاج کا اندیشہ نہ ہو تو شاید وہ وقت بھی آجائے کہ اس مقام مقدس کو اسرائیل کے حوالے کردیں، حیرت اس بے حیائی پر ہوتی ہے کہ بعض مسلم ممالک نے ایسی غاصب یہودی قوت کے ساتھ اپنے تجارتی اور دفاعی معاہدات

بھی قائم رکھے ہیں۔

تیسرا بڑا حادثہ وہ ہے جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں پیش آیا۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے پہلے کوئی مسجد شہید نہ کی گئی ہو، خاص کر ہندوپاک کی تقسیم کے وقت کتنی ہی مسجدیں تھیں جن پر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا، لیکن بابری مسجد کی نوعیت ان سب سے الگ ہے، بابری مسجد کو شہید کرنے کے لئے ایک ایسی تاریخ گھڑی گئی جس کے لئے کوئی سند نہیں، پھر اسے بت خانہ میں تبدیل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بند مہم چھیڑی گئی، فرقہ پرستی کی آگ بھڑکائی گئی اور شہر شہر قریہ قریہ فرقہ پرست طاقتوں نے اس موضوع کو ہر عام و خاص کے ذہن میں داخل کیا اور پھر علی الاعلان مجمع عام میں پہلے سے دی گئی تاریخ پر مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور اللہ کے گھر کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا گیا، یہ صرف ایک مسجد کی شہادت نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد پورے اعلان و اظہار کے ساتھ شعائر اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر تھی، جس کے ذریعہ پوری دنیا میں بسنے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا گیا کہ وہ سر اٹھانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ایک مجبور و مقہور قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہیں، اسلامی ممالک کی اس واقعہ پر خاموشی اور بہت سے ممالک کے رد عمل کے اظہار سے بھی گریز نے اس بات کو صاف ظاہر کر دیا کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں کے ساتھ کتنا بڑا واقعہ بھی پیش آجائے، عالم اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں، بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں یہ واقعہ اسرائیل کے اگلے منصوبے کے لئے آزمائش نہ ہو۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ بھی اصل میں اسی یہودی ذہن کی غماز ہے جو اسرائیل کے وجود کے پیچھے کارفرما ہے، یہودی اور برہمن دو ایسی قومیں ہیں جو اپنی نسلی برتری کی دعویدار ہیں اور یہ قومی تفاخر کا جذبہ محض سماجی رسم و رواج کے درجہ میں ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے عقیدہ و ایمان کا حصہ ہے، چنانچہ ہندوستان میں جب نچلی ذات کے لوگ کھڑے ہونے لگے اور انہوں نے برہمنوں کو چیلنج کیا تو ہندوستان کی برہمن طاقت نے بابری مسجد کے مسئلہ کو اٹھا دیا تا کہ یہ نئی تحریک دب جائے اور فرقہ وارانہ منافرت اپنے شباب کو پہنچ

جائے، یہاں تک کہ برہمن فکر کی نمائندہ فرقہ پرست تنظیمیں بام اقتدار پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں، جیسے یہودی مغرب کی معیشت اور ذرائع ابلاغ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں اور کلیدی عہدے پر متمکن ہیں اسی طرح ہندوستان میں برہمنوں نے ملک کی معیشت اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اسی لئے اقتدار کے تمام کلیدی عہدوں پر ان کا قبضہ ہے، ہندوستان اور اسرائیل کی قربت نے ان دونوں ہم فکر قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے، ان کی قوت کو توڑنے اور انہیں احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی تدبیروں اور سازشوں میں دونوں دوش بدوش ہیں۔

غور کیا جائے تو مسلمانوں کی اس پسپائی اور وقتی ہزیمت کے اسباب میں سے دو نہایت اہم سبب ہیں۔ ایک مسلمانوں کا باہمی اختلاف، دوسرے مسلمانوں اور عالم اسلام کے دشمنوں اور کھلے ہوئے مخالفوں کے ساتھ مسلمانوں کے ایک طبقہ کی دوستی اور قربت۔

عہد صحابہ سے لے کر آج تک جہاں کہیں مسلمانوں نے نقصان اٹھایا ہے، بنیادی طور پر اس کا سبب باہمی اختلاف و انتشار ہے۔ عالم اسلام پر جتنی بڑی بڑی مصیبتیں آئی ہیں، وہ سب اسی اختلاف کی ذرین ہیں۔ تاتاریوں کا فتنہ کیوں کر داخل ہوا اور کس طرح اس نے دار الخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی؟ اسپین سے مسلمانوں کو آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد پھر کیوں رخت سفر باندھنا پڑا؟ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں مغربی قومیں کیوں کر فتح یاب ہوئیں؟ عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کا وجود کیسے چھپ سکا؟ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا سورج کیوں اور کب غروب ہوا؟ تاریخ کے صحیفہ میں اس طرح کے جتنے واقعات موجود ہیں ان سب کے بارے میں سوال کیجئے اور تاریخ کی عدالت سے اس کا جواب پوچھئے تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلاف نے ان کی قوت کو پاش پاش کیا، ان کے دشمنوں کی جرأتیں بڑھ جائیں اور پھر فتح مندی اور ظفر مندی نے ان سے ایسا منہ موڑ لیا گویا اس قوم کی قسمت میں یہ چیز آئی ہی نہ ہو۔

یہ سمت سے ترقی و تنزل اور فتح و شکست کے بارے میں اسی قانون کے عین مطابق ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے

"وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ" (الانفال: ۴۶)

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، آپس میں جھگڑا نہیں ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

یعنی مسلمانوں کے اختلاف و انتشار کے ساتھ ان کی پسپائی اور ہوا اکھڑنے کی اللہ کی طرف سے مقدر ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا قانون بدل نہیں سکتا۔

دوسرا سبب مسلمانوں کی اعداء اسلام کے ساتھ قربت، یہاں تک کہ دفاعی معاملات میں بھی ان پر اعتماد و انحصار ہے۔ قرآن میں کتنے ہی مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیونکہ وہ تم کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور ہمیشہ تمہاری تکلیف اور مشقت کے آرزومند رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر "بطانۃ" (آل عمران: ۱۱۸) کا لفظ استعمال فرمایا ہے، "بطانۃ" کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اندرونی حالات اور رازہائے درون سے واقف ہو۔ آج عالم اسلام کا حال یہ ہے کہ ان کی فوجی تنصیبات اعداء اسلام کے ہاتھوں میں ہے، ملک کی داخلی اور خارجی خدمات بھی ان کے حوالے ہے۔ یہ بات کس قدر حیرت ناک ہے کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر کے متعدد کمانڈر وہ تھے جن کی بیویاں یہودی تھیں اور ان سے جنگ کی تمام تدبیریں اسرائیل کے سامنے اس طرح تھیں جیسے کوئی شخص آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا ہو۔ آج بھی بڑے بڑے عرب فرمانرواؤں کے محلات میں اسرائیلی اور یہودی عورتیں ہیں، خود ہندوستان میں ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جو لوگ علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں اور جن جماعتوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کو اپنا منتہائے مقصود بنا رکھا ہے، ان کو بھی مسلمان ہمنوا اور مسلمان دوست مل جاتے ہیں۔ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس معاملے میں یہودی اور عیسائی ایک ہی ہیں، ان میں کوئی فرق

نہیں دیکھیں کہ مسلمانوں کے مقابلہ وہ ایک دوسرے کے دوست اور ہم نوا ہیں، لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (مائدۃ: ۵۱) اور جو نفرت یہودیوں کی ہے وہی مشرکین کی ہے، اسی لئے مسلمانوں کی عداوت میں قرآن نے دونوں کو ہم پلہ قرار دیا ہے۔

یہی استشراق اور اسلام دشمنوں کے ساتھ دوستی (موالات) ہے جس نے اس صدی میں عالم اسلام اور امت مسلمہ کو قدم قدم پر نقصان پہنچایا اور ذلت و نکبت سے دو چار کیا ہے اور ضرورت ہے کہ اب مسلمان اس عالمی سازش کو سمجھیں، اپنے آپ کو انتشار سے بچائیں، خوش تدبیری کا راستہ اختیار کریں اور ان عناصر سے اپنے آپ کو دور رکھیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں، کہ یہ چیز ہمیں کمزور بھی کرتی ہے اور اللہ کی مدد سے محروم بھی رکھتی ہے، جہاں گذرنے والی صدی نے زخم اور کرب کے نقوش امت کو دیئے ہیں، وہیں اس صدی کے بعض ایسے خوش آئند اور خوش گوار پہلو بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ ایک انوکھی صدی ہے کہ یہودی، عیسائی اور کمیونسٹ جو قریب پوری دنیا پر بلا واسطہ یا بالواسطہ حکومت کر رہے تھے، انہوں نے اسلام کو مٹانے، مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے، ان میں احساس کمتری اور فکری تشکیک پیدا کرنے اور انہیں اپنے اندر جذب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ترغیب و تحریص کے وسائل بھی اختیار کئے گئے، علمی اور فکری یلغاریں بھی ہوئیں، سازشوں کے نوع بنوع جال بھی بنے گئے، جور و ستم بھی ایک سے بڑھ کر ایک روا رکھا گیا اور سارے حربے مسلمانوں پر آزمائے گئے، غالباً دشمنان اسلام کے ترکش میں کوئی ایسا تیر نہیں تھا جو اسلام اور مسلمانوں پر پھینکا نہ گیا ہو، لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے قدم کو متزلزل کر سکے اور نہ اسلام کی محبت کی جو شمع ان کے دلوں میں ہے وہ اسے اکھاڑنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی بیداری اور اسلامی حمیت میں اضافہ ہی ہوا، جتنا انہیں دبایا گیا وہ اتنے ہی اونچے اٹھے اور جتنا انہیں تپایا گیا اسی قدر ان کے حوصلہ و ہمت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اہل یورپ سمجھتے تھے کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا چراغ گل ہو چکا ہے اور

کچھ عرصے میں وہ اسلام کے خلاف عداوت اور نفرت و انتقام کی جو آگ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں، دل کی پیاس بجھا سکیں۔ لیکن بحمد اللہ وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکے، شاید انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کو عیسائیت اور دوسری قوموں پر قیاس کیا کہ جیسے عیسائیوں نے مظالم سے بچنے کے لئے ایک ایسے مذہبی تصور کو قبول کر لیا جو یونان کی قدیم بت پرستی سے ہم آہنگ تھی اور اصل عیسائیت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی، اور جیسے ہندوستان میں برہمن کے جور و ستم سے عاجز اور ان کی سازشوں کا شکار ہو کر مختلف مذہبی اکائیوں نے ہندو مذہب اور ہندو دھرم میں جذب ہونے کو گوارا کر لیا، اسی طرح جب خلافت کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کی مرکزیت بکھر کر رہ جائے گی اور وہ فوجی اور عسکری طاقت کے اعتبار سے اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ شکست خوردہ ہو جائیں گے، نیز مغرب کی طرف سے اسلامی عقیدہ سے لے کر شریعت اسلامی کے ماخذ، اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین پر فکری یورشیں منصوبے کے ساتھ کی جائیں گی تو بالآخر مسلمان وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوں گے جو اہل دوسری مغلوب و مقہور قوموں نے کیا ہے۔

لیکن سخت ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں نے جس استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، وہ بھی ایک مثال ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے روشن مثال ابھی قریب میں بوسنیا، کوسوو اور چیچنیا کی ہے۔ مغرب جو اپنے آپ کو تہذیب کا علمبردار کہتا ہے، اس نے یورپ کے قلب میں جیسی انسانیت سوز حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے اور ظلم و ستم کے بازار گرم کئے ہیں، شاید درندے بھی ان کو دیکھ کر عرق آلود ہو گئے ہوں اور شیطان نے بھی ان کا لوہا مان لیا ہو، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام، عصمت دری اور عزت ریزی کے، جو کسی مرکز کا تھا، درندوں نے کیسی کیسی شرمناک اور ہیبت ناک حرکتیں کیں کہ جن کا تصور کرنے کی بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے، اور یہ سب کچھ مغربی طاقتوں نے باہمی یگانگت کے ساتھ کیا ہے اور کوئی قوم ہوتی تو یقیناً سر تسلیم خم کر دیتی اور اپنے دین و مذہب کا سودا کر چکی ہوتی لیکن قربان جائیے اس علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں پر، جو دہائیوں سے کمیونسٹ حکومتوں کے زیر اقتدار رہنے کے باوجود اپنے سینوں میں ایمان کا آتش فشاں چھپائے بیٹھے تھے،

جنہیں جور و ستم کا سمندر بھی نہ بجھا سکا اور آخر ایسے تپتے وسائل سے محروم قوم نے ہر طرف سے تعاون اور مدد کے راستے منقطع ہونے کے باوجود صرف اپنے ایمان کو باقی رکھا بلکہ بوسنیا اور کوسوو تو اپنے سیاسی وجود کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا اور چیچنیا تو روس سے جبر و تشدد کے ذریعہ حاصل کر لیا۔ ہے لیکن مجاہدین کی جرأت و فراست نے آج بھی ان کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اگر کوئی ایسی تاریخ مرتب کی جائے جس میں اپنے مذہب اور اپنے دین کے بقاء کے لئے پیش کی جانے والی قربانیوں کی داستان رقم کی جائے تو یقیناً یہ اس کے زریں ابواب ہوں گے۔

روس میں کمیونزم کے ستر سالہ جابرانہ اقتدار کے بعد پھر اس کے بطن سے پانچ مسلمان ملکوں کا ظہور اور وہاں میں اپنے اسلامی اور مذہبی تشخص کا شعور خود ایک ایسا واقعہ ہے جس کو اس صدی کا معجزہ کہا جا سکتا ہے اور جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک ایسی طاقت ہے کہ نہ کوئی آگ اسے جلا سکتی ہے اور نہ کوئی طوفان اسے برباد کر سکتا ہے، اس کی جڑیں اہل ایمان کے قلوب میں اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں اکھاڑا جانا ممکن نہیں۔ اسلام کی فتح و کامیابی اور نصرت و ظفر مندی کی سب سے بڑی اور روشن مثال نہایت ہی ذلت و حقارت کے ساتھ افغانستان سے روس جیسی سپر طاقت کا ناکام اور نامراد واپس ہونا ہے۔

اسلام دشمن طاقتیں یہ سمجھتی تھیں کہ مسلمانوں کو سیم و زر سے خریدنا اور دنیا کی متاع حقیر کے ذریعہ ان سے دین و ایمان کا سودا کرنا تو ممکن نہیں، لیکن شاید جبر و استبداد کے ذریعہ ان کے مذہبی جذبات کو کچلا جا سکتا ہے، لیکن ان کا یہ اندازہ غلط ہی ثابت ہوگا۔ جس شخص نے اسلامی تاریخ پڑھی ہے اور کم سے کم فتنہ تاتار کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آگ کے سمندر سے گذر کر بھی اپنی متاع ایمان کو بچایا اور اسلام اور شعائر اسلام سے تعلق پر اپنی جان و مال اور اپنے اقارب و اولاد کو اس طرح نثار کیا ہے جیسے کوئی شخص کسی پودے کو تناور کرنے کے لئے بے قیمت اور مفت کا پانی اس کی جڑوں میں ڈالتا ہے۔

فتنۂ تاتار کے موقع سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ماوراء النہر، خراسان اور عراق کے علاقے خون کے سمندر میں تبدیل ہو گیا، کتنے ہی شہر لاشوں کے ڈھیر میں بدل گئے، بخارا کے قلعہ میں تیس ہزار افراد، شہر میں ستر ہزار، نیز سمرقند میں ایک لاکھ مرد، عورت اور بچے تہ تیغ کر دیے گئے، خوارزم میں ایک لاکھ افراد کو قیدی بنا لیا گیا اور پھر تمام زندہ نذرِ آتش کر دیا گیا، بامیان میں تین لاکھ لوگوں کے علاوہ چرند پرند تک قتل کر دیے گئے، خراسان اور مرو میں تیرہ لاکھ مرد، عورت اور بچے ذبح کر دیے گئے، نیشاپور جو ان شہروں میں تھا جسے سائنسی تہذیب و ثقافت میں ایک خاص مقام حاصل تھا، وہاں عورتوں اور بچوں کے علاوہ دس لاکھ چالیس ہزار صرف مرد قتل کیے گئے، ہرات ایک بہت ہی آباد علاقہ تھا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہاں سولہ لاکھ مسلمان قتل کیے گئے اور صرف پندرہ آدمی باقی رہ گئے، بغداد کا تذکرہ کیا ہے کہ تین دنوں تک بغداد کی گلی کوچوں میں پانی کے بجائے خون بہتا رہا اور دجلہ کا پانی میلوں تک سرخ ہو گیا، چھ ہفتوں تک مسلسل قتل عام کا سلسلہ رہا، مدارس میں طلبہ اور اساتذہ کو ذبح کیا گیا، قبریں اکھیڑ دی گئیں اور بڑے بڑے کتب خانے ایسے جلائے گئے کہ مہینوں ان سے دھواں اٹھتا رہا، غرض کہ تاتاری ایک قہر سامانی کے ساتھ عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی کہ لگتا تھا کہ واقعی اب دنیا میں اس قوم کا آخری دن ہے، ۱۲۱۸ء سے ۱۲۶۰ء تک ۴۲ سال عالم اسلام پر ایسی قیامت ٹوٹتی رہی کہ مؤرخین کا قلم یہاں پہنچ کر خون کے آنسو بہاتا ہے اور شیخ سعدی نے خوب کہا ہے کہ اس واقعہ پر آسمان خون برساتا تو حق بجانب ہوتا۔

"آسماں را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں"

لیکن اس قیامت کے باوجود بحمد اللہ مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کو متاثر نہیں کیا جا سکا، ایک طرف اسلام کی کشش نے خود تاتاریوں کو دامن اسلام سے باندھ دیا اور مسلمانوں کی فاتح قوم ان کی مفتوح ہو کر خود اسلام کی محافظ بن کر کھڑی ہوئی جب ۱۲۵۹ء میں چنگیز خان کا پوتا دامن اسلام میں آ گیا اور دوسری طرف مسلمانوں نے اپنی اجتماعیت کو بچانے کے لیے خلیفہ معتصم باللہ کی شہادت کے بعد دو سالوں کے اندر عباسی خاندان

کے ایک زندہ بچ جانے والے شخص ابوالقاسم محمد کو مستنصر باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کر لیا اور سب سے پہلے سلطان بیبرس نے خود خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یقیناً تیرہویں صدی میں بھی بہت سے طوفانوں سے گزرنے کے باوجود مسلمانوں نے اسلام سے اپنی اٹوٹ وابستگی کو برقرار رکھا ہے اور اپنے ایمان کی حفاظت کو ہر قربانی پر ترجیح دی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ان میں تین باتیں زیادہ اہم ہیں: اول پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے امت کی والہانہ محبت اور آپ ﷺ کی حرمت پر ہر قربانی کا ان کی نگاہ میں آسان بلکہ سامانِ سعادت ہونا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی جو دین کے بارے میں بہت زیادہ شعور نہیں رکھتے، اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں، شریعت کے بہت سے احکام ان کی زندگیوں میں نہیں ہیں، یہاں تک کہ بنیادی فرائض اور ارکان کی توفیق سے بھی محروم ہیں، برائیوں اور گناہوں نے ان کے پورے وجود کو اپنا اسیر بنا لیا ہے، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی چاہت سے ان کے قلوب معمور ہیں، آپ ﷺ کا نام نامی آتے ہی چشم عقیدت جھک جاتی ہے، آپ ﷺ کے ذکر گرامی پر ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں، اس کے کان ایسی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے جس سے ذرا بھی آپ ﷺ سے بے احترامی کی بو آئے، اس کی زبان ہر معاملہ میں بول جاتی ہے لیکن اپنے نبی ﷺ کے ذکر میں محبت و احترام کو ملحوظ رکھ کر بولتی ہے۔ یہ حب رسول اللہ ﷺ جو ایمان کی بنیادوں میں سے ایک ہے، جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا اور جو صحابہؓ سے نسل در نسل مسلمانوں کو میراث میں ملی ہے، اس محبت نے عام مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت، اسلام اور شریعت اسلامی اور سنت رسول ﷺ سے ان کی وابستگی اور اسلام کے لئے مر مٹنے اور سب کچھ نثار کر دینے کے جذبہ کی برقراری میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، اسی لئے مغربی مصنفین اور یہودی اور عیسائی مستشرقین نے سب سے زیادہ سیرت محمدی ﷺ ہی کو نشانہ بنایا ہے اور آپ ﷺ کے تقدس اور صداقت کو مشکوک کرنے کی بہت ہی منصوبہ بند اور غیر محسوس کوششیں کی ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عقیدت و محبت اور آپ ﷺ کے نام پر مر مٹنے کا

پناہ جذبہ مسلمانوں کی ایک خداداد میراث ہے جو آپ ﷺ کے جلیل القدر رفقاء اور صحابہؓ سے آج تک مسلمانوں میں چلی آتی ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک باقی رہے گی اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ محبت اور عشق و شیفتگی کے اس جذباتی عنصر کو اپنی اگلی نسلوں تک مسلسل پہنچاتے رہیں، ان کے ساتھ آج ان کا دو ساتھ ہیں، ہندوؤں میں کتنے ہی لوگ ہیں جو علی الاعلان دیویوں اور دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن یہودی، عیسائی یا ہندو سماج میں اس سے کوئی ردعمل نہیں پیدا ہوتا، کیوں کہ اپنے پیشواؤں کے تئیں محبت و احترام کا وہ اتھاہ جذبہ ان کے اندر موجود نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ودیعت کیا ہے اور جو ہمارے لئے ایمان کی حفاظت کا بہت بڑا ہتھیار ہے۔

دوسرا اہم سبب من جانب اللہ اس امت میں اصلاحی اور تجدیدی شخصیتوں اور تحریکوں کا تسلسل ہے، چوں کہ سلسلۂ نبوت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا ہے، اس لئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ امت اصحاب فکر مصلحین اور اصلاحی و تجدیدی تحریکوں سے خالی رہی ہو، دوسری قوموں میں ایسی تحریکیں تو موجود ہیں جو ان میں قومی نخوت پیدا کریں، جو ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کریں اور جو ان کو دوسری قوموں سے پنجہ آزمائی پر اکساتی رہیں، لیکن ایسی مثبت تحریکیں جو محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے لوگوں کو اس مذہب پر قائم رکھنے کی جد و جہد کرے جسے وہ حق سمجھتے ہوں اور جس کا مقصد ہی دین کو آمیزشوں سے بچانا اور مخلوق کو خالق سے جوڑنا ہو، موجود نہیں۔

یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس امت میں ہر عہد میں اصلاحی اور تجدیدی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور وہ دین کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا کام انجام دیں گی، چنانچہ اس صدی میں سلفی تحریک، سید احمد شہیدؒ کی تحریک، عالم عرب میں الاخوان المسلمون، ہندوستان میں مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی تحریک امارت، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریک اسلامی وغیرہ ایسی تحریکات ہیں جن سے یہ تو ممکن ہے کہ بعض افکار و رفقاء یا نظر میں اختلاف کیا جائے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد

ایسی تحریکیں کی ہیں جن کا مقصد خالصتاً لوجہ اللہ، اللہ کے دین کی حفاظت، اشاعت اور اس کی سربلندی ہے اور غالباً ان تمام تحریکات سے زیادہ خاص کر ہندوستان میں جس تحریک نے اثر ڈالا ہے وہ دینی مدارس کی تحریک ہے، جسے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء نے اٹھایا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دار العلوم دیوبند، مولانا انوار اللہ صاحبؒ نے جامعہ نظامیہ حیدرآباد دکن، مرزا عاشق منور علی صاحب نے دربھنگہ (بہار) میں مدرسہ امدادیہ کی اور آپؒ کے مختلف متوسلین نے مختلف علاقوں میں الگ الگ ناموں سے چھوٹی بڑی درسگاہوں کی بنیاد رکھی۔

یہ ان تحریکات ہی کا اثر ہے جس نے نہ صرف بوڑھوں بلکہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اسلام سے قریب کیا، جن کی کوششوں سے مسجدیں آباد ہیں اور جن کی مساعی سے اسلامی شعائر زندہ ہیں، بلکہ بعض غیر مسلم ممالک میں بہ مقابلہ مسلم ملکوں کے دینی بیداری اور ایمانی حمیت کے مظاہر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان دینی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ خالص مذہبی اور دینی اصلاحی کوششوں سے اپنے آپ کو مربوط رکھیں، کہ اس کی وجہ سے ان کے ایمان کو ایک نئی زندگی اور ان کے دینی رجحان کو ایک نئی توانائی حاصل ہوتی رہے گی۔

تیسرا اہم سبب روحِ جہاد کی از سرِ نو بیداری ہے، دوسری جنگِ عظیم، خلافتِ عثمانیہ کے سقوط اور عالمِ اسلام کی پسپائی کے بعد ایسا لگتا تھا کہ مسلمانوں کی ڈکشنری سے جہاد اور باطل سے پنجہ آزمائی کا لفظ ہی نکل گیا ہے، اگر مسلمانوں میں جہاد کی روح بیدار ہوتی، اللہ کے لئے جاں نثاری ان کا مطمحِ نظر ہوتا اور آرزوئے شہادت ان کو بے تاب رکھتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایک چھوٹا سا ملک مسلمانوں سے ان کا قبلۂ اول چھین لے، دنیا کی قومیں وطنی اور لسانی بنیادوں پر جنگ کرتی ہیں، جس کا مقصد ملک گیری اور کشور کشائی ہے، تنخواہوں اور معاشی سہولتوں کی لالچ میں سپاہی اپنی جان ہتھیلی پر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جہاد ایسے فاسد جذبہ اور فاسد مقصد کے تحت کی جانے والی لڑائی نہیں ہے، جہاد یہ ہے کہ خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اور شہادت کی آرزو کے ساتھ باطل کا مقابلہ اور اسلام کی سربلندی کے

لئے ایک سپاہی بے تابانہ آگے بڑھ جاتا ہے، اس کا مقصود مظلوموں کی مدد اور اللہ کے دین کی حفاظت ہوتی ہے کہ ملک و علاقوں کی فتح اور سیم و زر کا حصول اور دوسری قوموں پر ظلم و جور۔ جہاد کا مطمح نظر اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے، اس لئے اس راہ میں ناکامی کے لئے کوئی جگہ نہیں، کہ اس میں جیتنے والا بھی فتح مند ہے اور بظاہر ہارنے والا بھی، بلکہ بعض اوقات پانے والے سے زیادہ کامیاب کھونے والا ہے، یہ جذبۂ جہاد امت میں ایمانی حمیت کو باقی رکھتا اور اسلامی اخوت کو پروان چڑھاتا ہے، دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر خنجر چلے اور دوسرے کونے میں رہنے والا مسلمان تڑپ اٹھے، رسول اللہ ﷺ نے اس امت کی سربلندی اور عزت کو جہاد سے متعلق بتایا ہے۔ چنانچہ اس بات کی خاص طور پر کوشش کی گئی کہ مسلمانوں سے جہاد کا اسپرٹ ختم کردی جائے اور اس لفظ کو اتنا بدنام کردیا جائے کہ دوسرے تو دوسرے اپنے بھی اس کو بولنے اور لکھنے سے گھبرائیں۔

افغانستان میں غاصب روسیوں کے خلاف افغانوں کی تحریک جہاد نے امت کو دوبارہ جہاد سے لذت آشنا کیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے غیبی نصرت و مدد کے ایسے نظارے دیکھے کہ جسے وہ صرف تاریخ میں پڑھتے تھے، اور ان پر مشکل سے یقین کرتے تھے، ایک ایسی قوم جس کے پاس نہ ہتھیار تھے نہ کوئی تربیت یافتہ فوج تھی، نہ افرادی قوت کے اعتبار سے دنیا کی بڑی قوموں میں ان کا شمار تھا، نہ بین الاقوامی سطح پر ان کی کوئی ساکھ تھی اور انہوں نے ایک ایسی طاقت کا مقابلہ کیا جو اسلحہ کے اعتبار سے دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک اور فوج کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور جس کے بین الاقوامی اثر و رسوخ کا حال یہ ہے کہ اسے اقوام متحدہ میں "ویٹو" کا حق حاصل تھا، نیز ایشیا، یورپ بلکہ جنوبی امریکہ میں بھی کتنی ہی حکومتیں اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر عمل کرتی تھیں اور شکست و نامرادی کا لفظ گویا بھول سے اس کی تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا، اس کے باوجود اس بے سروسامان قافلے نے اتنی بڑی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔

اس نے پوری دنیا میں مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ دیا، ایک نئی ہمت اور طاقت عطا

کی ، اللہ کی نصرت پر اس کا یقین بڑھا ، بڑی طاقتوں سے مرعوبیت ان کے دلوں سے نکلی اور ظالموں اور حقیقی دہشت گردوں کے خلاف پوری دنیا میں جہاد کی ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ، بوسنیا ہو یا کوسوو ، چیچنیا ہو یا تاجکستان ، فلسطین کا انتفاضہ ہو یا فلپائن کا جنوبی علاقہ ، برما کے مظلوم مسلمان ہوں یا جنوبی سوڈان کے ، ہر جگہ مسلمانوں میں صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نیا حوصلہ پیدا ہوا اور یہی حوصلہ ہے جس نے آج مشرق و مغرب کو لرزہ براندام کر رکھا ہے کہ وہ کتنی بھی جابر بن لیتے ہیں مگر بالآخر وہ ہار و شکست کی علامت ہوتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس صورت حال نے مسلمانوں کی ایمانی حمیت میں اضافہ کیا ہے اور خاص کر جدید تعلیم یافتہ نئی نسل میں ایک نئی اُمنگ پیدا کی ہے ، یہ بات کچھ بہت پہلے کی نہیں کہ ہماری مسجدیں صرف چند بوڑھے اور ضعیف لوگوں سے آباد ہوتی تھیں ، لیکن آج ہماری مسجدیں نوجوانوں سے آباد ہیں ، دو دہے پہلے مسلمانوں میں داڑھی رکھنے اور اسلامی لباس اور وضع قطع کو اختیار کرنے سے ایک طرح کا گریز پایا جاتا تھا ، لیکن آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ایسے بہت سے چہرے نظر آتے ہیں جن کے بارے میں ایک عام آدمی کو مدرسہ کا طالب علم ہونے کا گمان ہوتا ہے ، مساجد و مدارس اور دینی کاموں کے لئے مسلمان بہت کم خرچ کرتے تھے ، لیکن آج مسلمانوں میں اپنے مذہبی ورثہ کی حفاظت کا نہایت ہی خوش آئند رجحان پیدا ہوا ہے ، غرض طلبہ اور تجار سے لے کر عام مسلمانوں تک میں مذہبی وابستگی کے جذبات بڑھے ہیں ، اس کیفیت کو باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

غرض کہ جہاں ہم نے اس صدی میں کھویا ہے وہیں پایا بھی ہے اور جہاں ہم پیچھے ہٹے ہیں ، وہیں ہم نے اپنے قدم آگے بھی بڑھائے ہیں ، جہاں یہ صدی ہماری بے عملی اور کوتاہیوں پر خندہ زن ہے ، وہیں اس امت کی استقامت ، ثابت قدمی ، دین پر مرمٹنے کی والہانہ جذبات ، اسلام سے بہر قیمت اپنی وابستگی کو برقرار رکھنے اور ظلم کے طوفان میں رہتے ہوئے بھی اپنے ایمان و عقیدہ کے آشیانہ کی بہر صورت حفاظت کرنے اور اس کے

لئے سب کچھ مٹا اور گنوا دینے پر آمادہ بھی ہے۔ خدا کرے کہ اکیسویں صدی اسلام، عالم اسلام اور امت اسلامیہ کی فتح و نصرت کی تاریخ رقم کرے اور حق کی سر بلندی اور سچائی کی بالا دستی نیز ظلم و جور کی پسپائی اور اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں کی ناکامی کی صدی ثابت ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ !

(۱۲،۱۹، جنوری ۲۰۰۱ء)

اپنی تاریخ کو بچائیے!

ہندوستان میں مسلمان اس وقت جن حالات سے گذر رہے ہیں، وہ بے حد صبر آزما اور تشویش ناک ہیں، یہ بات یقیناً بہت خوشگوار اور خوش آئند ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی جو شدت پہلے محسوس کی جاتی تھی، اب اس میں کمی آئی ہے، اور اس اعتبار سے بظاہر امن و امان کی فضا قائم ہو رہی ہے، ان حالات کو دیکھ کر بعض لوگ جو تاریخی اور ملی مسائل پر سطحی انداز سے سوچنے کا مزاج رکھتے ہیں، ایک گونہ مطمئن بھی ہیں، لیکن حقیقت بیں نگاہیں اس سے آگے دیکھ رہی ہیں، اور وہ موجودہ صورت حال کو زیادہ خطرناک اور مستقبل کے اعتبار سے کہیں زیادہ مضرت رساں سمجھتی ہیں۔

اور وہ یہ ہے کہ آر ایس ایس نے اپنے اصل نظریہ پر کام کرنا شروع کر دیا ہے، فساد کا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ مسلمان ذہنی طور پر مرعوب ہو جائیں، اور ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، یہاں تک کہ یا تو آخری طور پر وہ اکثریت کے سامنے سپر انداز ہو جائیں، اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں جذب کر لیا جائے، وہ اپنی شناخت سے محروم ہو جائیں، ان میں احساس کمتری پیدا ہو جائے، اس کے لئے وسیع الاطراف پروگرام بنایا گیا ہے، جو اب آہستہ آہستہ بے غبار ہوتا جا رہا ہے، ایک طرف نصاب تعلیم میں تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں، دوسری طرف ملک اور ملک کی آزادی کی نئی تاریخ لکھی جارہی ہے، تیسری طرف الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ہندو تصورات اور تہذیبی طور طریقوں کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ ایسے خطرناک اقدامات ہیں کہ جن کی سنگینی کا اندازہ مستقبل میں ہی ہو سکے گا، اگر بروقت ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو پھر اس کی تلافی شاید ممکن نہ ہوگی۔

سرکاری تاریخی ادارہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نے ملک کی آزادی پر ایک مستند تاریخی کتاب "ٹوورڈز فریڈم" کے نام سے ۱۰ جلدوں میں مرتب کی ہے، جسے ممتاز مورخ پروفیسر کے این پانیکر نے ایڈٹ کیا ہے، حکومت ہند نے نظر ثانی کے نام پر اس کتاب کو شائع ہونے سے روک دیا ہے، حکومت کا مقصد ظاہر ہے کہ اس میں فرقہ پرستانہ مسلم تحریکوں کو شامل کیا جائے، خود پروفیسر پانیکر نے بھی واضح کیا ہے کہ مرکزی حکومت تاریخ کو توڑ مروڑ کر اس پر "بھگوا رنگ" چڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ظاہر ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کو ملک دشمن اور قوم دشمن ثابت کیا جائے اور ملک کی آزادی میں ان کے کردار کو غیر موثر ثابت کرنا ہے۔

یہ نہایت اہم مسئلہ ہے، اور باشعور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوں، کسی بھی قوم کے لئے اس کی تاریخ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی لئے تاریخ کو قوموں کا حافظہ کہا جاتا ہے، تاریخ سے انسان ہمت و حوصلہ حاصل کرتا ہے، تاریخ باب عبرت اور سامانِ موعظت ہے، ماضی کی تاریخ مستقبل کے لئے تعمیری طریق کار کا درجہ رکھتی ہے، جو قومیں تاریخ سے محروم ہوں ان کی مثال بے نسب آدمی کی سی ہے، جو ہمیشہ احساس کمتری سے دوچار رہتا ہے، اور مقابلہ و مقاومت کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، غور کیجئے کہ قرآن مجید ہدایت اور موعظت کی کتاب ہے، اور یہی اس کا موضوع ہے، لیکن قرآن کا ایک قابل لحاظ حصہ قصص و واقعات پر مشتمل ہے، اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً ایک ہزار آیات واقعات و قصص سے متعلق ہیں، ۲۶ پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر آیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقوام اور دعوتِ حق سے ان کے انکار کا تو بار بار ذکر آیا ہے، اور بعض سورتیں تو ایسی ہیں جو خاص انبیاء کے نام پر ہیں، اس کے علاوہ متعدد سورتیں کسی قوم یا کسی شخصیت یا کسی اہم واقعہ سے موسوم ہیں، اور یہ اس کی دلیل ہے کہ تاریخ کسی بھی قوم کے لئے سامانِ حوصلہ بھی ہوتی ہے، اور سبق عبرت بھی، اور نقش راہ بھی، اسی لئے قرآن انبیاء اور اقوام کے قصص و واقعات کو نقل کرتے ہوئے عبرت و موعظت کے پہلو کی طرف بھی

اشارہ کیا جاتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے: فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین (النمل ۱۴) کبھی کہا جاتا ہے: فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین (القصص ۴۰) یعنی دیکھو کہ مفسدین اور ظالمین کا کیا انجام ہوا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ یہ سارا ان کو نصیحت ہے: ھٰذا ذکر (ص ۴۹) کبھی فرعون کی سرتابی اور اس کا انجام نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ اس میں اہلِ خشیت کے لئے عبرت ہے: ان فی ذلک لعبرۃ لمن یخشی (النازعات: ۲۶) اسی طرح احادیث میں انبیاء اور ان کی اقوام نیز عربوں کے ابتدائی حالات سے متعلق اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، اس سے تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کے یہاں تاریخ اور تذکرہ کا موضوع ہمیشہ سے اصحابِ تصنیف کا ایک مقبول اور پرکشش موضوع رہا ہے، اور علم کی دنیا میں تاریخ کے موضوع پر جتنا بڑا سرمایہ مسلمانوں کے یہاں ملتا ہے، شاید ہی کوئی اور قوم اس میں اس کی ہمسر ہو، اسی لئے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے لے کر آج تک پوری اسلامی تاریخ روشنی میں ہے، اسلام سے مسلمانوں کا رشتہ مستحکم اور استوار رکھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، خود ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے جو بے جگری کا مظاہرہ کیا اس میں بھی مسلم تاریخ نے ایک اہم محرک کی حیثیت سے تقویت پہنچائی ہے، مسلمانوں کا یہ احساس کہ انہوں نے کبھی غلامی کا جوا اپنی گردن پر برداشت نہیں کیا ہے، اور انہوں نے سر جھکانے کے بالمقابل آزمائش اور ابتلاء کے موقعوں پر سر کٹانے کو ترجیح دی ہے، ان کے جوش جنوں میں اضافہ کیا اور تمام تر بے سرو سامانی کے باوجود انگو ایک ایسی قوم کے مقابلہ استقامت و پامردی عطا کی کہ جس کی حکومت میں اس وقت کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

اس لئے کسی قوم کو اس کی تاریخ سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے کی خاندانی شناخت گم ہو جائے، ایسے بچے کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور کسی دوسرے خاندان کے ساتھ ضم کر دینا چنداں دشوار نہیں ہوتا، اسی طرح جب کوئی قوم اپنی تاریخ سے محروم ہو جائے یا اپنی تاریخ کے بارے میں احساسِ کمتری کی شکار ہو جائے تو اسے مرعوب کرنا اور

فکری اور تہذیبی اعتبار سے آگے بڑھی ہوئی اور طاقتور گروہ کے ساتھ جذب کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں، جس کی واضح مثال اس ملک میں دلت ہیں، جو اپنی کثرت تعداد کے باوجود زبردستی ہندو تہذیب میں جذب کر لئے گئے ہیں، اور برہمنوں کے لئے آلۂ کار اور خدمت گار ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ اسی تجربہ کو دہرانا ہے، مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کی تاریخ مسخ نہیں کی، جن لوگوں سے صدیوں ان کی جنگیں ہوئیں، جن قوموں کے ساتھ ان کے معرکے ہوئے اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ان کے ساتھ بھی مسلمان مورخین نے کبھی ناانصافی روا نہیں رکھی، اس لئے کہ قرآن مجید کی واضح ہدایت ہے کہ کسی قوم کی برائی، اس کے ساتھ ناانصافی کا جواز فراہم نہیں کرتی: لا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا [المائدہ:] خود ہندوستان پر عرب مورخین اور سیاحوں نے قلم اٹھائے ہیں، جو خامیاں تھیں ان کا بھی ذکر کیا ہے، اور خود ہندو مورخین کو ان سماجی کمزوریوں کا اعتراف ہے، اور جو خوبیاں تھیں ان کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے، ہندوستان کے علم و حکمت، طب، دستکاری کی صلاحیت اور بہادری وغیرہ کا تفصیل سے ذکر آیا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ ملک جس کو مسلمانوں نے وسعت و وحدت عطا کی، معاشی فراخی دی، امن و امان دیا، عدل و مساوات سے آشنا کیا، سماجی انصاف کی دولت دی، اس کے چپہ چپہ پر تاریخی عظمت کے نقوش ثبت کئے اور اسی زمین کو اپنا مسکن اور وطن بنایا، ان کی قربانیوں کو وہ لوگ مسخ کرنا چاہتے ہیں جن کے تلووں میں اس ملک کے بنانے، سنوارنے اور بچانے میں شاید ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم اس صورت حال کا قانون اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کریں، اور دوسری طرف مسلمان مورخین انصاف پسند غیر مسلم مورخین کے اشتراک کے ساتھ ہندوستان کی آزادی اور اس کی تعمیر کی بابت مسلمانوں کی جد وجہد کی تاریخ مرتب کریں، اور درست علمی مواد قوم و ملک کے سامنے

پیش کریں۔ یہ ایک طرف اس ملک کے ساتھ خیر خواہی ہوگی، انصاف ہوگا۔ اس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی، لوگ حقائق سے واقف ہو سکیں گے، اور دوسری طرف خود مسلمان نوجوان اور آنے والی نسل احساس کمتری سے محفوظ رہے گی، اور اپنی تاریخ سے اس کا رشتہ مربوط اور استوار رہے گا۔ اگر اس وقت اس صورت حال پر توجہ نہیں دی گئی تو پھر آئندہ شاید ان غلطیوں کی تلافی ممکن نہ ہو۔

(............)

صبر ایک تدبیر ہے!

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے: ایک یہود، دوسرے منافقین۔ یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی اور منافقین بغض و دشمن تھے، جو چھپ چھپ کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے، کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ عبداللہ ابن ابی ان کا سردار تھا۔ ابتداءً اس شخص کا نفاق اتنا زیادہ ظاہر نہیں تھا اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے۔ مدینہ میں اس شخص کو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا۔ بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے مگر اسلام کے بعد عبداللہ ابن ابی کا خواب پورا نہ ہوسکا۔ غالباً اسی لئے بھی عبداللہ ابن ابی کے دل میں اسلام اور نبی اسلام کے خلاف آتشِ غضب بھڑکتی رہتی تھی۔

آپ ﷺ اپنے رفقاء مہاجرین اور انصار کے ساتھ ایک مہم پر نکلے، اس میں عبداللہ ابن ابی بھی شامل تھا۔ ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا اور پانی پینے کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کے غلام اور انصاری صحابی کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، بات آگے بڑھی، غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے آواز دی اور انصاری نے انصار کو پکارا اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخصوں کا نہ رہا، بلکہ دو جماعتوں "انصار و مہاجرین" کا اختلاف بن گیا۔ آپ ﷺ نے دونوں کو فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ لیکن عبداللہ ابن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس کو مہاجرین و انصار کے درمیان گروہ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لئے آئی کہ تم نے محمد (ﷺ) اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ تمہاری

مثال عربی زبان کے اس محاورے سے دی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو تاکہ وہ تمہیں ہی کھا جائے "سمن كلبك يأكلك" پھر یہ بھی کہا کہ اب مدینہ پہنچ کر جو باعزت لوگ ہیں، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ ابن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی۔ ایک نو عمر انصاری صحابی حضرت زید ابن خالد جہنیؓ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی اور جذبۂ ایمان کے تحت رسول اللہ ﷺ سے یہ صورتِ حال عرض کر دی۔ حضرت عمرؓ پر جوشِ حق کا غلبہ رہتا تھا اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہیں تھا، انھوں نے آنحضور ﷺ سے درخواست کی کہ اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر رہے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے براہِ راست عبداللہ ابن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی۔ اس نے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی۔ انصار میں سے اکابر اور سربرآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید تو بچے ہیں، ان کی بات کا کیا اعتبار؟ مگر خود وحی الٰہی سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی۔ بہرحال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہو گیا اور بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ ﷺ نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا۔ آپ ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے، لیکن خلافِ معمول آپ پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے اور اگلے دن دوپہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوئے۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ، گرمی، بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہوئی تھی اس کا اثر بھی جاتا رہا، دراصل یہی مصلحت تھی جس کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا، تاکہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں!

کچھ عرصہ کے بعد جب عبداللہ ابن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آ گیا، حضرات صحابہ کو بھی اس کا خوب اندازہ ہو گیا تو عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے جو مخلص مسلمان تھے اور ان کا نام بھی عبداللہ ہی تھا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرنے والے ہیں اور وہ واقعتاً اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں مگر مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے والد کے قتل کی وجہ سے کسی مسلمان کا قتل ہو جائے کہ میں کہیں اپنے والد کے قاتل کو شاید بدلہ کے جوش میں مار نہ ڈالوں، اس لئے آپ ﷺ مجھے حکم دیجئے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دوں، آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور حضرت عمرؓ کو بلا کر صورت حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہو گئے تھے اور آج صورت حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ ان کے نفاق اور درپردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں اور خود ان کو لا کر اس کے قتل کے لئے تیار ہیں، حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی اس دوراندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) کی رائے میں برکت رکھی ہے۔ بارك الله في رأي رسوله ۔

یہ ایک مثال ہے حسن تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی، اسی کو قرآن مجید نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے۔ صبر کے معنی بزدلی اور بے بسی کے نہیں ہیں، بلکہ صبر سے مراد حسن تدبیر اور کسی اقدام کے لئے صحیح موقع و محل کا انتخاب کرنے کے ہیں۔ صبر یہ ہے کہ اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپ کو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے؛ اس لئے کہ اشتعال اور غیظ و غضب کی حالت میں انسان کی قوت فیصلہ کمزور ہو جاتی ہے اور فراست و دانشمندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ لا يقضي القاضي وهو غضبان، کیوں کہ غصہ کی حالت میں آدمی معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے شعلہ زنی کی

معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی پیچیدہ حالات میں اہم فیصلے کرے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ جذباتی اور ہنگامی مسائل میں جب جوش اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان شخصی بھی ہوگا، دوررس بھی اور دیرپا بھی۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرزِ عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہمیشہ آپ ﷺ نے خوش تدبیری کو اوقاتِ جذبات پر غالب رکھا۔ صلح نامہ لکھتے ہوئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا گیا۔ اس کے نمائندے نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانہ جاہلیت کے طریقے پر "باسمک اللھم" لکھا جائے۔ آپ ﷺ نے اسے مان لیا۔ پھر صلح کے فریق کی حیثیت سے آپ ﷺ کا اسم گرامی "محمد رسول اللہ" لکھا گیا۔ دوسرے فریق نے "رسول اللہ" کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ ﷺ اس پر بھی تیار ہو گئے۔ حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اس لفظ کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے خود مٹا دیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے، اور مدینہ سے جو مرتد ہو کر مکہ آئے اسے واپس نہ کیا جائے۔ یہ بالکل امتیازی دفعہ تھی۔ یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام کریں، مزید یہ کہ میان میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ رکھیں۔ یہ ساری باتیں عربوں کی روایات کے سراسر خلاف تھیں۔ حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی، اپنے تحفظ کے لئے ہتھیار رکھنا بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جا رہے تھے، لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ ﷺ نے منظور فرما لیا۔ صحابہ کو یہ صلح بہت ناگوارِ خاطر تھی، حضرت عمرؓ سے تو برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے آپ ﷺ سے فرطِ جذبات میں کچھ ایسے سوالات کر لئے کہ بعد میں پشیمان رہتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے کہ لوگ اس

جس نے ایک دوسرے سے اس معاہدے تھے کہ کر برکات ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اس صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی "فتح مبین" قرار دیا۔ (الفتح ۱) در اصل آپ ﷺ کے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں تھے، ہر صبح و شام خوف کی کیفیت سے گزر رہے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل عرب کو معتدل فضا میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے، دعوت و تبلیغ کی راہیں گھٹی ہوئی ہیں، پھر اس خوف و دہشت کی فضا میں کھل کر دعوت اسلام کا کام بھی نہیں ہو سکتا تھا، آپ ﷺ کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے وہ دلوں سے بڑھ کر مخالفین کو بھی مسخر کر سکتی ہے اور جن لوگوں کو میدان جنگ میں فتح نہیں کیا جا سکتا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات ان کے قلوب و اذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ کے رفقاء کی تعداد چودہ سو تھی، اس واقعہ کے صرف دو سال بعد فتح مکہ ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے، اور فتح مکہ کے دو سال بعد جب آپ ﷺ نے حج فرمایا تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی، گویا آغاز نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ ہوئی اور اگلے چار سال میں ان کی تعداد یقیناً سو گنا بڑھ گئی، کتب حدیث کی روشنی میں حجۃ الوداع کے موقع پر تو خود آپ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دی تھی۔

آپ ﷺ کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالات سے گزر رہے ہوں اور سیاسی اور اقتصادی مغلوبیت سے دو چار ہوں تو اس وقت خصوصاً اور ہر حال میں عموماً اپنے ردعمل کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں۔ جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور تعصبات پر دور اندیشی کو، غضب پر صبر اور خوش تدبیری اور مناسب موقع و محل کے انتظار کو ترجیح دیں، ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھائیں، ایسا رد عمل

نہ ظاہر کریں جو خودکشی کے مترادف ہو اور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور ہماری ترقی معکوس ہو جائے۔ یہ درست ہے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہونا فرقہ پرستوں کی سب سے بڑی کامیابی اور حسن تدبیر کے ساتھ ان کی سازشوں کا مقابلہ کرنا فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بلاشبہ عزیمت ہے اور حقیقت میں فتح مبین!!

(۲۶/جون۱۹۹۹ء)

پروپیگنڈہ کا جواب عمل سے!

کئی سال پہلے کی بات ہے، میں دہلی سے حیدرآباد جا رہا تھا، میرا ریزرویشن فرسٹ کلاس میں تھا۔ فرسٹ کلاس کے کیبن میں عام طور پر دو یا چار برتھ ہوتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے یہ بوگی کے آخر سرے کا کیبن تھا، وہ ایک طرف سے کسی قدر تنگ ہو گیا تھا، اس لئے اس میں تین برتھ تھے۔ دہلی سے ہم دو مسافر اسی کیبن میں سوار ہوئے، ایک طرف میں، اور ایک طرف میرے ہی ہم عمر ایک مسافر جو سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھے، ان کی پیشانی پر سرخ و سفید قشقے ہندو مذہب پر ان کے ایمان اور ان کی مذہبیت کو ظاہر کر رہے تھے۔ گاڑی جب بھوپال پہنچی تو ایک ہندو فیملی آئی، ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی، جس کی عمر اٹھارہ بیس سال رہی ہوگی، یہ لوگ اصل میں ناگپور کے رہنے والے تھے، اور کسی ضروری امر کے تحت لڑکی کو اچانک بھیج رہے تھے، لمبا راستہ اور تنہا ایک لڑکی کا سفر، اس سے وہ لوگ پریشان تھے۔

انہوں نے کیبن میں اس کا سامان رکھا، اور سولا تھی وہ ہندو بھائی میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے، اور میری شکل و صورت سے ان کے لئے یہ پہچاننا بالکل دشوار نہیں تھا کہ میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ایک مولوی واقع ہوا ہوں، اس کے باوجود وہ ہماری طرف مخاطب ہوئے، اور کہنے لگے ''مولانا صاحب! اسے ناگپور جانا ہے، یہ اب آپ کی لڑکی ہے، اور ہم اسے آپ کے حوالے کر رہے ہیں۔'' گاڑی نے سیٹی بجائی اور انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی لڑکی کو رخصت کیا، میں برابر اس سے پوچھتا رہا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے، جب میں چائے لینے پلیٹ فارم پر اترتا تو اس کے پانی کا برتن بھی ساتھ لے لیتا۔

یہ لڑکی عیسائی تھی، اور کسی قدر شوخ بھی، کچھ دوسرے حضرات نے بھی اس سے کچھ سوالات کئے، جب اسے معلوم ہوا کہ میں اسلامی علوم کی تدریس کا کچھ تجربہ رکھتا ہوں تو اس نے اسلام کے بارے میں بہت سے سوالات کئے، جن میں زیادہ تر قرآن و حدیث کی تعلیمات سے متعلق تھے، اس نے مذہب کی ضرورت کو تسلیم کیا۔

لیکن اس کے بعد اسلام میں خواتین کا کیا درجہ و مقام ہے؟ اس بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی، مجھے حیرت ہوئی کہ اس بارے میں اسے کافی مخالفانہ معلومات حاصل تھیں، تعدد ازدواج، طلاق، میراث، پردہ، عام طور پر وہ تھوڑی بحث کے بعد میرے جواب سے مطمئن ہو جاتی، آخر میں اس نے دیت (خون بہا) کے بارے میں سوال کیا: آپ کے مذہب میں عورتوں کے خون کی قیمت مردوں کے خون سے کم رکھی گئی ہے؟ مجھے تعجب ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے قانونِ دیت کے بارے میں علم نہیں ہوگا، لیکن اس نوعمر غیر مسلم لڑکی کو یہ معلومات حاصل ہیں، میں نے اس سے بتایا کہ دیت کا تعلق انسان کے درجہ و مقام سے نہیں، بلکہ اس میں دو پہلو ہیں، ایک تو قاتل کی سرزنش، دوسرے مقتول کے پسماندگان کی معاشی دشواری، صورتِ حال یہ ہے کہ مرد پر خاندان کی معیشت کا بوجھ ہوتا ہے، اگر وہ مارا جائے تو بچے ہوں یا بوڑھوں، ان کا گھر تباہ ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ اس کے زیر پرورش لوگوں کی گذر اوقات کا بھی مسئلہ ہو جاتا ہے، اگر عورت ماری جائے تو صدمہ تو بعض اوقات مرد کے قتل سے بھی زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ ایک بچے کے دل میں ماں کی محبت باپ سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن معاشی مسائل پیدا نہیں ہوتے، اسی بنیاد پر مرد کی دیت زیادہ رکھی گئی، تاکہ قاتل کی سرزنش بھی ہو، اور مقتول کے لوگوں کے لئے جو معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں، کسی حد تک ان کا مداوا بھی ہو سکے، عورت کی دیت میں صرف قاتل کی سرزنش کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لئے مقصد یہ ہے کہ یہ فرق مقتول کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے، نہ کہ درجہ و مقام کی بنا پر، اگر درجہ و مقام کی بنا پر دیت میں فرق کیا جاتا تو نیک و بد، عالم و جاہل، حاکم اور محکوم، مذہبی نقطۂ نظر سے

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ مجھے اسلام سے بڑی دلچسپی ہے، اور یہ میرے لئے بہت اچھا موقع ہے کہ مجھے براہ راست ایک مسلمان عالم سے اسلام کو سمجھنے کا موقع مل رہا ہے، اس نے مجھ سے بارہا اشتعال انگیز اور غصہ دلانے والے سوالات کئے، لیکن میں نے ہمیشہ تحمل اور صبر کے ساتھ جواب دیا، اس بات نے خاص طور سے اسے متاثر کیا، وہ کہنے لگی کہ کیا آپ کو غصہ آتا ہی نہیں ہے؟ میں نے اسے حضور ﷺ کی حدیث سنائی جس میں ایک صاحب نے آپ سے جینے کا طریقہ دریافت کیا گیا، اور آپ ﷺ نے بار بار ایک ہی بات ارشاد فرمائی کہ غصہ نہ کرو، لا تغضب۔ جب ٹرین پونہ پہنچی تو اس کے ماموں وغیرہ پلیٹ فارم پر موجود تھے، اس نے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ "مولانا صاحب ہمارے گرو اور ہمارے پتا جی کے سمان ہیں" یعنی ہمارے استاذ اور باپ کے درجہ میں ہیں، پھر ٹرین کھلنے تک وہ لوگ رکے رہے، اور میری تواضع کرتے رہے۔

یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے، جہاں تک اسلام کے بارے میں سوال و جواب کی بات ہے تو اس کی نوبت تو ٹرینوں اور سواریوں میں آتی ہی رہتی ہے، اصل میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ یہ کہ اس کمپارٹمنٹ میں میرے برابر ہی میں ایک ہندو شخص موجود تھا اور اپنی ہندو بچیوں کے ساتھ تھا، تنہا اسے بھی حیدرآباد آنا تھا، انسان کے لئے عزت و آبرو کا مسئلہ جان و مال سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے، لیکن بمقابلہ اس غیر مسلم کے ہندوستان میں ہندو فکر کے سب سے بڑے مرکز ناگپور کے ہندوؤں نے ایک مسلمان مولوی پر زیادہ اعتماد کیا، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور حاملین اسلام کے بارے میں عام آدمی کیا سوچتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ سوچ تجربات پر مبنی ہوتی ہے۔

۱۱ ستمبر کے واقعہ سے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، لیکن خود میرے ساتھ بعض واقعات اس کے بعد ایسے پیش آئے جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، حیدرآباد میں ایک مرکزی ترپ بازار ہے، جس میں الیکٹرک اشیاء اور تعمیری سامان کے علاوہ ٹین کے چولہوں کی بھی بڑی

دکانیں ہیں، جمعہ کے دن مسجد جاتے ہوئے ایک چولہا خریدنے اسی بازار کی ایک دکان میں جانا ہوا، جو ہندو بھائی کی دکان ہے، ہم نے ایک چولہا پسند کیا، قیمت طے کرلی، اور اسے پیک کرالیا، اب جو جیب میں ہاتھ ڈالا، تو متعینہ قیمت میں پانچ سو روپے کم تھے، میں بڑا شرمندہ ہوا، اور ان سے بے تکلف ظاہر کئے بغیر کہا کہ آپ ابھی یہ سامان کو اسی طرح رہنے دیں، میں ان شاء اللہ کل آکر لے جاؤں گا، اس نے سبب پوچھا، میں نے ٹالنا چاہا، لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے صورتِ حال بتادی، اس نے بلا تامل کہا کہ اس میں کیا بات ہے؟ جو پیسے ہیں دے دیں اور چولہا لے جائیں، آپ دھوکہ تھوڑا ہی دیں گے، میں ہچکچایا، لیکن اس نے اپنے ملازم سے چولہا میری گاڑی میں رکھوا دیا، اور کہا کہ کل ہی پیسہ لاکر دینا ضروری نہیں، آپ دو چار روز میں جب بھی اس طرف آئیں، اس وقت مجھے پیسے دے دیں، ظاہر ہے کہ اس کا یہ اعتماد مجھ پر نہیں، بلکہ داڑھی، ٹوپی، اور میری مولویانہ وضع پر تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے بدترین پروپیگنڈوں کے باوجود آج بھی مسلمان مذہبی حضرات پر لوگوں کو کس قدر اعتماد ہے؟ ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے، اور میری طرح بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی مسلمان جھوٹ بولتا تو غیر مسلم انہیں عار دلاتے کہ تو مسلمان ہوکر جھوٹ بولتا ہے؟ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی واقعات ہیں، اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو عام طور پر اس کے تجربے گزرتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کے ذہن پر اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاق کے تئیں ایک نقشِ جمیل اب بھی ثبت ہے۔

فرقہ پرست عناصر چاہتے ہیں کہ غیر مسلم اذہان سے اس نقش کو مٹا دیں، اور ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کردیں کہ مسلمان قاتل، رہزن، لٹیرے، عورتوں پر ظلم و جور روا رکھنے والے، دھوکہ باز اور اپنی قوم کے علاوہ دوسروں سے نفرت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، مسلمان علماء اور اہل مدارس کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں عام تصور یہی تھا کہ یہ نیک اور انسانیت پسند لوگ ہوتے ہیں، اسی لئے خاص طور پر انہیں دہشت گرد اور شدت

پسند ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ انتہائی صورت حال ہے کہ آزاد ہندوستان میں مدارس کے لئے کبھی ایسی صورت حال پیش نہیں آئی تھی، اور دوسری جنگ عظیم کے بعد کی سچ یہ مسلمان اُٹھی "پروپیگنڈہ جنگ" کو شناخت نہیں کرسکے۔ پروپیگنڈے کی یہ جنگ توپ و تفنگ کی جنگ سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیوں کہ ہتھیاروں کی جنگ ہر جگہ نہیں کی جا سکتی۔ اور ہر شخص اس سے متاثر نہیں ہوتا، لیکن پروپیگنڈہ کے لئے کوئی سرحد اور کوئی دائرہ نہیں ہے، یہ بچے سے بڑے تک، مردوں سے عورتوں، اور دانش وروں سے جاہلوں تک ہر طبقہ کو متاثر کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی سے مغرب کی تیاری کی وجہ سے ہم اس موقف میں نہیں ہیں کہ ان پروپیگنڈوں کا مقابلہ انہی وسائل سے کریں جنہیں مغرب استعمال کر رہا ہے، کیوں کہ ذرائع ابلاغ پر پوری طرح مخالف اسلام لابی (Lobby) کا قبضہ ہے، عالم اسلام کا حال یہ ہے کہ ان کی کوئی مستقل عالمی نیوز ایجنسی بھی نہیں ہے، جو لوگوں تک صحیح خبر پہونچائے، اور مجہول خبروں کا پردہ فاش کرے، ہندوستان میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی انگریزی اخبار نہیں، نہ مسلمانوں کا ایک ٹی وی چینل ہے جس کی رسائی دوسری چینلوں کے مقابلہ کی ہو، اس غفلت کیشی، بے سرو سامانی اور وسائل و اسباب کے باب میں بے جا قناعت کے ساتھ ہم کیا مغرب کے اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کر سکیں گے؟

ہمارے لئے ایک ہی صورت ہے کہ ہم پروپیگنڈہ کا جواب عمل سے دیں! بے شک عمل کے جواب میں کچھ دیر لگتی ہے، لیکن اس کے اثرات گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں، پروپیگنڈہ کے ذریعہ بات جلد پھیلتی ہے، لیکن اس کا اثر دیر تک نہیں رہتا۔ مسلمان اپنے محلوں کے ساتھ غیر مسلم بھائیوں سے حسن سلوک اور حسن اخلاق کا رویہ اختیار کریں، یہ کوئی مصنوعی اور نمائشی عمل نہیں ہوگا بلکہ اسلامی احکام اور نبوی ہدایت کے عین مطابق ہوگا۔ سفر کے درمیان جن غیر مسلموں کا ساتھ ہو، ان سے نرم گفتگو کریں، ان کے ساتھ میں ایثار سے کام لیں، کوئی عورت، یا عمر رسیدہ شخص آجائے تو خود کھڑے ہو کر ان کو بٹھا

دیں، کسی کو پانی کی ضرورت ہو تو پانی پیش کریں، غیر مسلم فقرا کی اعانت کریں، محلہ میں کوئی غیر مسلم بیمار ہو تو اس کی عیادت کرلیں، غریب ہو تو علاج کے لئے کچھ پیسہ دے دیں، غیر مسلم بھائی کے یہاں شادی ہو، یا بچے کی ولادت ہو تو جاکر مبارک باد دیں، کسی کے یہاں انتقال ہو جائے تو تعزیت کریں، ہسپتالوں میں جاکر بیمار غیر مسلم بھائیوں کو پھل پیش کریں، آپ ڈاکٹر ہوں تو ان میں جو غریب لوگ ہوں، مفت ان کا علاج کردیں، تاجر ہوں تو غیر مسلم گاہکوں کے ساتھ اکرام سے پیش آئیں۔

اگر وہ اپنی نا سمجھی یا تعصب کی وجہ سے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے سوالات کرلیں تو بغیر اشتعال کے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ان کے سوال کا جواب دیں، اگر کسی مسلمان اور غیر مسلم کا معاملہ ہو تو مسلمان کی بے جا طرفداری نہ کریں، بلکہ جو بات عدل وانصاف کی ہو وہ کہیں، ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائیں، ان کے دیوی دیوتاؤں اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں نیچے گری ہوئی باتیں نہ کہیں، آپ کے پڑوس میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اپنی جان ومال کی طرح ان کی جان ومال اور اپنی عزت وآبرو کی طرح ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کریں۔

یہ ساری باتیں سیاست اور وقتی مصلحت کی نہیں ہیں، بلکہ ہمیں اللہ اور اس کے رسول نے ان باتوں کا حکم دیا ہے، اور یہ ایک مذہبی فریضہ ہے، جو ہم پر بحیثیت مسلمان عائد ہوتا ہے، اگر واقعی ہم دین کے ان احکام پر عمل کریں اور عملی زندگی میں اس کو ملحوظ رکھیں تو یہ عمل کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا جواب ہوگا، یہ جواب ان شاء اللہ اس پروپیگنڈہ سے زیادہ موثر اور دیرپا ہوگا، مکہ والے رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنی پروپیگنڈہ مہم کو تیز کئے ہوئے تھے، حج کا اجتماع، عکاظ کا تجارتی میلہ اور بازار ہر جگہ وہ پوری قوت سے اس مہم میں سرگرم تھے، ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ سے پہلے یہ مواقع حاصل نہیں تھے، لیکن مدینہ کی بستی کو آپ نے اخلاق ومحبت، مروت ورواداری اور انسانی شرافت کا گہوارہ بنادیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پروپیگنڈوں سے بدگمان رہتے، اور کسی مسلمان سے گفت وشنید بھی ملاقات ہوتی تو ان کے دل کی حالت بدلنے لگتی، مکہ سے ہجرت کرکے

آنے والے مسلمانوں کی تعداد تین سو کے آس پاس تھی، لیکن جب فتح مکہ کے موقع سے مسلمان فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد دس ہزار تھی، اور جاں نثاروں کے اس نورانی لشکر کو دیکھ کر اہل مکہ کی نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں، یہ کس چیز کا کرشمہ تھا؟ یہ وہی عمل اور حسن اخلاق کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا مقابلہ تھا، اس وقت یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم حسن عمل، حسن سلوک، حسن اخلاق اور حکمت و مصلحت کی تلوار سے اس جھوٹے پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں!

(... ...)

دعوتِ دین سب سے اہم فریضہ

عہدِ صحابہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک مسلمانوں کی تاریخ یہ رہی کہ جہاں وہ فاتحانہ داخل ہوتے وہاں صرف سیاسی غلبہ پر ہی نہیں اکتفا کرتے، بلکہ اپنے اخلاق و انسانیت دوستی اور دیانت داری کے ذریعہ مقامی لوگوں کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ دینی اور تہذیبی لحاظ سے بھی "اسلامی ملک" بن جاتا، ایران، یمن، مصر اور سندھ وغیرہ کے علاقہ میں یہی صورت پیش آئی، عرب تاجروں ہی کے ذریعہ مالدیپ، ملیشیا اور انڈونیشیا کے باشندوں نے اسلام قبول کیا، ہندوستان میں بھی محمد بن قاسم یہی کرنا چاہتے تھے، مگر بنو امیہ کی باہمی خصومت نے ان کو اس کا موقع نہ دیا اور ان کی بے مثال دانشمندانہ قابلیت و ہمت کا بدلہ ان کو "دار و رسن" کی صورت میں ملا۔

اس کے بعد ہندوستان کی زمامِ اقتدار عربوں کے بجائے عجمی خاندانوں کے ہاتھ چلی گئی، جن کو اپنی بادشاہی کے تحفظ کے سوا اسلام کی تبلیغ و اشاعت بلکہ اس کی اقامت و تنفیذ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان میں سے فیروز تغلق اور اورنگ زیب عالمگیر کو چھوڑ کر تمام بادشاہوں نے اپنی بہترین ذکاوت و صلاحیت اور غیر معمولی قابلیت و فراست کا استعمال محض اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے کیا اور اگر کچھ کام دعوت و تبلیغ کا ہوا بھی تو اس کا سہرا بڑی حد تک صوفیاء اور مشائخ کے سر ہے۔

لیکن دعوتِ دین سے غفلت اور اپنے ہی مفتوحہ ملک میں عددی تناسب کے لحاظ سے کم ہونے کے باعث بالآخر سیاسی اعتبار سے بھی ان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، اسپین میں عیسائیوں سے شکست کھانے کے بعد سوائے ان کی کچھ یادگار عمارتوں کے اور کوئی چیز باقی

تدریجی ہندوستان میں انگریزوں کے غلبہ کے بعد بڑا معجزہ ہوا ہے۔ یہ تو مشرق و مغرب کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی ہی ان کی قسمت میں آئی اور ملک کے تین چوتھائی حصہ میں ان لوگوں کا غلبہ رہا جن کو درحقیقت قدرت نے ایک دسترخوان کی طرح مسلمانوں کے سامنے بچھا دیا تھا، کہ وہ اپنی اخلاقی قوت کے ذریعے ان کو اسلام کے وجود میں ہضم کر لیں۔ مگر مسلمانوں نے اس "معنوی نعمت" کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی "مادی نعمت" کے ساتھ کیا تھا۔

لیکن انگریزوں کی تاریخ واضح طور پر اس سے مختلف ہے۔ سترہویں صدی میں جب ایک طویل عرصے کے بعد مغرب نے انگڑائی لی اور پہلے علم و صنعت میں اور پھر اپنی غیر معمولی سائنسی صلاحیت کے جلو میں سیاسی اعتبار سے آگے بڑھنا شروع کیا تو اس کے باوجود کہ ماضی قریب میں یورپ میں مذہب اور سیاست کے درمیان طویل زور آزمائی تک جنگ ہو چکی تھی اور "کلیسا" کو شکست دے کر مغربی اہل علم و نظر یہ سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے ایک بڑا معرکہ سر کر لیا ہے اور ناقابل تسخیر رکاوٹ کو مسخر کر لیا ہے۔ انھوں نے اس بات کو ضروری جانا کہ مشرق میں جہاں بھی فوجی اور سیاسی اعتبار سے ان کے قدم مضبوط ہوں وہاں عیسائیت کے مبلغین اور داعیوں کی ایک فوج بھی پیچھے پیچھے ان کے ساتھ رہے اور وہ لوگوں کے دل اور دماغ فتح کرنے کے لئے سرگرم رہے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ عیسائیت کو وسعت حاصل ہو سکے گی بلکہ ان کی حکومت اور سیاسی قوت کو بھی استحکام حاصل ہو سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیڑھ سو سال کے بعد مغرب کا سیاسی اقتدار تو ختم ہو گیا مگر عیسائی مشنری نے ان ممالک میں جن لوگوں کو عیسائی بنایا تھا وہ مقامی لوگ باقی رہے اور مشنریاں بھی اپنے کام میں مصروف رہیں۔

عیسائیوں کے اس حصے کا زیادہ نشانہ تو بت پرست قومیں ہی بنیں مگر "امت محمدیہ" بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکی اور مسلمانوں کی استقامت و ثابت قدمی اور دین کے معاملے میں عناد کے مقابلے میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے عیسائی اداروں نے عالمی سطح پر اجتماعی اور مذاکروں کے ذریعے اپنا طریقہ کار طے کیا اور منصوبہ بند اور منظم طور پر پورے

عالم اسلام میں نئی جدوجہد شروع کر دی، ان کے تحریکی اور تبلیغی مرکز سے ہندوستان سے مولوی صفدر علی، مولوی عماد الدین، مولوی برکت اللہ جیسے، مرزا ابراہیم اور ہیرات سے کاش جیسے لوگ ان کے دام میں گرفتار ہونے سے نہ بچ سکے۔

پاکستان جیسے مسلم ملک کے متعلق — جو اسلام اور مذہب کے معاملہ میں نسبتاً زیادہ حساس اور بیدار سمجھا جاتا ہے اور جس کی تاسیس ہی نعرۂ اسلام کے نام پر ہوئی ہے — بھی رومن کیتھولک چرچ نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں لکھا ہے:

"مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سب سے زیادہ شاندار کامیابی پاکستان میں حاصل ہوئی۔"

گو کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان مسلم ممالک میں بھی عیسائیت کو تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا بڑا سبب مسلمانوں کی جہالت اور ناواقفیت ہے، چنانچہ Ale Chatelier کا بیان ہے:

"عیسائی بننے والے مسلمانوں میں اکثریت عام لوگوں اور جاہلوں کی ہے۔"

یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد عقل و دانش سے دور ہیں اور مذہبی خوش گمانی اور غلو آمیز عقیدت کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو اس کو قبول کر سکے، خدا کے بارے میں تین (خدا، ابن خدا اور روح القدس) میں ایک اور ایک میں تین کا تصور کسی "لال بجھکڑ" سے کم نہیں ہے، حضرت مسیح ایک طرف خدائی کے منصب عظیم پر فائز نظر آتے ہیں، دوسری طرف اس قدر عاجز و درماندہ کہ صلیب پر نہایت ذلت کے ساتھ چڑھا دیئے جاتے ہیں اور ایک بے کس و بے بس انسان کی طرح خدا کے حضور جاں بخشی کے لئے فریاد کناں ہوتے ہیں۔ "کفارہ" کا عقیدہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کی غلطی اور ان کی وساطت سے نسل آدم میں منتقل ہونے والی غلطیوں کا کفارہ ادا کر دیا، ایک ایسی بات ہے جو صریح طور پر عقل کے خلاف ہے، کہ غلطی ایک کرے اور سزا ایک پائے اور یہ کہ غلطی حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور گنہگار ان تمام انسانوں کو سمجھا

جائے جو ان کی نسل سے پیدا ہوتے رہے، حالاں کہ ہر آدمی ارادہ اور عمل کے لحاظ سے اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے مقابلہ اسلام عقل و مصلحت کے عین مطابق ہے اور جوں جوں علم و فن کا ارتقاء ہوتا جاتا ہے، اسلام کی عصریت اور عقل و حکمت سے مطابقت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ مستشرقین ہر چند کہ اسلام کے معاملہ میں بہت متعصب اور تنگ نظر واقع ہوئے ہیں اور قرینہ ہائے دور دراز سے کبھی کبھی ایسی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی فہم و دانش پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے، تاہم اب ان میں بھی "موریس بوکائی" جیسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں، جو موجودہ سائنسی انکشافات کے لحاظ سے قرآن مجید کی واقعیت اور بائبل پر اس کے تفوق و برتری کا بانگ دہل اعلان کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ یہ بات اب قریب قریب پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ مذاہب عالم میں اسلام ہی واحد مذہب ہے، جو تفریق و امتیاز کی ساری دیواروں کو مٹا سکتا ہے اور پست طبقات کو دوسروں کا ہم قدم اور ہم دوش بنا سکتا ہے، ہندو سماج کا کہنا ہی کیا ہے، مغربی معاشرہ جو انسانی حقوق کے تحفظ کا سب سے بڑھ کر مدعی ہے، کالوں کو انسان کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔

ذرائع ابلاغ اور نظام مواصلات کو اس زمانے میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، شہنشاہیت کے بجائے اس عہد میں جمہوریت اور سیکولرزم کا غلبہ ہے، جو ہر شہری کو مذہب اور اظہار رائے کی آزادی عطا کرتی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی دعوت و تبلیغ کا حق دیتی ہے، ماضی میں شاہی حکومتوں اور مذہبی تعصبات کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

یہ سب کچھ گویا خالق کائنات کی طرف سے اب مسلمانوں کے لئے ایک بیش قیمت انعام ہے، جس سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں میں دعوت دین کا کام اس سے کہیں آسانی سے کیا جا سکتا ہے جن سے مسلمان عہد اول میں دوچار ہوئے۔ اسلام کی صداقت و راستی اور ضرورت اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اسلام کے دشمن اور بدخواہ سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی اپنا لب و لہجہ نرم کرنے پر مجبور ہیں اور اسلام کی بہت سی خوبیوں کا کھلے عام اعتراف

کرتے ہیں، جیسا تھا گاندھی جی جیسے ذہین، سنجیدہ اور تسلیم شدہ مذہبی و سیاسی ہندو قائد کا اہلِ وطن کو اپنے طرزِ حکومت میں "ابوبکر و عمرؓ" کے طریق کار کی تقلید کی ترغیب دینا، دوسرے لفظوں میں اسلام کی عہدِ حاضر کے لئے معنویت اور دوسرے مذاہب عالم کا زمانۂ اقتدار گذر جانے کا اعتراف ہے۔

خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی ان ساری سہولتوں کے باوجود مسلمان اگر "دعوت دین" کا کام نہ کریں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ قدرت ان کے بجائے کسی اور قوم کو خدا کے دین کی سربلندی اور اشاعت کے لئے اٹھائے گی، اس لئے کہ یہ اب اس کے اہل باقی نہیں رہ گئے۔ (محمد: ۳۸) افسوس کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر جگہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہیں، یہ دشمن کہیں استعمار و سرمایہ داری کی صورت میں ہیں، کہیں الحاد اور کمیونزم کے لباس میں، کہیں مذہبی تعصب اور تنگ نظری ہے، کہیں لسانی اور علاقائی مسائل ہیں، ہر جگہ احتجاج کے ذریعہ دشمنوں کا مقابلہ کیا جا رہا ہے، مگر کوئی نہیں جو اس "بے آواز لاٹھی" کا سہارا لے جو مقابلہ کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے اور پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ جس ہتھیار سے مدد لی تھی، جو دلوں کو فتح کر لے، جو لوہے کو موم کر دے اور جو جان لینے والوں کو جان نثار بنا دے۔

بہت سے علاقوں میں آج جو لوگ جہاد کی بات کرتے ہیں، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تلوار اور قوت کا استعمال جہاد کا آخری مرحلہ ہے، جسے مجبوری کے درجہ میں گوارا کیا جاتا ہے، جہاد کا پہلا مرحلہ جو اصل مقصود ہے۔ "دعوت" ہے، چنانچہ فقہاء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "دعوت" دینے کے بعد ہی غیر مسلموں سے جہاد کیا جا سکتا ہے یجب ان یبلغو المسلمون بالدعوة قبل القتال، یہاں تک کہ قاضی ابو الحسن ماوردی نے اسلام کے نظامِ مملکت پر اپنی فاضل و معروف تصنیف "الاحکام السلطانیہ" میں لکھا ہے کہ جن لوگوں تک دعوت نہ پہنچی ہو اور استدلالی اعتبار سے ان پر اسلام کی حقانیت واضح نہ کر دی گئی ہو، ان پر جہاد کا اقدام حرام ہے: یحرم علینا الاقدام علی قتالهم اور اگر اسلامی لشکر نے ان تک دین کی دعوت پہنچنے سے پہلے حملہ کر

دیا تو مسلمانوں کا قرآن بہانا ان کے ذمہ ہوگا۔ ضمیں دیانت مفو سمجھو۔

لیکن اس کے باوجود ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں کی بڑی بڑی تنظیموں اور تحریکوں کے باوجود شاذ و نادر تنظیمیں ہیں جو اس مقصد کو سرانجام دینے کے لئے آگے ہوں اور ہم وطنوں میں آخرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کر رہی ہوں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی غفلت کا یہ حال ہے کہ اب تک ہندوستان میں متعدد ایسی زبانیں ہیں جن میں تعارفِ اسلام کی کوئی مناسب کتاب اور قرآن مجید کا ترجمہ تک نہیں، متعدد ایسی زبانیں ہیں جن کو مسلمانوں کی قابلِ لحاظ تعداد بولتی ہے، مثلاً تلگو، تمل، بنگلہ، اڑیا وغیرہ، مگر ان زبانوں میں اسلام سے متعلق جو لٹریچر ہے وہ کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے نہایت معمولی ہے، خود ہندی میں بھی، جو ملک کی اول درجہ کی قومی زبان ہے، اسلام سے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے والی کتابیں انتہائی ناکافی ہیں، اور ان علاقائی زبانوں میں اسلامیات کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ طرزِ اسلوب اور تفہیمات کے لحاظ سے وہ غیر مفید اور غیر مؤثر بھی ہے، ان زبانوں میں اگر ہم ارکانِ اسلام سے متعلق مسائل جمع کر دیں اور اس طرح کے کام کریں تو یہ مسلمانوں کے لئے تو مفید ہوگا مگر غیر مسلموں کے لئے اس میں کشش کا کوئی سامان اور غور و تدبر کی کوئی چیز نہ ہوگی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ، احادیثِ نبوی ﷺ کا عمدہ اور مؤثر انتخاب اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سادہ انداز میں سیرت پیش کی جائے، جس میں آپ ﷺ کے اخلاقی پہلو کو زیادہ نمایاں کیا جائے، اسلام کے عقائد اور اس کی معقولیت اور جدید انکشافات کی روشنی میں اس کی صداقت اور واقعیت کو نمایاں کیا جائے، اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصول، ان کا توازن اور ان کی افادیت کو واضح کیا جائے، دوسرے مذاہب اور جدید نظریہ ہائے حیات سے اسلام کا سنجیدہ تقابل کرایا جائے اور ایسی تحریروں میں معروضی اور مثبت اسلوب اختیار کیا جائے، مناظرانہ، جارحانہ اور منفی طرزِ تعبیر سے بچا جائے۔

اسلام سے متعلق پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقہ کی معلومات بھی کس قدر کم ہیں؟ اس

وقت اس کا اندازہ ہوتا ہے جب اسلامی زندگی کا کوئی پہلو قومی سطح پر زیر بحث آتا ہے اور غیر مسلم دانشور اور صحافی نے اہل قلم اس پر کچھ لکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس "غلط بیانی" کا پورا پورا قصور صرف انہی کے "زورِ قلم" میں ڈال دیتے ہیں، حالانکہ درحقیقت اس غلطی میں بڑا حصہ خود ان کی غفلت کا ہے کہ انہوں نے اب تک ملکی اور قومی زبانوں میں اسلام سے متعلق معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم نہیں کیا جس سے استفادہ کر کے غیر مسلم اہل قلم اسلام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس کی بے غبار ترجمانی کر سکیں۔

زبان سمجھنے اور سمجھانے کا محض ایک ذریعہ ہے، زبان بجائے خود مقصود نہیں ہوتی، نہ زبان کا کوئی مذہب اور عقیدہ ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے زبان کے معاملے میں فراخ دلی اور وسیع النظری سے کام لیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت ؓ کو خاص طور پر عبرانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے صرف پندرہ دنوں میں عبرانی سیکھ لی، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید چھ زبانوں سے واقف تھے، روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ ؓ نے فارسی زبان سیکھ لی تھی اور وہ اس سے آگاہ تھے۔

فارسی کوئی اسلامی زبان نہیں تھی، بلکہ مشرک، بت پرست اور آتش پرست اقوام کی زبان تھی اور فارسی میں اب بھی کثرت سے ایسی تعبیرات و تشبیہات موجود ہیں جن کی جڑیں شرک سے ملتی ہیں، لیکن جب اسلام ایران میں داخل ہوا تو مسلمانوں نے اسلام کی دعوت و اشاعت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی سیکھی اور اس میں اس درجہ مہارت حاصل کی کہ تحریر کے اپنے مستقل اسلوب اور طرز نگارش کی بنیاد رکھی، فارسی کی زبان میں ایسے ایسے نئے محاورات، ضرب الامثال اور تشبیہیں وضع کیں جو اسلام کے مزاج و مذاق سے مطابقت رکھتی تھیں اور اس زبان میں اس قدر لکھا اور اسلام کے مختلف علوم و فنون پر کام کیا کہ رفتہ رفتہ فارسی ایک اسلامی زبان بن گئی اور اسلام فارسی زبان پر اس طرح چھا گیا کہ آج اسلام کو الگ کر کے فارسی ادب اور شاعری کا تصور بھی دشوار ہے۔

لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اب بھی دینداروں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو عربی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو اچھوت اور بے برکت سمجھا ہوا ہے اور صرف اردو

زبان میں تھوڑا سا فاصلہ مگر نتیجہ تلخ اور طویل ہے کہ اس نے اسلامی دعوت کو کمزور کر دیا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام اس وقت کیا جانا چاہئے جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہو جائے اور خود مسلمانوں کا معاشرہ ایک مکمل اسلامی معاشرہ بن جائے، یہ دراصل شدید غلط فہمی اور اپنی ذمہ داری سے گریز ہے، اسلام نے کوئی ترتیب قائم نہیں کی ہے کہ غیر مسلموں کو دعوت دینے کی ذمہ داری اسی وقت مسلمانوں پر عائد ہوگی جب خود ان کا پورا معاشرہ اسلامی ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ایک ساتھ دونوں کام انجام دیئے ہیں اور قرآن معاشرتی اور تمدنی احکام کی تکمیل سے پہلے ہی سے غیر مسلموں کو اپنی دعوت کا اولین مخاطب بناتا رہا ہے، عہد رسالت میں بیک وقت مسلمانوں کی تربیت و تعلیم کے لئے بھی اہل علم صحابہ کو بھیجا جاتا تھا اور غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کے لئے بھی وفود و جماعتیں روانہ کئے جاتے تھے۔

مسلم معاشرہ کو اسلامی بنانے کے بعد غیر مسلموں کو دعوتِ دین کا مخاطب بنانے کا مطلب شاید اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ پوری توانائی صرف مسلمانوں کی اصلاح پر صرف کر دی جائے اور اسی پر قناعت کر لی جائے، اس لئے کہ مسلمانوں کو مکمل اسلام پر لانا کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانے سے زیادہ دشوار ہے، کیوں کہ اسلام خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ثنائی حقیقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے اور یہ اصحاب ضمیر کے لئے آسان ہے، جب کہ مسلمانوں کے اندر حقیقی اسلام پیدا کرنا اپنے نفس کی مکمل پیروی سے عبارت ہے اور یہ آسان نہیں ہے۔

اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں شرعاً خود ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو سیکھیں، ان کے اندر دین کی طلب ہو اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ ہو، اور اگر وہ سب جان بوجھ کر بھی اپنی کوتاہی میں مبتلا رہیں تو عنداللہ خود ہی جواب دہ ہیں، اس کے برخلاف جن تک اسلام پہنچایا نہیں گیا، ان کے متعلق مسلمان ذمہ دار ہیں اور عنداللہ مسئول ہیں کہ انہوں نے خدا کا دین ان تک پہنچانے سے تغافل کیوں برتا؟

افسوس کہ اتنی اہم ذمہ داری جس کے لئے امت محمدیہ پیدا کی گئی (آل عمران: ۱۱۰) جو خدا کی نصرت و مدد کا ہتھیار اور مسلمانوں کی کامیابی کا باعث ہے، جو جہاد کا نقطۂ آغاز ہے، جو انبیاء کی بعثت کا مقصود ہے اور جس سے گریز انسانیت کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی اور خدا کے دین کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہے، جو اسلام کے پیغام کو آفاقی اور اس کے نبی عربی ﷺ کی رحمت کو عام و تام کرتا ہے اور جو خود مسلمانوں کے لئے خدا کی طرف سے حفاظت و سلامتی کی کلید ہے، کی طرف سے صف اسلام بے حد غافل ہے۔

پھر کیا کچھ دل ہیں جو اس فریضۂ نبوت کی ادائے گی سے غفلت پر لرز اٹھیں اور کیا کچھ خریداران آخرت ہیں جو سیاسی شہرت سے دور گوشۂ گمنامی میں رہ کر اسلام کا شجرۂ طوبیٰ لگانے پر آمادہ ہوں؟

(۲۰/۹/۲۰۰۱ء)

ایک اہم فریضہ جس سے ہم غافل ہیں!

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیشہ دنیا میں دو طبقے موجود رہے ہیں، ایک ان لوگوں کا جنہوں نے کسی نہ کسی ذریعے سے یا تو حکومت حاصل کر لی ہے، دوسرے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ طبقہ جو ان کے استحصال کا شکار رہا ہے۔ اس دوسرے طبقہ کو قرآن نے ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے۔ (النساء: ۷۵) قرآن نے مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ وہ ان کمزور اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو نجات دلانے کے لئے جہاد کیوں نہیں کرتے، جو دعا میں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نجات عطا فرمایئے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے حامی اور مددگار عطا فرمایئے۔'' (النساء: ۷۵)

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ایک حد تک انہوں نے اپنے اس فریضہ کو نبھایا اور نچلے طبقوں کو برہمنوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی، اسی کا نتیجہ ہوا کہ اس ملک کے پسماندہ طبقوں میں سے ایک بڑے گروہ نے ان کو ابر رحمت سمجھا اور ان کا خیر مقدم کیا، وہ اس ملک کی اکثریت کے نگاہوں کا نور اور دلوں کا سرور بنے رہے، لیکن افسوس کہ مسلمان زیادہ دنوں تک اپنے اس کردار پر قائم نہ رہ سکے اور کسی عرصہ میں وہ دعوتی مزاج سے محروم ہو گیا، بادشاہ اور بعض حضرات بھی عام لوگوں کی طرح برادران وطن کے مسائل اور احوال سے بے تعلق ہو کر رہ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب کوئی مذہب نہیں ہے، اور مختلف قوموں کا جو مجموعہ ہندو کے نام پر اکٹھا ہو گیا ہے، اس میں معمولی درجہ کی فکری وحدت بھی موجود نہیں ہے۔ ہندو قوم متضاد تصورات کا مجموعہ ہے، برہمن، دلت، ناگا اور دیگر ذاتوں کے درمیان جو فاصلے ہیں، بعض مصلحین نے ان کو پاٹنے کی بہت جدوجہد کی، لیکن یوں کہ طبقاتی

تقسیم کا تصور محض ایک مادی ، روایتی [illegible] نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد فکر و عقیدہ میں پیوست ہیں اس لئے اس کی صداقت [illegible] ہو سکے [illegible] [illegible] نہیں۔ آج کے جمہوری دور میں اور [illegible] کی [illegible] سے [illegible] جمہوریت کے [illegible] نے [illegible] یہ اعلان کر رکھے ہیں کہ "[illegible]" اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ [illegible] کے بارے میں [illegible] سے [illegible] شدید نفرت پائی جاتی ہے۔

اس نفرت کا نتیجہ ہے کہ [illegible] باری کا [illegible] [illegible] قصیدہ [illegible] انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں [illegible] کے [illegible] کو [illegible] قائم رکھا ہے۔ ۱۹۸۹ء تک دیوانِ [illegible] میں شعر قصیدہ [illegible] کا تناسب کیا تھا؟ [illegible] اور معیشت کے اہم مواقع پر [illegible] کا کیا تناسب تھا؟ اس کا اندازہ صرف [illegible] اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے

(۱)	[illegible]	۴۸	قصیدہ برزمین
(۲)	[illegible]	۴۹	قصیدہ برزمین
(۳)	گورنر [illegible] لیفٹیننٹ جنرل	۵۰	قصیدہ برزمین
(۴)	لیفٹیننٹ جنرل [illegible] سیکرٹری	۵۲	قصیدہ
(۵)	[illegible] کا [illegible] سیکرٹری	۵۳	قصیدہ برزمین
(۶)	[illegible] کے چیف سیکرٹری	۵۴	قصیدہ برزمین
(۷)	وزارت کے [illegible] سیکرٹری	۶۰	قصیدہ برزمین
(۸)	جوائنٹ [illegible] سیکرٹری	۶۲	قصیدہ برزمین
(۹)	[illegible] کے [illegible]	۵۱	قصیدہ برزمین
(۱۰)	سپریم کورٹ کے جج	۵۶	قصیدہ برزمین
(۱۱)	ہائی کورٹ کے چیف جسٹس	۵۰	قصیدہ
(۱۲)	[illegible]	[illegible]	قصیدہ برزمین

(۳) پبلک سیکٹر اداروں کے سربراہان۔

(الف)	مرکزی	۴۷	فیصد برہمن
(ب)	ریاستی	۸۲	فیصد برہمن
(ت)	بینک	۵۷	فیصد برہمن
(د)	ایرلائنس	۶۲	فیصد برہمن
(ہ)	آئی اے ایس افسران	۷۲	فیصد برہمن
(و)	آئی پی ایس افسران	۶۱	فیصد برہمن
(ز)	ریڈیو۔ ٹی وی	۸۳	فیصد برہمن
(ح)	سی بی آئی۔ کسٹم اینڈ ایکسائز	۷۳	فیصد برہمن

(دی آف دی ریلیف، ۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی حیثیت اقتدار کے ملنے جیسی کی ہے اور ادھر چند انتخابات سے بی جے پی کی شخصیتوں اور جماعتوں کو ذہنی انقلاب کے دور میں لانے میں اس نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، وہ محتاج اظہار نہیں۔ اس اہم ترین وسیلہ طاقت پر بھی برہمنوں کا قبضہ ہے۔ "انڈین ایکسپریس" کے عملے میں ۴۲ فیصد "ہندو" کے عملے کے ۹۰ فیصد اور "ٹائمز آف انڈیا" کے عملے میں ۷۴ فیصد برہمن ہیں۔ ملک کے ان تین بڑے اخبارات سے دوسرے اخبارات و رسائل کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جدید مذہبی کتابوں کے مطابق شری رام جی نے شمبوک کو اس لئے قتل کیا کہ وہ شودر ہونے کے باوجود معرفت کا علم حاصل کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخصیتیں کسی مذہب اور اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے آئیڈیل ہوں، جب انہی کے عمل سے نفرت کا یہ پیغام موجود ہو تو اس قوم میں ایک طبقے کے استحصال کا جذبہ کیوں نہ پیدا ہوگا۔ نچلی ذاتوں کے لوگوں کو طویل عرصے سے اقتدار سے محروم رکھنے اور غلام بنا کر رکھنے کی وجہ سے خود ان میں بھی خوف نفسیاتی پیدا ہو گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ وہ ان کو اختلاف و انتشار کا شکار بنا کر رکھتی ہیں اور خود ان کا نام اتفاق ہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے

پچاس سال کا عرصہ گزر چکا، ملک کی آزادی سے پہلے ہی برہمن فکر نے آر۔ایس۔ایس کی بنیاد رکھی، جس نے طویل المدت منصوبے بنائے اور بالآخر وہ بام اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اقتدار کو انہوں نے صرف کسب مال کا وسیلہ نہیں بنایا، بلکہ اپنی اصولی فکر اور مذموم عزائم کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے نئی منصوبہ بندی کی ہے اور سبک خرامی کے ساتھ غیر محسوس طریقہ پر وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

مسلمانوں نے حکومت و اقتدار کا ایک طویل عہد پایا، اگر وہ اس مدت میں ناانصافی کو مٹانے اور ہزاروں سال کے ستم رسیدہ انسانوں کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتے تو آخرت میں تو اجر پاتے ہی، دنیا میں بھی اس طویل و عریض علاقہ کے تاج دار ہوتے۔ بالآخر ہم نے اپنی غفلت کی سزا پائی اور جو لوگ تخت اقتدار کی زینت تھے، وہ تختہ دار کی زینت بنے، ملک آزاد ہوا اور تقسیم ملک کی وجہ سے ایک طوفان تھا جو سب کے سر سے گزر گیا، لیکن جمہوری نظام کے تحت ہم اس ملک کے اقتدار میں حصہ دار تھے، ہمیں اپنی قوم کو سنبھالنے اور دوسرے بھائیوں تک اللہ کا دین پہنچانے کے وسیع مواقع حاصل تھے، یہ وقت تھا کہ مسلمان اس ملک کے مستضعفین کو اپنے ساتھ لیتے، ان کی یاوری کرتے، ان کو ظلم کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کرتے اور ان کے دکھ درد کو بانٹنے کی کوشش کرتے، اس سے دوہرے فوائد حاصل ہوتے، ایک طرف اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ کھلتی اور وہ کام انجام پاتا جس کام کے لئے یہ امت مبعوث ہوئی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی اعتبار سے طاقت حاصل ہوتی، اگر وہ بادشاہ نہ ہوتے تو بادشاہ گر ہوتے، اس ملک میں کوئی فیصلہ شاید ان کی مرضی اور منشا کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن افسوس کہ ہم نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ ہم نے بھی ان کو اچھوت اور ناستیت کا ایک گرا ہوا طبقہ تصور کیا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا نہ کوئی سیاسی وزن ہے اور نہ ملکی نظام نہ تعلیم میں ان کی حیثیت نمایاں ہے اور نہ معیشت میں، مسلمانوں کو دہشت گرد، انتہا پسند اور بنیاد پرست مشہور کر کے اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے کہ وہ ایک قابل نفرت قوم بن گئے ہیں،

لیکن ان سے خوف کھاتے ہیں۔ جب تک نہیں کہ ظلم حدود میں آئیں اس سے اپنے بچوں کو زوال بھی ہوں۔ پچھلی ذاتوں کی جو قیادتیں ادھر چند سالوں میں ابھری ہیں۔ برہمنوں نے یا تو انہیں اپنا ہم نام کر دیا ہے کہ وہ بے اثر ہیں یا ان کے درمیان اتنا انتشار برپا کر دیا ہے کہ وہ بکھر کے رہ گئے ہیں اور جب کوئی طاقت بکھر جاتی ہے تو اس کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور اپنا آلۂ کار بنا کر رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ لالو پرساد یادو، کانشی رام، ملائم سنگھ اور رام ولاس پاسوان وغیرہ اس کی واضح مثال ہے۔

آج بھی مسلمانوں کے لئے صحیح راہ یہی ہے کہ پوری نیک نیتی کے ساتھ دبے کچلے لوگوں کو اپنے ساتھ لیں، ان کو ظلم سے نجات دلانے کی جد و جہد کریں اور سیاسی مفادات اور اقتدار کی حرص کرنے کے بجائے اس تعلق کو اسلام کی اشاعت وحفاظت کے لئے استعمال کریں۔ اس کے بغیر ہمارے لئے اس ملک میں اپنے ملی وجود کو باقی رکھنا شاید دشوار ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو انصار یہودیوں کے استحصال کا شکار تھے، مسلمانوں کا قافلہ جب روم کی سرزمین میں پہنچا تو وہاں کی عوام نے خیر مقدم کی، جب اہل ایمان کا کارواں ایران پہنچا تو اس نے یہی کہا کہ ہم تم کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرنے آئے ہیں، جب بادشاہ کے تاج کی قیمت لاکھوں ڈالر ہوتی تھی اور غریب کسان گراں بار ٹیکسوں کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلات کی پناہ لینے پر مجبور تھے، ان حالات میں مسلمان ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے ان ملکوں میں پہنچے اور انہوں نے بے جان زمینوں پر قبضہ کرنے سے زیادہ دلوں کے قلوب کو فتح کرنے کی کوشش کی۔

مسلمانوں کے لیے اس ملک میں باعزت زندگی کی راہ یہی ہے کہ وہ ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئیں اور نقش دیوار پڑھ کر اپنے لیے ایک ایسا منصوبہ بنائیں جو دیر سے ہی لیکن منزل مقصود کو پہنچاتا ہو اور محض فوری اور وقتی مفادات پیش نظر نہ ہوں۔

مسلمانانِ ہند کا ایک اہم فریضہ

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء جب بھی کسی قوم میں آئے تو عام طور پر ان کو سابقہ دو طبقوں سے پیش آیا، ایک "ملأ قوم" یعنی قوم کے سربرآوردہ لوگ، جن کو باعزت اور بلند مرتبہ سمجھا جاتا، دوسرے وہ لوگ جن کو قرآن نے "اراذل قوم" یا "مستضعفین" سے تعبیر کیا ہے، یعنی قوم کے معمولی اور غریب لوگ جن کو سماج میں بے وزن اور کم حیثیت خیال کیا جاتا ہے، پیغمبر کی دعوت اپنی قوم میں ایک انقلابی دعوت کی حیثیت سے ابھرتی ہے، قوم کے سربرآوردہ لوگ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، البتہ ان میں جو لوگ حقیقت پسند اور نیک نفس ہوتے وہ بھی ذاتی قربانی کرکے اس کی دعوت پر لبیک کہتے، لیکن عام طور پر ان کی تعداد بہت کم ہوتی، جو لوگ معمولی سمجھے جاتے ان کو دعوت حق قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہوتی، وہ قبول کرتے اور پھر ظلم و جبر کی چکی میں پیسے بھی جاتے، غالباً یہ بھی نظام الٰہی کے تحت ہوتا تھا کہ چونکہ وہ پہلے سے مظلوم و ستم رسیدہ ہوتے اس لئے ان کے لئے ظلم و زیادتی اور تحقیر و تمسخر کا رد عمل کسی درجہ میں قابل تحمل ہوتا۔

دعوت حق کو قبول کرنے میں سرداران قوم دراصل بڑی رکاوٹ بنتے ہیں، اہل مکہ نے آپ ﷺ کی کس قدر مخالفت کی، اس لئے نظام الٰہی کے تحت غزوۂ بدر میں تمام سرداران مکہ جمع کر دیئے گئے، اور وہ سب بدر میں جاکر ہلاک ہوگئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے صحیح فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دیئے ہیں، بدر کے بعد اب مکہ کے دو ہی قابل ذکر سردار باقی رہ گئے، ابو سفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ، اور ان دونوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس کے بعد ہی اسلام کی اشاعت آسانی کے ساتھ اور تیز رفتاری سے ہونے لگی، یہی بات تھی جس کی طرف

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کی ہجرت سے پہلے اوس و خزرج کی خانہ جنگی میں عبداللہ بن ابی کے علاوہ عرب اوس کے تمام قائدین قتل ہو چکے تھے، اس لئے یہاں اسلام کے خلاف مزاحمت کرنے والی کوئی منظم طاقت موجود نہیں تھی، عبداللہ بن ابی نے اپنے اندرونی نفاق کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن انصار مدینہ پر نئے ایمانی جذبہ کا چڑھا ہوا تھا کہ وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، گویا خدا کے تکوینی نظام کے تحت ہجرت نبوی سے پہلے ہی سرداران مدینہ رخصت ہو چکے تھے اور مدینہ کی سرزمین اسلام کے لئے نرم و ہموار ہو چکی تھی۔

یہی صورت حال مختلف انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا تو نچلے طبقات ان کی دعوت پر ایمان لایا، جو لوگ ان کے مخالف تھے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں، حالانکہ نیچ لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں۔ قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون (الشعراء ۱۱۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے "ارذلون" کا ترجمہ "کمینے" سے کیا ہے، اس تعبیر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ اس طبقہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، قرآن نے ایک اور مقام پر قوم نوح کی اس تمسخر آمیز گفتگو کا ذکر کیا ہے کہ سرداران قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو تو آپ ہم ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہیں، اور آپ کی اتباع ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں نیچ لوگ ہیں، وما نریٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا (ہود ۲۷)

ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس میں بھی لوگوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ قوم بنا رکھا ہے، اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بٹھا دیا ہے کہ وہ فرمانروائی اور حکمرانی ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، کیوں کہ ان کی پیدائش خدا کے سر اور بازو سے ہوئی ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان واسطہ ہیں، ایک بہت بڑی قوم کو انہوں نے پیدائشی غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ وہ نیچ اور کمتر ہیں، اور دوسروں کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پہلا طبقہ برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کا ہے جن کا عددی تناسب بہت معمولی ہے، لیکن وہ ملک میں ۸۵ فیصد کلیدی عہدوں پر قابض ہیں، اور

اقتدار کے در و بام پر ان کا ایسا قبضہ ہے کہ کوئی پتہ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر حرکت نہیں کر پاتا، یہی قرآن کی اصطلاح میں اس ملک کے ملأ قوم ہیں، جن کا عمومی مزاج یہی ہے کہ جب تک حالات کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جائیں عدل و انصاف اور سچائی کے سامنے سر خمیدہ نہیں ہوتے۔

دوسرا طبقہ "دلت" کا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں "اراذل قوم" کی تعبیر آئی ہے کہ لوگ انہیں نیچ، گنوار اور کمتر خیال کیا کرتے تھے، ہندوستان میں یہ قوم ہزاروں سال سے ظلم و جور کی چکی میں پستی جا رہی ہے اور انتہائی غیر انسانی رویہ کا شکار ہے، اب جب کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت کسی قدر ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے، انہیں تحفظات دیئے جا رہے ہیں، الیکشن کے موقع پر انہیں منانے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر بھی سماجی زندگی میں وہ ایک باعزت قوم کا مقام حاصل کرنے میں ناکام ہیں، اگر وہ گھڑے کو ہاتھ لگا دیں تو اس پانی کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ کسی برہمن کے دوش بدوش بیٹھ کر کھا نہیں سکتے، اس ملک میں اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت رکھنے کے باوجود جگ جیون رام ملک کے وزیر اعظم نہیں بن سکے، کیوں کہ وہ اچھوت قوم سے تعلق رکھتے تھے، ہندو قوم میں عقیدہ کے درجہ میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ لوگ خدا کے پاؤں سے پیدا کئے گئے ہیں، اور ان کا کام ہی اونچی ذات کے لوگوں کی خدمت ہے، اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوں کہ آپ بہت ہی حقیر اور نیچ ہیں، اس لئے میں آپ کو فلاں سہولت دے رہا ہوں، تو بتائیے کہ یہ بجائے خود کس درجہ رسوا کن اور ذلت آمیز بات ہے!

جو لوگ مظلوم و دبے کچلے اور دبائے ہوئے ہوں ان کی مدد کرنا مسلمانوں کے لئے صرف سیاسی مصلحت نہیں بلکہ دینی اور ملی فریضہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے واسطے نہیں لڑتے جو مغلوب ہیں مرد، عورتیں اور بچے (النساء: ۷۵)

قرآن نے یہاں مظلوموں کے لئے "مستضعفین" کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو دبایا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ دلت بھی اس ملک کے "مستضعفین" ہیں تو [illegible]

سے بچا جاتا ہو۔ اس کے لئے ان کو ساتھ لینا اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور ان کو مخالفت سے باز رکھنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس اہم دینی کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی۔ بلکہ مختلف اسباب کی بنا پر ان سے دوری سے بڑھ کر ان کے ساتھ منافرت کا رویہ اختیار کیا۔ بلکہ ہم نے خود اپنی قوم میں بھی مختلف دیواریں کھڑی کر لیں۔ بعض اوقات یہ دیواریں اتنی اونچی ہو جاتی ہیں کہ پار کا کوئی نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال نے ہمیں دوہرا نقصان پہنچایا ہے۔ ایک تو اس ملک میں دعوت اسلام کا کام نہ ہونے کے درجہ میں ہے۔ اگر ہم ان طبقوں سے قریب ہوتے تو دعوت کے وسیع مواقع پیدا ہو سکتے تھے۔ ہر قوم میں دعوت حق کی فطری ترتیب یہی رہی ہے کہ پہلے اس کے مستضعفین نے اس پر لبیک کہا ہے۔ پھر جب ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا تو آخر جو طبقہ انہیں نیچ کرتا تھا اس کے لئے بھی حلقۂ اسلام میں آنے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ پہلے مکہ کے غلاموں نے اسلام قبول کیا۔ پھر اہل مدینہ نے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اہل مکہ بھی اسلام لانے پر مجبور ہو گئے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت ہے۔ یعنی خدا ایک ہے اور تمام انسانیت ایک ہے۔ کالے، گورے، عرب، عجمی کوئی فرق نہیں۔ ایک ہی مسجد میں سب خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ جو شخص دین سے زیادہ واقف اور عمل کے اعتبار سے زیادہ صاحب تقویٰ ہو وہ نماز میں امام ہوگا، خواہ کسی خاندان کا ہو اور اس کی چمڑی کا رنگ کیسا بھی ہو۔ انسانوں کا کوئی طبقہ خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ نہیں۔ ہر انسان براہِ راست خدا سے مانگتا اور خدا سے پاتا ہے۔ یہ انسانی مساوات کا تصور اتنا فطری اور اتنا انصاف پر مبنی ہے کہ جن قوموں کو نیچ سمجھا جاتا ہے وہ اس کو اپنے لئے بہت بڑی رحمت محسوس کرتی ہیں۔ اگر اسلام کے اس عظیم اصولِ زندگی کو ان محروم و مظلوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوں، اور اس رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کریں۔ مگر افسوس، اور صد ہزار افسوس کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس سے دوسرا نقصان سیاسی ہوا، آج سیاسی اقتدار سے محروم ہو چکے ہیں، ہماری آبادی کے تناسب اور قومی اداروں میں ہماری تعداد کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اگر مسلمان اس طبقہ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو جائے، جن کی تعداد ملک میں ساتھ، پچیس تیس فیصد سے کم نہیں، تو آج یہ بادشاہ نہیں ہوتے تو بادشاہ گر ضرور ہوتے، جو لوگ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کراتے ہیں اور فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ دلت بھائیوں کو اپنا ہتھیار اور آلۂ کار بناتے ہیں، اگر ہم انہیں قریب کر لیں، تو ہم ان کے ہاتھ سے ان کے ہتھیار چھیننے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

وقت بھی کیا تجسس ہے اور ہمیں اس پہلو پر پوری گہرائی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں ایک منصوبہ کے ساتھ اس طبقہ کو قریب کرنا چاہئے، مسلمان قائدین اور سیاسی تنظیموں کو چاہئے کہ دلت سیاسی وسماجی قائدین کے ساتھ تبادلۂ خیال کریں، انہیں قریب کریں، اور ان کی ذہن سازی کریں، یوپی کے حالیہ الیکشن میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا، گو بعض سیاسی لیڈروں کی مفاد پرستی اور اقتدار کی بڑھتی ہوئی حرص کی وجہ سے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکا، لیکن اس کے باوجود یہ ضرور ہے کہ بی جے پی کو سخت صدمہ پہونچا، اور اس کی وجہ سے پورے ملک میں اس کی ساکھ متاثر ہوئی، اس لئے مسلمان قائدین کو اعلیٰ سطح پر دلت قائدین سے ربط قائم کرنا چاہئے، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے!

سماجی سطح پر بھی دلت طبقہ سے رابطہ استوار کرنا ضروری ہے، مسلمان خوشی وغم کے مواقع پر ایسی تقریب رکھیں، جن میں انہیں مدعو کریں، شادی بیاہ کے موقع پر انہیں تحفے دیں، مسلمانوں کے زیر انتظام اسکولوں میں انہیں داخلے دیا کریں، اور جو ممکن ہو ان کے ساتھ رعایت کریں، دعوتوں میں ان کے ساتھ کھائیں پئیں، ان کو بھائی، بہن، چچا، خالہ کہہ کر مخاطب کریں، ایسے الفاظ کے ساتھ ان سے خطاب نہ کریں، یا ان کا ذکر نہ کریں جن سے تذلیل وتحقیر کی بو آتی ہو، موقع بموقع اسلام کی مساوات کی تعلیم کو ان کے سامنے رکھیں، اگر ہم اپنے رویہ کو ان کے ساتھ درست کر لیں، تو ان شاء اللہ وہ جلد اور بہت آسانی

بخشا تھا آپ کی طرف راغب ہو جاتے تھے۔ ایک ایسی قوم جو انسانی تمدن سے بے خبر تھی ہونے کے
لئے جدا جدا مرتبہ ہے۔ اس سے تھوڑی سی محبت بھی دل میں پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے
ضرورت ہے کہ ہم اس معاملہ کی اہمیت کو محسوس کریں اور ایک عمرانی پہلو کی طرح توجہ دیں۔ یہ
کافی نہیں اور انکی محبت کی معرفت دل میں اس قدر ہو کہ جان و مال کی محبت سے بڑھ کر
آپ کا تعلق سب سے زیادہ ہو کہ حقیقت میں ہے اور سب سے بڑھ کر اس سے وہ محبت کے نتائج
مرتب و حاصل ہو سکتے ہیں۔

کاش ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا!

اخبارات کی ایک خبر یقیناً پڑھنے والوں نے حیرت کی آنکھوں پڑھا ہوگا اور چشمِ تعجب سے اسے دیکھا ہوگا، اور وہ خبر ہے ایک ایسے شخص کے ایمان لانے کی جو نہ صرف بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھا بلکہ مسجد شہید کرنے والے مجرمین کی قیادت کر رہا تھا، آپ بھی اس خبر کو ایک مقامی اخبار کی زبان میں پڑھیں:

> ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو جب ایودھیا میں بابری مسجد کو شہید کیا گیا تو اس گھناؤنے کام میں شیو سینکوں کی ٹولی پیش پیش تھی اور اس ٹولی نے مسجد کے گنبدوں پر چڑھ چڑھ کر انہیں شہید کیا تھا، شیو پرساد نامی ایک نوجوان جو کہ فیض آباد میں رہتا تھا، بجرنگ دل کی اس ٹولی کا سرغنہ تھا جسے مسجد کی شہادت کے کام کی نگرانی سونپی گئی تھی اور اس نے اس مقصد کے لئے ۴ ہزار والینٹروں کو تربیت دی تھی، اس دن مسجد کے عالیشان میناروں کو دیکھ کر شیو پرساد نے "رام رام" کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن ۷ سال بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی اس شرمناک حرکت کے لئے معافی کا طلبگار ہے، ۷ سال بعد ۶ دسمبر ۱۹۹۹ء کو شیو پرساد بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی میں اپنی شمولیت پر نادم و شرمسار ہے اور اس نے اسلام قبول کرلیا ہے، شیو پرساد کا نیا اسلامی نام "محمد مصطفی" ہے۔ "عالم نیوز" کے ۷ دسمبر ۹۹ء کے شمارے میں شائع کردہ ایک خبر کے مطابق شیو پرساد کا باپ ٹی راما تھن سنگھ پریوار کے اہم کارکنوں میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کا پورا خاندان بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھا۔ مسجد کی شہادت کے فوری بعد سے

تھی شیو پرساد کو شدید بے چینی اور ضمیر کی خلش کا احساس ہونے لگا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں وہ شارجہ چلا گیا تین سال ملازمت میں بھی اس کا ذہن منتشر رہتا تھا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۸ء کو جب کہ وہ شارجہ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا، اس نے جمعہ کے دن ایک مسجد میں ہونے والے وعظ کے الفاظ سنے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کی تقریر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغام نے اس کے دل میں انقلاب برپا کر دیا اور جب اس نے مسلسل وعظ سننے شروع کیے تو اس کے دل کی کایا پلٹ ہوگئی۔ الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے اسے راہِ راست دکھا دی اور اس نے گمراہی کو ترک کر کے سیدھا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جب شیو پرساد نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے خاندان والوں نے چونکہ آر ایس ایس کے کٹر حامی ہیں اسے خاندان سے خارج کر دیا لیکن اس کے باوجود شیو پرساد کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خاندان والوں کو بھی راہِ راست دکھا دے۔ شیو پرساد کا کہنا ہے کہ اڈوانی اور اشوک سنگھل نے بابری مسجد کی شہادت کی کارروائی کی قیادت کی تھی اور شہادت کے دن پولیس اور سی آر پی ایف نے بی جے پی، آر ایس ایس اور بجرنگ دل کے قائدین سے ساز باز کر رکھی تھی۔ اسے یاد ہے کہ اس دن اشوک سنگھل نے فوجی یونیفارم پہن رکھا تھا اور ہدایات دے رہے تھے۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد انہوں نے فیض آباد کے مسلم علاقوں میں جا کر "جے شری رام" کے نعرے لگائے تھے لیکن اب قرآن پاک کی ۱۰ سورتیں حفظ کر لینے کے بعد وہ ایک سچا اسلامی مبلغ بننے کا خواہاں ہے تا کہ گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لا سکے۔ ان شاء اللہ اس کا ارادہ پورا ہوگا اور جن ہاتھوں نے بابری مسجد کو شہید کیا تھا وہی اس کی دوبارہ تعمیر کریں گے۔"

یہ خبر بظاہر خلافِ توقع اور حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن جو لوگ اسلام کی تاریخ سے

آ گئے ہیں اور جنہوں نے خصوصیت سے اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں پڑ گئی ہیں ان کے لئے یہ کوئی نئی اور تعجب خیز بات نہیں!

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب مکہ میں صدائے توحید بلند کی تو قریش نے کس شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی؟ اور پھر مسلسل حدیبیہ تک اس شدت میں کوئی کمی نہیں آئی لیکن صلح حدیبیہ جس میں بظاہر آپ ﷺ نے دب کر صلح فرمائی اس نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے، اسلام کو سمجھنے اور مسلمانوں کے اخلاق کو جاننے کا جو موقع فراہم کیا، اس نے حدیبیہ میں مسلمانوں کی ظاہری شکست کو اسلام کی فتح مبین میں تبدیل کر دیا اور جن دلوں کو تلوار کے ذریعہ مسخر کرنا ممکن نہیں تھا اسلامی تعلیمات کی قوت تسخیر نے ان کو اپنا گرویدہ اور غلام بے دام بنا لیا۔

عرب کے پڑوس میں جو قوتیں تھیں ان میں سب سے بڑی طاقت ایران کی تھی جو مشرکانہ فکر و اعتقاد کی نمائندہ تھی اور اس نے اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی عداوت گویا اپنی گھٹی میں رکھی تھی لیکن یہ اسلام کی کشش ہی تھی کہ نہ صرف اہل ایران نے اسلام قبول کیا بلکہ یہی ایران کا علاقہ ہے جس نے علوم اسلامی کی جمع و تدوین اور حفاظت کا فریضہ انجام دیا، یہیں سے ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں جو پوری دنیا میں علوم اسلامی کی سب سے مستند و معتبر ترجمان تسلیم کی گئیں، اور جن کے سامنے عربوں نے بھی سر احترام خم کیا۔

اس سلسلہ کا سب سے اہم تاریخی واقعہ تاتاریوں کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ یہ ایک وحشی قوم تھی کہ جیسے انسان راستے کے سنگریزوں کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے، اسی طرح اس قوم نے انسانوں کو روندتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھائے اور عالم اسلام کو ایسا پامال کیا کہ دار الخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کیا اور بغداد جیسا شاداب و آباد اور بارونق شہر ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا، یہاں تک کہ خود خلیفۃ المسلمین معتصم باللہ قتل کر دیئے گئے، اور انہیں لاتوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے مار مار کر ختم کر دیا گیا، پھر یہی آفت بے اماں آندھی نے شام کا رخ کیا اور دیکھتے ہی

دیکھتے ہی دیکھتے تمام عالم اسلام میں تباہی مچ گئی۔ مسلمانوں پر ایسی قیامت ٹوٹی کہ ان صدمات اور مظالم کے بیان میں بافراط خود تاتاری بھی الفاظ کے تنگی داماں کی شکایت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وحشی، جو مسلمانوں کی بدترین دشمن قوم تھی مسخر بھی ہو سکتے ہیں؟!

لیکن تاریخ میں اس سے زیادہ غیر متوقع اور ناقابل قیاس شاید ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہو کہ اسلامی مملکت کے اس عظیم فاتح نے اسلام کے ہاتھوں شکست کھائی، اور چین کی سلطنت زیر کرنے کے بعد اپنی فکر و نظر اور دل و نگاہ کی سلطنت اسلام کے حوالے کر دی، چنگیز خان کے چار بیٹوں کی الگ الگ شاخیں قائم ہوئیں، اور ایک صدی کے اندر پوری قوم دامن اسلام سے وابستہ ہو گئی۔ اس میں سب سے دلچسپ اور عبرت انگیز واقعہ تغلق تیمور خان (۱۳۴۷ء-۱۳۶۳ء) کے قبول اسلام کا ہے، یہ کاشغر کا ولی عہد شہزادہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ شکار کے لئے نکلا، شکارگاہ میں کسی اور کے آنے کی ممانعت تھی، اتفاق سے شیخ جمال الدین نامی بزرگ جو اپنے رفقاء کے ساتھ اس ممنوعہ علاقہ میں آ گئے، شہزادے نے اس جرم میں ان حضرات کو طلب کیا، شہزادے کے ساتھ اس کا شکاری کتا بھی تھا، اس نے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ سے پوچھا کہ تم بہتر ہو یا یہ بہتر ہے؟ شیخ نے جواب دیا: اگر میں ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ بہتر ہے۔ شیخ کا یہ جواب تیر کی طرح بادشاہ کے دل میں چبھ گیا اور شکار کرنے والا خود شکار ہو گیا۔

اس نے پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ شیخ نے نہایت ہی دل نشیں پیرائے میں ایمان کی حقیقت سمجھائی اور "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" کے مصداق تغلق پر شیخ کی بات کا گہرا اثر ہوا، اس نے خواہش کی کہ جب اس کی تخت نشینی عمل میں آ جائے تو وہ اس کے پاس آئیں اور اس سلسلے میں گفتگو کریں۔ اس واقعہ پر ایک عرصہ گزر گیا یہاں تک کہ شیخ بیمار پڑے اور ان کی وفات کا وقت آ پہنچا، اپنی موت کے قریب شیخ نے اپنے صاحبزادے شیخ رشید الدین سے فرمایا کہ وقت آئے گا کہ تغلق تیمور تخت شاہی پر متمکن ہوگا

اس وقت تم ان کے پاس جانا اور انہوں نے مجھ کو جو وقت دیا تھا وہ یاد دلاتے ہوئے ان پر اسلام پیش کرنا۔ تغلق کے بادشاہ بننے کے بعد شیخ رشید الدین نے بادشاہ سے ملاقات کی بڑی کوشش کی، لیکن مسلمان اس وقت اتنے حقیر و بے وزن تصور کئے جاتے تھے کہ کسی طور ایوانِ شاہی تک رسائی حاصل نہیں ہو پاتی تھی۔ آخر شیخ رشید الدین نے اس کے لئے ایک انوکھی تدبیر سوچی اور ایک دن شاہی خیمہ کے سامنے ٹھیک فجر کے وقت اذان دینی شروع کردی۔ بادشاہ کی نیند میں خلل ہوا اور اس نے غضبناک ہو کر شیخ رشید الدین کو طلب کیا۔ شیخ آئے اور انہوں نے اپنے والد کا پیغام پہنچایا۔ بادشاہ کو پچھلا وعدہ یاد آ گیا اور وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا، پھر اس نے اپنی رعایا کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اس طرح چنگیزی سلطنت کا وہ حصہ جو چنگیز کے بیٹے چغتائی کی اولاد کے زیرِ تسلط تھا پورا کا پورا مسلمان ہو گیا۔ اقبال نے اس کو شعر کا جامہ پہنایا ہے:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
مل گیا پاسباں کعبہ کو صنم خانے سے

کعبۂ اسلام میں دشمنوں کو جاں نثار اور خون آشاموں کو اپنا فدا کار بنانے کی جو صلاحیت پہلے تھی وہ اب بھی ہے، اور ''شیو پرشاد'' کا اسلام قبول کرنا اس کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے!

جمہوریت نے یقیناً مذہبی رواداری کا مزاج پیدا کیا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا سابقہ ایسی قوموں سے رہا جو کلمۂ حق سننے کے بھی روادار نہ تھے اور جب کوئی شخص یا قوم کسی بات کو سننے ہی کو تیار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا اس سے متاثر ہونا اور اس دعوت کا قبول کرنا دشوار ہوتا ہے۔ آج یقیناً دینِ حق کی دعوت کے مواقع پہلے سے کہیں بڑھ کر ہیں، لیکن افسوس کہ ہم میں آج شیخ جمال الدین اور شیخ رشید الدین موجود نہیں ہیں۔ تیرگیٔ شب کی آغوش سے سورج طلوع ہوتا ہے اور جب جھلسا دینے والی گرمی زمین کو جلا کر رکھ دیتی ہے تو رحمت کی گھٹائیں زمین پر نثار ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی قوم میں اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی عداوت اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور نفرت کے شعلے

پوری طرح مجروح کرتے ہیں تو اس عداوت کی چنگاری سے محبت کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے اور نفرت کی نہ ختم ہونے والے ایمان کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے ہمیں کسی شکوے کی نہیں بلکہ خود احتسابی کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہم نے خیر امت کی حیثیت سے اپنا فریضہ ادا کیا ہے؟

کاش! وقت کی چنگیزی طاقتوں کے مقابلے کے لئے ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا!!

(۲۲رجون ۲۰۰۰ء)

نہایت اہم کام

۱۸ اکتوبر ۱۹۹۸ء کے منصف میں آخری صفحہ پر ایک ایسی خبر شائع ہوئی ہے، جس نے یقیناً ہر اس شخص کو مسرور و شاد کام کیا ہوگا جو اپنے دل میں ایمان و یقین کی کوئی چنگاری رکھتا ہو، یہ خبر ہے بیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر ۷۲ سالہ "مسٹر نرسم ہلی وینکٹ بالا سبرامنیادت" کے مشرف بہ اسلام ہونے اور "محمد اسحٰق" بن جانے کی۔ جناب ذات کا تعلق برہمن گھرانے سے ہے۔ World University of Tuscon امریکہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، وہ اپنے نومسلم فرزند محمد ثقیف (سابق ایم نرسم ہلی ریچرا ما) کی ترغیب پر ایمان لائے ہیں، جناب ثقیف علی تو ایک سال پہلے ہی ایمان سے سرفراز ہوئے ہیں، لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے مدتوں تلاش حق کا سفر کیا اور آخر انسانیت کے نام اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ہدایت "قرآن مجید" نے ان کو اس نعمت سے ہمکنار کیا، جس کے لئے ان کی روح بے تاب تھی۔

بھلے ہی اخبارات اور ذرائع ابلاغ کے لئے یہ معمولی خبر ہو، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ ایک اہم واقعہ اور خدا کا ایک زندہ پیغام ہے، یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کبھی ناامیدیوں کی شب تاریک سے صبح امید طلوع ہوتی ہے، ملک کے سیاسی افق پر فرقہ پرستی کی گھٹا چھائی جا رہی ہے، لیکن دلوں کی دنیا پر جھوٹے بازی گروں کی حکمرانی نہیں، اب بھی اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حقیقت پسند اور سچائی کے پرستار ہیں، بعض ایک دستک ان کے دلوں کے بند دروازے کو کھول سکتی ہے اور قلب و نظر کی دنیا کو فتح کر سکتی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس

ہے اندر سے انکار، نظریات اور عقائد و تصورات کو قبول کرنے کی خاص صلاحیت ہے۔ اسی لئے بودھ مت، جین مت اور ہندو مت اسی ملک میں پیدا ہوا اور سکھ ازم نے فروغ پایا، پارسی مذہب نے بھی ہندوستان کے سایہ میں اپنے آپ کو باقی رکھا ہے، ورنہ ایران تو اسے بھلا چکا ہے، کمیونزم کو اگر مستقل مذہب سمجھا جائے تو اس نے بھی ہندوستان ہی میں آنکھیں کھولیں اور یہیں پروان چڑھا، عرب سے جب مسلمان ہی سندھ کے ساحل پر اترے تھے، ہندوستان نے اس دینِ حق کا بھی استقبال کیا اور اس کو اپنا چشم اعتقاد کا سرمہ بنایا، آج برصغیر میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، وہ یقیناً اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس ملک نے کبھی بھی دعوتِ حق کو قبول کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

اسلام اور اسلام کے اولین مرکز جزیرۃ العرب سے ہندوستان کا قدیم تعلق رہا ہے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں تیغ و شمشیر کے جلو میں آئے اور ان کی اصل دلچسپی دلوں کی تسخیر کے بجائے زر و زمین کو فتح کرنے سے تھی، لیکن یہ صحیح نہیں۔ عرب اور افغان مسلمان حکمران یقیناً یہاں فتح و تسخیر کی راہ سے آئے، لیکن اسلام اس ملک میں ساحلی علاقوں کے ذریعہ پہنچا اور اس نے یہ سفر فوجیوں اور سپاہیوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ داعیوں اور تاجروں کے ذریعہ طے کیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق اسلام سب سے پہلے عرب تاجروں کے ذریعہ جزیرۂ سراندیپ میں پہنچا اور مسلمان تاجروں سے متاثر ہو کر سراندیپ کا راجہ ۲۰ھ میں مشرف با اسلام ہوا، مشہور سیاح "بزرگ بن شہریار ناخدا" کا بیان ہے کہ جب سراندیپ کو کسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کا علم ہوا تو اس نے باضابطہ اپنا نمائندہ تحقیقِ حال کے لئے مدینہ بھیجا، اس زمانہ میں سفر آج کی طرح آسان نہ تھا، راجہ کی فرستادہ کو مدینہ پہنچنے میں اتنی مدت لگ گئی کہ وہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پہنچا اور حضرت عمرؓ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا دوسرا راستہ جزیرۃ العرب ہے۔ یہاں بہ حیثیت

سمندر سے ایک جن آتا تھا لوگ اس سے بچنے کے لیے ہر ماہ ایک کنواری لڑکی کو بنا سنوار کر ساحل سمندر کے ایک بت خانہ میں چھوڑ آتے تھے، لیکن مراکش کے ایک شیخ ابوالبرکات بربری جو اتفاق سے یہاں آگئے تھے ان کی دعا سے یہ بلا ٹل گئی، بادشاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور خود راجہ (جس کا نام شنورازہ تھا) اور اس کی رعایا شیخ کے ہاتھ پر ایمان لے آئی۔ اس طرح مالابار، کورومنڈل اور گجرات کے بعض علاقے ہیں جہاں مسلمان داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ اسلام کی روشنی پہنچی اور اس نے اپنی انسانیت دوستی، مساوات پر مبنی تعلیمات اور حقیقت پسندانہ نظریات کی بناء پر لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش کیا۔

مسلمان مجاہدین نے بھی جو بیک وقت میدان جنگ کے سپاہی بھی ہوتے تھے اور دردمند داعی اور مبلغ بھی، شروع ہی سے ہندوستان پر اپنی نگاہ رکھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے وصال کے پانچ سال بعد یعنی ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ نے بحرین اور عمان کے علاقے پر عثمان بن ابی العاص ثقفی کو گورنر مقرر فرمایا۔ انہوں نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو بحرین کا ذمہ دار مقرر کر کے ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا۔ حکم نے کشتیوں کے ذریعہ دریائی سفر کی کٹھن منزلیں طے کیں اور ساحل گجرات پر قدم رکھا۔ اس فوج میں یقیناً بہت سے صحابہ بھی شریک تھے، جو شہادت سے سرفراز ہوئے اور بقول مولانا عبدالحی حسنی یقیناً تھانہ اور بھروچ کے گردونواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا۔ پھر حکم نے بھروچ پر حملہ کیا۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے خشکی کے راستے سے سندھ پر قبضہ کیا۔ اس طرح گویا عہد فاروقی ہی سے ہندوستان مسلمان مجاہدین کا مرکز توجہ رہا ہے۔

جہاں ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ متعدد صحابہ کرام اور تابعین عالی مقام کی خواب گاہ ہے، وہیں ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی البصری، جو تابعین میں تھے اور فن حدیث کے پہلے مصنف بلکہ "کشف الظنون" کے مصنف کے بقول تاریخ اسلامی کے اولین صاحب تصنیف گزرے ہیں، عباسی خلیفہ مہدی کے عہد میں وارد ہند ہوئے اور یہیں پیوند خاک ہو گئے۔ "اس ملک کی سعادت مندیوں اور خوش بختیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ ہندوستان

ہی کے ایک مطبوعہ نسخہ کی تواریخ پر ۱۲۰۰ھ میں ہندی زبان میں کیا گیا ہے

(عرب و ہند کے تعلقات: ۱۳۱)

ان تاریخی حقائق سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان پر اہل دین اور داعیان اسلام کی کتنی کچھ توجہ تھی؟ چنانچہ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ (م ۴۶۵ھ)، خواجہ معین الدین اجمیریؒ (م ۶۲۷ھ) اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (م ۶۳۳ھ) جیسے اہل دل اسی ملک میں خیمہ زن ہوئے، رشد و ہدایت کی محفلیں آراستہ کیں اور یہیں آسودۂ خواب ہوئے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان پر جن مسلمان قبائل کو حکمرانی کا موقع ملا وہ عرب نہیں تھے اور ان میں سے اکثر حکمراں وہ تھے جن کو اقتدار محبوب تھا اور اسلام سے ان کا تعلق بہت کمزور اور معمولی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جن حکمرانوں کو چھوڑ کر عام طور پر ان سلاطین نے اسلام کی دعوت و اشاعت اور تبلیغ و توسیع پر کوئی توجہ نہیں دی اور ایک ایسی سرزمین جو ہدایت کی محتاج تھی اور جس کو معمولی سعی و کاوش کے ذریعہ اسلام کی طرف لایا جا سکتا تھا، ایمان سے محروم رہی۔ اسلامی تاریخ میں مشترک ممالک میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے کہ مسلمانوں نے وہاں کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی ہو اور اس کے باوجود اس ملک کی اکثریت اسلام کی نعمت سے محروم رہی ہو۔

ہمارے ملک کا موجودہ جمہوری نظام اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس میں دعوتِ دین کے وسیع مواقع ہیں، لیکن آج بھی ہم نے اس پہلو پر بہت کم توجہ دی ہے، حالاں کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے سب سے اہم کام یہی ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ جن قوموں کو جنگ کے میدان میں سرنگوں نہیں کیا جا سکا اور ایمان سے بے بہرہ ہیں جن پر غلبہ حاصل نہیں ہوا، دعوتِ اسلام نے ان کو فتح کیا اور اسلام نے ان کے دل و دماغ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا لیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود حیاتِ نبوی ﷺ ہے، مکی تیرہ سالہ زندگی میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی، صلح حدیبیہ کے موقع سے جو رفقاء آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان کی تعداد چودہ سو تھی، اس صلح نے امن و امان کی فضا فراہم کی اور آپ ﷺ کو کار دعوت کی طرف توجہ کا موقع ملا، اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے بعد جب فتح مکہ کے موقع سے آپ ﷺ تشریف لائے تو اس وقت آپ کے رفقاء کی تعداد دس ہزار سے بھی متجاوز تھی اور فتح مکہ کے دو سال بعد حجۃ الوداع میں جو صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز تھی۔ غرض ۶ ہجری میں جو تعداد چودہ سو تھی صرف چار سال کے عرصہ میں وہ ایک لاکھ سے بھی آگے بڑھ گئی۔ ظاہر ہے یہ دعوت دین اور تبلیغ اسلام ہی کا کرشمہ تھا کہ جن لوگوں کو بدر و احد اور خندق و حنین میں فتح نہیں کیا جا سکا، اسلام کی دعوت نے ان کو غلام بے دام بنا دیا۔

آج بھی ہندوستان میں اور پوری دنیا میں مسلمانوں کے مسائل کا اصل حل یہی ہے۔ یہ وقت کا سب سے اہم کام ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ آج بھی اگر اس سمت میں تھوڑی سی سعی کی جائے تو منزل کو پانا دشوار نہیں:

در کھلا ہوا ہے، سب کے لئے
شرط لیکن وفا ہے، سب کے لئے

(۳۰ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اس آگ کو بجھایئے!

اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو آبادی کے تمام لوگ آگ بجھانے اور گھر کو بچانے دوڑ پڑتے ہیں اور ہر شخص اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ایک ساتھ دو بالٹی اٹھاتا ہے، کوئی ڈول دو ڈول لے کر پہنچ جاتا ہے، کوئی لوٹا دو لوٹا ہی پانی ڈال دیتا ہے، چھوٹے بڑے، امیر غریب جوان بوڑھے اور مرد و عورت ہر شخص اپنی طاقت اس بلاء ناگہانی سے نپٹنے بجھانے میں صرف کر دیتا ہے، کیوں کہ اگر آگ پھیلی تو صرف اسی گھر کا نقصان نہیں ہوگا جس گھر میں آگ لگی ہو، بلکہ یکے بعد دیگرے سارے گھر جلیں گے اور پوری بستی خاکستر ہو کر رہ جائے گی، آگ ایسی کور چشم اور عدم آشنا ہے کہ اس کی سرشت میں من و تو کا کوئی امتیاز ہی نہیں، نہ امیر کا خیال کرتی ہے نہ غریب پر رحم کھاتی ہے، نہ طاقت اور حکومت والوں سے ڈرتی ہے نہ بے قصور رعایا اور کمزوروں پر اسے ترس آتا ہے، ایک بلاء بے درماں ہے جو زد میں آجائے جلا کر رکھ دیتی ہے۔

اگر دریا پانی سے لبریز ہو اور پشتہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو سارے لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی طاقت بھر پشتہ کو مضبوط کرنے اور پانی کو تھامنے کی تدبیر کرتا ہے، کیونکہ پانی بھی آگ ہی کی طرح بے رحم اور بے حس واقع ہوا ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ خوش رنگ پھلواریاں ہوں، ہرے بھرے کھیت ہوں، پر رونق آبادیاں ہوں، آبادی میں معصوم بچے رہتے ہوں، بے زبان جانور ہوں، بیمار اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے لوگ ہوں، اس کی تلاطم خیز موجیں کوئی پابندی، دوڑتی بھاگتی، ہر شئے کو غرقاب اور تہ آب کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی لئے آگ لگ جائے اور سیلاب آجائے تو ایک دوسرے سے

دوسرے بیکار دشمن بھی اپنی عداوتوں کو فراموش کر کے اس مصیبت کا سدباب کرنے کے لیے یک جہت ہو جاتے ہیں۔

یہ آگ اور پانی کی مصیبتیں وہ ہیں جو ہمیں مادی نقصان پہنچاتی ہیں، جن کی وجہ سے عمارتیں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن ایک اور آگ ہے جس کا نقصان اس نقصان سے بھی بڑھ کر ہے اور ایک سیلاب ہے جس کی تباہکاری اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہے: وہ ہے بدعملی اور بے حیائی کی آگ، جو انسانی آبادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اور وہ ہے منکرات اور فحش کا سیلاب، جس کی زد سے کوئی کچا اور پکا مکان محفوظ نہیں ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس آگ اور سیلاب کو بجھانے اور تھامنے کی ہمارے اندر کوئی فکر نہیں، یہ آگ گھر گھر سلگ رہی ہے اور یہ سیلاب اخلاق و کردار کی عمارتوں کو زمین بوس کرتا جا رہا ہے، لیکن نہ اس پر بے چین ہونے والے دل ہیں، نہ اس پر رونے والی آنکھیں ہیں، نہ اس کے لئے جنبش میں آنے والے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ ہمارے بزرگوں کو اس کی فکر ہے نہ جوانوں میں اس کے مقابلہ کا عزم۔

برائی کی طرف میلان انسانی فطرت میں موجود ہے، اس کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ جس قوت سے برائی پھیل رہی ہے اسی قوت سے بلکہ اس سے بڑھ کر برائی کو روکنے کی تدبیریں کی جائیں، اسی تدبیر کا نام قرآن مجید کی زبان میں "نهى عن المنكر" ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ امت محمدیہ کا ایک بنیادی مقصد نہی عن المنکر ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس کو تمام عالم میں خیر امت یعنی بہترین انسانی گروہ کا لقب دیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۱۰) مسلمانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: "وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اس دوستی کا حق یوں ادا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔" (التوبہ: ۷۱) برائی سے روکنے والوں کو صالحین میں شمار کیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۱۴) اور ارشاد ہوا کہ: "تم سے ایک ایسا گروہ ہمیشہ ضرور رہنا چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہو، بھلائی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو، کہ یہی لوگ دراصل کامیاب ہیں۔" (آل عمران: ۱۰۴)

قرآن کی اس تعبیر پر بھی غور کیجئے کہ بھلائی کو معروف اور برائی کو منکر سے تعبیر کیا ہے، معروف کے اصل معنی ایسی بات کے آتے ہیں جو لوگوں میں مروج اور مشہور ہو اور جس کا چلن قائم ہو گیا ہو، اس کے مقابلہ میں منکر کا لفظ ہے، یعنی ایسی بات جو انجانی اور نامانوس ہو، گویا بیگانہ جیسے آ جاتی ہو، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سماج میں نیکیوں کا عام چلن ہونا چاہئے، وہ سماج کا مزاج اور مشہور عمل ہو، اور برائی سماج میں اتنا منکر ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کے لئے اچنبھے کا باعث ہو، خلافِ معمول کوئی بات جیسے آ جاتی ہو۔

اس تعبیر سے نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب برائی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر ۱۷۷) دل سے روکنے کا مطلب دو ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ دل سے اس پر کراہت محسوس کرے، دوسرے یہ کہ دل میں اس بات کا عزم رکھے کہ جب اسے قدرت حاصل ہوگی وہ اس برائی کو روکنے کی کوشش کرے گا، ہاتھ سے روکنے کا منشاء ہمیشہ اور ہر جگہ جسمانی طاقت نہیں ہے، بلکہ اپنے اثر و رسوخ اور تعلقات و روابط کا استعمال کرنا بھی اس میں داخل ہے، جیسے انسان دنیا کے مسائل میں اپنے رسوخ اور اپنی حیثیت کو کام میں لاتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بارے میں بھی اسے اس سے بڑھ کر اپنی اخلاقی قوت استعمال کرنا چاہئے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ جن چیزوں کا برائی اور منکر ہونا متفق علیہ ہے اور جن کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی مداہنت برتی جاتی ہے، اہلِ علم اور اربابِ دین بھی کھلے تساہل سے کام لیتے ہیں، اس سے کس کو اختلاف ہوگا کہ گانا بجانا حرام ہے، شادی بیاہ میں مروجہ تصویر کشی اور ویڈیو گرافی جس میں عورتوں کی بھی تصویریں محفوظ کر لی جاتی ہیں، ناجائز ہیں، اس سے کسے اختلاف ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے بے جا مطالبات حرام ہے اور رشوت کے حکم میں ہے، کون نہیں جانتا کہ سودی کاروبار پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

لعنت ہے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سماج کے با اثر لوگ جب علانیہ ان برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی شان بگھارتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ ہماری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، بلکہ ہم خود ان تقریبات میں شریک ہو کر رونق محفل میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہم خود حرام اور بے جا کاروبار کرنے والوں کی اجتماعی اور اہتمام سے معمور دعوتوں میں شریک ہو کر عملاً اس برائی کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

حدیث میں اسی لئے برائی سے روکنے کو زبان کا جہاد (جہاد باللسان) قرار دیا گیا ہے، (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹) کیوں کہ نیکی کی دعوت آسان ہے، اگر آپ کسی کو نماز، روزہ کی دعوت دیں، حج و زکوٰۃ کے لئے توجہ دلائیں تو اس سے اس کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی، نہ اس سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے، لیکن جب کسی انسان کو اس کی برائی پر ٹوکا جائے تو اس سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے، وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے وہ بے جا رد عمل کا اظہار کرتا ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بہت بڑا گناہ ہے (اکبر الذنب) ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم اللہ سے ڈرو، تو وہ جواب میں کہے تم اپنی فکر کرو، علیک نفسک۔
(مجمع الزوائد: ۷/۲۷۱)

جو چیز برائی پر ٹوکنے اور اس سے روکنے میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں، ایک دنیا کی محبت، دوسرے اہل ثروت اور اہل اقتدار کا خوف، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم میں دنیا کی محبت گھر کر لے گی تو تم نہ نیکی کا حکم دو گے اور نہ برائی سے روکو گے، اور نہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو گے۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۷۱) اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: خبردار! کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق جاننے کے باوجود حق کہنے سے باز نہ رکھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۹۱) یہ اس امت کے ادبار اور پستی کی علامت ہے کہ اس میں برائی پر ٹوکنے والی زبانیں باقی نہ رہیں، حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دین کے اقبال کی علامت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں میں دین کا فہم ہو، اس میں ایک دو برے لوگ

ہوں تو وہ دو باتیں ہیں: ذلیل سمجھے جائیں اور اس دین کے ادبار کی علامت یہ ہے کہ علماء لوگ گناہوں میں مبتلا ہو جائیں، الا کہ اگر کسی دین پر قائم ہوں، وہ معاشرے میں ذلیل سمجھے جائیں اور بات کریں تو مضمون مختصر ہو، یہاں تک کہ علانیہ شراب پی جائے، ایک عورت قوم پر سے گزرے تو قوم میں سے ایک شخص اس کی طرف کھڑا ہو اور دامن اٹھا کر اس طرح برائی کرے جیسے کسی مادہ جانور کی دم اٹھا کر نر اس سے جفتی کرتا ہے، اس دن جو شخص یہ کہے کہ تم نے اس کو اس دیوار کے پیچھے تو کر لیا ہوتا تو وہ اس دن ان میں ویسے ہی ہوگا جیسے تم میں ابوبکر و عمر، اس دن جو نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے، اس کے لئے ایسے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا جس نے مجھے دیکھا ہو، میری اطاعت کی، مجھ پر ایمان لایا ہو اور مجھ سے ہاتھوں پر بیعت ہوا ہو۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۸۰) برائی کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے خیال گزرتا ہے کہ شاید اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔

برائی سے نہ روکنے کا گناہ صرف آخرت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ دنیا سے بھی متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سب کو پکڑ لے گا اور جس قوم میں گناہ کیا جاتا ہو، کچھ لوگ اس سے دور کرنے پر قادر ہوں، پھر بھی اسے دور نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۳۳۸، ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۶۸) رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے قریب ایک لشکر کے زمین میں دھنسا دیئے جانے کا ذکر کیا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: شاید ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جنہیں زبردستی لایا گیا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے عذاب میں تو سب شامل ہوں گے، آخرت میں نیتوں کے اعتبار سے معاملہ ہوگا۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۷۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل میں اس طرح برائی کا آغاز ہوا کہ ایک شخص دوسرے کو اس برائی پر ٹوکتا اور کہتا کہ یہ حلال نہیں اور کل ہو کر اسی کا ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم نشیں بن جاتا، چنانچہ یہی چیز بنی اسرائیل پر عذاب الٰہی آنے کا باعث ہوئی۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۳۳۶) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

کچھ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے پوری قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے، بلکہ جب کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور اکثریت قدرت کے باوجود اس پر خاموشی اختیار کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عوام و خواص سب کی ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ فعند ذلک حین یاذن اللہ فی ھلاک العامۃ والخاصۃ (مجمع الزوائد ۷/۲۶۸)۔

یہ ضروری ہے کہ سماج کا ضمیر زندہ ہو، وہ برائی سے ایسی ہی نفرت کرتا ہو جیسے انسان گندگی سے نفرت کرتا ہے، سماج میں جب کوئی برائی ہو تو کتنی زبانیں ہوں جو اس پر ٹوکنے کے لئے آمادہ ہوں، جب ایک شخص ظلم کرے تو سینکڑوں ہاتھ اس ظلم کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، جب کوئی نگاہ بد کرے تو کتنی ہی غضب آلود نگاہیں اس کے حوصلے پست کر دیں، خدا کی نافرمانی پر انسان کو اپنی نافرمانی سے زیادہ تکلیف ہو، اپنے بھائی پر جب کوئی ظلم ہوتا ہوا دیکھے تو اسے محسوس ہو کہ یہ ظلم خود اس پر ہو رہا ہے، جب وہ کسی آبرو کو لٹتے ہوئے دیکھے تو اسے خیال ہو کہ یہ عزت تو ہر دوسری مقتول عورت اس کی بہن بیٹی ہے، برائیوں کے بارے میں جب تک ضمیر زندہ نہ ہو، دلوں میں اللہ کی اہمیت انسان کے ذہن میں نہ ہو اور خدا کے خوف سے ہمارے سینے معمور نہ ہوں اس وقت تک برائیوں کے اس سیلاب کو تھامنا، بے حیائی کی اس آگ کو بجھانا اور بد اخلاقی کی اس تیز آندھی کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

...... اور اب تبلیغی جماعت بھی

دہلی کے جنوب میں راجپوت نو مسلموں کی ایک قدیم آبادی تھی۔ یہ میو کہلاتے تھے، اور اسی مناسبت سے یہ علاقہ میوات کہلاتا تھا، شجاعت و بہادری اور جنگ جویانہ صلاحیت تو ان کے رگ و ریشہ میں سرایت تھی۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں دارالسلطنت دہلی پر آئے دن ان کی طرف سے لوٹ مار ہوتی رہتی تھی، اور حکمرانوں کو گاہے گاہے ان کی سرکوبی کے لئے باضابطہ فوج کشی کرنی پڑتی تھی، غالباً اسی وحشت و جہالت کی وجہ سے یہ ایک فراموش کردہ گروہ تھا، جو ایمان اور کفر کے درمیان زندگی گذار رہا تھا، عیدین، محرم، شب برات اگر ان کے مسلمان ہونے کی پہچان تھی تو دسہرہ، دیوالی، جنم اشٹمی اور ہولی بھی، وہ جوش و خروش سے منایا کرتے تھے، وہ برہمن سے شادیوں کے لئے تاریخ لیتے اور برہمن اور قاضی دونوں کے اشتراک سے رسم نکاح انجام دیتے، دھوتی مردوں کا عام لباس تھا، اور مسجدیں ان کی آبادیوں میں خال خال ہوتی تھیں، وہ بھی نمازیوں کے لئے مرثیہ خواں۔

اللہ تعالیٰ نے اس طبقہ کی اصلاح کا ایک غیبی انتظام پیدا فرمایا کہ بستی نظام الدین دہلی میں (جو اس زمانہ میں گویا میوات کی سرحد تھی) ایک بزرگ مولانا محمد اسمٰعیل قیام پذیر ہوئے، انہوں نے اس بھولے اور بھٹکے ہوئے علاقہ کو اپنی کوششوں کی آماجگاہ بنایا، اور انہوں نے یہیں ایک مکتب قائم کیا، وہاں میوات سے دینی تعلیم کے لئے بچوں کو لانے لگے اور اس علاقہ میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع کیا، اس طرح میواتیوں میں محبت کی چنگاری جل اٹھی، انہوں نے سوچا کہ یہ کون ہے جو بھٹکے ہوؤں کو گلے لگاتا ہے! اور اس

طرح اس سرکش قوم کا ایک گروہ دوبارہ دینی زندگی میں سنجیدہ ہونے لگا۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے بعد ان کے بڑے فرزند مولانا محمد صاحب نے ان کی جگہ کو سنبھالا۔ وہ اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھایا، محبت کی جو شمع روشن کی گئی تھی، اس کی جڑیں گہری اور مضبوط ہوگئیں۔ مولانا محمد صاحب کی وفات کے بعد ایک ایسے شخص نے اس مسند کو سنبھالا جو محبت کا سودائی تھا، جس کے رگ و ریشہ میں امت کا پیار سمایا ہوا تھا، جس کا دل دردمند ہر لمحہ امت کے لئے تڑپتا اور پھڑپھڑاتا رہتا تھا، اور جس کی آنکھیں انسانیت کے غم میں شب و روز آنسوؤں سے وضو کیا کرتی تھیں، جس کی زبان لکنت زدہ تھی، لیکن اخلاص و ایمان کی حرارت اور دردِ دل کی حلاوت کی وجہ سے وہ دوسروں کو موم اور شعلہ کو شبنم بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی، وہ شخصیت تھی مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کی، جو مولانا محمد اسماعیل کے صاحبزادے اور مولانا محمد کے برادر خورد تھے۔

وہ اس وقت مظاہر علوم سہارنپور میں اچھے خاصے کامیاب اور مقبول مدرس تھے، اور ہر طرح کے بارِ غم سے آزاد، لیکن خدا نے جس کو غم سہنے اور غم اٹھانے کے لئے پیدا کیا ہو وہ کیوں کر اس بوجھ سے آزاد رہ سکتا ہے؟ میواتیوں کی فکر اور ان کی بے دینی کا غم مولانا کو سہارنپور سے میوات لایا، اس وقت مولانا کے پاس سرمایۂ زندگی کچھ بھی نہ تھا، البتہ خدا پر توکل کی متاعِ گراں مایہ ساتھ تھی، اور بار بار ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ فاقہ مستی کی لذتوں سے اپنے آپ کو شاد کام فرماتے تھے، میوات میں مدارس کے لئے مالی وسائل فراہم کرنا تو دور کی بات ہے، لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے بھی روادار نہیں تھے، ان حالات میں آپ نے گاؤں گاؤں قیامِ مکاتب کی تحریک چلائی، اور بے شمار مکتب قائم فرمائے، لیکن میوات میں جہالت و بے دینی کا جو طوفان تھا، مکاتب کے یہ کمزور دیے ان کو روکنے میں چنداں مؤثر ثابت نہیں ہوئے، اور مولانا کی بے قراری بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ جب ایک مکتب کا حافظ جب بہ حسرت افتخار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، اور آپ نے دیکھا کہ اس کی داڑھی منڈی ہوئی ہے، اور وضع قطع میں کسی اسلامیت کا کوئی رنگ نہیں، تو آپ اور بے چین ہو گئے، اور اس نے امت کے اسیرِ غم کو اور بھی گھلانا شروع کر دیا۔

یہاں تک کہ شوال ۱۳۴۴ھ میں دوسری بار حج کے لئے روانہ ہوئے، جب مدینے سے واپسی کا وقت آیا تو مولانا پر ایک عجیب اضطرابی کیفیت طاری تھی، ایسی کہ جیسے کسی غلام نے طے کرلیا ہو کہ اپنے آقا سے، اپنی مراد بھرے بغیر چوکھٹ چھوڑے گا نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں دعوت و اصلاح کا وہ طریقہ ڈالا جو آج تبلیغ کے نام سے معروف ہے، مولانا کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے، تمہیں ہندوستان واپس جانا چاہئے، ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ کو یہ مسجد سبحان پورہ میں مولانا نے اس سلسلہ کا پہلا خطاب فرمایا، دعوت و تبلیغ کے کام کے لئے افراد کی تشکیل کی، پھر اپنی بستی میں دعوت کے اصول مقرر فرمائے، ابتداء میں آپ نے دعوت کے مضمون کو اتنی وسعت دی تھی کہ وہ ۲۰ دفعات تک پہنچ گئے، لیکن ظاہر ہے کہ مولانا جس طرح امت کے ہر طبقہ سے یہ کام لینا چاہتے تھے، ان کے لئے احکام دین کی اتنی طویل فہرست کو سنبھالنا ممکن نہیں تھا، اس لئے تجربہ سے مختصر کرتے ہوئے مولانا نے اس تحریک کو چھ نکات پر مرکوز فرمادیا، ایمان، اخلاص، نماز، ذکر، علم، اور اکرام مسلم، یہ وہ باتیں ہیں جن پر امت کے تمام طبقات کا اتفاق ہے، اور جس سے کسی مسلمان کے لئے اختلاف کی گنجائش نہیں، یہ گویا امت کے لئے کلمۂ سواء کا درجہ رکھتا ہے۔

قدرت نے انسان کو پانی فراہم کرنے کے دو ذرائع رکھے ہیں، ایک کنواں اور دریا جہاں پیاسے خود پہنچتے ہیں، دوسرے بادل جو پانی کی مشکول اٹھائے دور دور کا چکر لگاتا ہے، اور خود پیاسوں کو پانی پہنچاتا ہے، مولانا چاہتے تھے کہ جیسے مدارس اور خانقاہیں علم و اصلاح کے سرچشمے اور سمندر ہیں، ویسے ہی تحریک کا ایک بادل بھی ہو، اور وہ سب طالبین تک دین کا آب حیات پہنچائے، کہ انبیاء کے یہاں اشاعت دین کے یہ دونوں طریقے موجود تھے، ایک طرف لوگ دار ارقم (مکہ) اور صفہ (مدینہ) پہنچ کر انوار نبوت سے اپنے سینے منور کرتے تھے، تو دوسری طرف مکہ کی گلیوں، طائف کے بازاروں اور عرب کے دور دراز قبیلوں تک خود آفتاب نبوت پہنچتا تھا، اور جو لوگ ذوق حقیقت سے نا آشنا تھے، ان میں پیاس کی طلب پیدا کرتا تھا۔

مولانا کو اس بات پر پورا یقین تھا کہ رحمتِ الٰہی متوجہ ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تقدیر کر لیا تھا، یہی سادہ طریقہ مفید و کارآمد ہے، اس لئے سادگی اور مزید محنت سے آئندہ بڑے کام کی تیاری کریں اور اللہ کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ نکلیں اور نکلتے رہیں، انہی کا ہاتھ بچھانے اور دین کی تعلیموں کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے آباد رکھنے کے ذریعہ ہی اس کام کو تقویت حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ اسی طریقہ و منہج پر مولانا نے اس تحریک کو شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحے تک ہمت کے ساتھ اس میں لگے رہے، دین کو آگے بڑھانے سے کام لیتے رہے اور اس کے برکات زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ بروز پنجشنبہ اذانِ فجر کے وقت جب صبح صادق طلوع ہو رہا تھا، اصلاحِ امت کی فکر میں اپنے جان جانِ آفریں کے سپرد کیا اور تحریک کے بزرگوں کے مشورہ سے آپ کے فرزند ارجمند داعی الی اللہ مولانا محمد یوسف صاحب کو آپ کا جانشین منتخب کیا گیا۔ اور آپ کا عمامہ بزرگوں کے ہاتھوں مولانا یوسف صاحب کے سر پر باندھا گیا۔

مولانا یوسف صاحب کا ابتدائی دور تدریس سے زیادہ وابستہ رہا تھا لیکن اپنے والد ماجد کی آخری زندگی میں اس طرف توجہ ہوئی، پھر تو وہ اس تحریک کے لئے یوسفِ مصر بن کر ہی نہیں اُبھرے، ان کے دور میں جماعت نے مشرق و مغرب تک اس تحریک کی روشنی پہونچی۔ ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ کو ایک دعوتی سفر کے دوران آپ کی وفات ہوئی، سال کی امارت کا دور ان کی فکر و طلب کی وجہ سے جہاں تمام برکات میں بڑی تھی، انہیں کم مدت ملی؛ لیکن اسی تھوڑی مدت میں وہ ایک ’’مسکین نا آشنا دل‘‘ کی صورت تڑپتے، اور یکدم عشق کے دیوانوں کو تڑپا گئے۔ اگر مولانا الیاس صاحب کو قدرت مولیٰ سے نسبت و سلیقہ تھا تو مولانا محمد یوسف صاحب نے یاقوت بار وجد سے حصہ پایا تھا، اور ان کا خطاب دلوں کی دنیا کو زیر و زبر کر دیتا تھا۔ مولانا نے اپنے آخری خطاب میں جو فکر انگیز باتیں فرمائی ان سے بالکل صرف نظر کرنے کا رجحان طبیعت کو گوارہ نہیں، آپ نے فرمایا:

امت کی تعمیر قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والے کا نام نہیں،

بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر امت بنتی ہے جو کوئی

کی ایک قوم یا ایک حد تک دنیا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے، وہ امت کو ذبح کرتا ہے، اور ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اور حضور ﷺ اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے، امت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے پہلے خود ہم نے ذبح کیا، یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کی ثانوی امت کو کاٹا، مگر مسلمان اب بھی امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی، ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے یہ امت کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم! تمہارا اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی صرف کلمہ اور ذکر سے امت نہیں بنے گی، امت مکمل طلب اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی، بلکہ جب اپنے دوسروں کے لئے اپنا حق اپنا مفاد قربان کیا جائے گا، حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنے اوپر تکلیفیں جھیل کے اس امت کو امت بنایا تھا۔

(سوانح مولانا انعام الحسن ص ۵۰۰!)

غور کیجئے! اور ان الفاظ میں جھانکئے کہ ان کے ہر حرف سے امت کی محبت کا کیسا جذبہ بے پایاں نمایاں ہوتا ہے!

مولانا کی وفات کے بعد مولانا محمد انعام الحسن کاندھلویؒ اس تحریک کے تیسرے امیر منتخب ہوئے، مولانا نہ صرف اس قافلے کے اولین شرکاء میں تھے، بلکہ وہ مولانا الیاس صاحب کے وقت سے ہی گویا اس تحریک کے دماغ تھے، جنہوں نے مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا محمد عمر پالنپوری اور دوسرے رفقاء کے ساتھ اس تحریک کو دنیا کے کونے کونے تک پہونچایا، اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کے عہد میں یہ تحریک دنیا کی سب سے وسیع ترین تحریک بن گئی، اور اب شاید ہی کوئی ملک ہو جو اس کے فیض سے محروم ہو، ۱۴۱۶ھ کو مولانا کا انتقال ہو گیا، اور اب تحریک نے اجتماعی قیادت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے

تحریک کے تمیں آزمودہ کار شخصیتوں کو اس کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے منتخب کیا ان میں سے مولانا اظہار الحسن صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب دو جواں سال اور جواں حوصلہ رفیق مولانا محمد سعد صاحب اور مولانا محمد زبیر صاحب اس عالمگیر تحریک کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے حوصلہ وہمت اور تدبر وفراست میں اضافہ فرمائے اور اس سفینہ کو ساحل مراد سے ہم کنار رکھے۔

تبلیغی جماعت نے ہمیشہ سے اپنی یہ پالیسی رکھی ہے کہ پارلیمانی اور غیر پارلیمانی سیاست سے دور رہتے ہوئے خالص مذہبی امور کی مسلمانوں کو دعوت دی جائے، اللہ کے بندوں کو اللہ کے گھر تک لایا جائے، ان میں خوف آخرت کے تحت عمل کا جذبہ ابھارا جائے، اسی لئے اس جماعت کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہاں آسمان کے اوپر یا زمین کے نیچے کی باتیں ہوتی ہیں، لیکن اب ہندوستان کی فرقہ پرست تنظیموں کو اس غیر سیاسی، شور اور شورش سے دور، خالص مذہبی جماعت میں بھی دہشت گردی کی بو آنے لگی ہے، دو سال قبل رائے ونڈ اور بھوپال کے اجتماع کو بنیاد پرستی کی جڑ قرار دیا جا رہا ہے، اگر پروین توگاڑیا اور اشوک سنگھل جیسے لیڈران نفرت ایسی بات کہیں تو کیا تعجب کہ چند ماہ پہلے کلدیپ نیر جیسے سیکولر خیال کئے جانے والے صحافی کے قلم سے بھی ایسی بے سروپا باتیں اخبارات میں آگئیں، نہ معلوم ان حقیقت ناشناس اور سچائی سے عداوت رکھنے والے صحافیوں کے تیغ قلم سے کتنی سچائیوں کا خون ہوگا، اور اس خون ناحق سے جھوٹ اور نفرت کی کھیتی بار آور کی جائے گی۔

یہ ایک بہت بڑی سازش ہے جس کا مقصد ایک ایسی تحریک کو نقصان پہنچانا ہے جو پر رونق شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قریوں، دیہاتوں، اور کم آباد صحراؤں اور جنگلوں تک دین کو پہنچانے اور مسلمانوں میں اپنی مذہبی شناخت پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہے اور آج اس کا نفع ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر چشم سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، میں دین کے تمام کاموں کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مختلف تنظیموں اور تحریکوں کے کاموں کو اختلاف کار کے بجائے تقسیم کار خیال کرتا ہوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ

دعوت وتبلیغ کی یہ تحریک جتنی دوررس اثر کی حامل ہے، وہ جتنی انقلاب خیز اور اثر انگیز اور طریقہ کار کے اعتبار سے سادہ اور آسان ہے اور جس طرح قدم بقدم یہ خدا سے جوڑنے کا عادی بناتی ہے، وہ ایک نمونہ ہے، ایسا نہ ہو کہ اعداء اسلام کو مسلمانوں کے باہمی اختلاف بلکہ غلط فہمیوں سے فائدہ اٹھا کر امت کے اچھے کاموں کو نقصان پہونچانے کا موقع ملے، حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ یاران حق کا اشن اور سحاب رحمت بن کر بے طلبوں تک پہونچے اور ان میں طلب اور پیاس پیدا کرے اور یہ تحریک عملاً اس وقت اس کام کو انجام دے رہی ہے۔

(۳۰/۸/۲۰۰۲ء)

وقت کا جہاد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (الانفال:۶۰)

"اور جہاں تک ممکن ہو دشمنانِ اسلام کے مقابلے کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو، جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے دشمنوں کو خائف کر سکو، جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کے راستے میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ وہ غفلت اور بے خبری کی زندگی بسر کریں۔ پھر قرآن نے ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے کہ دشمن کے مقابلہ اپنی بھرپور طاقت کو جمع رکھنا چاہیے، اس میں ایسی تعبیر اختیار نہیں کی گئی جس سے صراحتاً عسکری و فوجی قوت ہی مراد ہو، قوت میں عسکری اور غیر عسکری، مادی اور معنوی ہر طرح کی قوت شامل ہے، البتہ آگے جنگی گھوڑوں سے خاص فوجی طاقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اس کی مخاطب ہیں جو دشمنوں سے برسرِپیکار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی بیان فرمایا کہ اس طاقت کا مقصود دوسروں کی جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا اور دنیا کے امن و

آتش پر غارت گری کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد دشمن کی حربی صلاحیت کو خوف زدہ کرنا اور ان کے جارحانہ حوصلہ کو توڑنا ہے۔ اسی کو قرآن نے تُرْهِبُوْنَ بِهٖ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایسی طاقت جو دشمن کو مرعوب کرنے والی ہو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، جس میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ طاقت کی تیاری (اعداد قوت) میں سرمایہ اور مالی تعاون کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے جو کچھ خرچ کیا جائے وہ اللہ کے راستہ ہی میں خرچ کرنا ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قیامت تک انسانیت کے لیے رہبر و رہنما ہے، اسی لیے قرآن میں ایسی تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں جو ہر زمانہ کا ساتھ دے سکیں اور ہر زمانے کے وسائل پر ان کی تطبیق آسان ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں قوت مہیا رکھنے کی بات بہت ہی معنی خیز اور قابل توجہ ہے۔ ہر دور میں طاقت کا ایک ہی سبب نہیں ہوتا، بلکہ مختلف ادوار میں آلاتِ قوت اور اسبابِ طاقت جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں ایک بہت بڑی طاقت ذرائع ابلاغ ہیں۔ ذرائع ابلاغ کسی گروہ کو بامِ اقتدار پر پہنچا سکتا بھی ہے اور تختۂ دار پر لٹکا سکتا بھی ہے، وہ چاہے تو بے قصوروں کو جرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دے اور چاہے تو مجرموں کو معصوم و بے گناہ بنا دے۔ انسان کا دل و دماغ ذرائع ابلاغ کی مٹھیوں میں ہے، اس لیے میڈیا اس دور کی بہت بڑی طاقت ہے، اور یقیناً "أَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" میں شامل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے، تو آپ نے اس کے اعلان اور ایمان کی دعوتِ عام کے لیے خاص طور پر صفا کی چوٹی کا انتخاب فرمایا۔ یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ اہل مکہ کا طریقہ تھا کہ جب بھی کسی اہم بات کی خبر دینی ہوتی، صفا کی چوٹیوں پر چڑھ کر آواز لگاتے، یہ اس بات کی علامت بھی ہوتی کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، جس سے لوگوں کو باخبر کرنا مقصود ہے، اس لیے تمام اہل مکہ اہتمام کے ساتھ جمع ہو جاتے اور گوش برآواز ہو کر اس اعلان کو سنتے، گویا یہ اس زمانہ میں مکہ کا سب سے بڑا ذریعہ ابلاغ تھا، جس طرح آج پورے شہر تک کسی خبر کو پہنچانے کے لیے ریڈیائی آلات کا سہارا

لیے جاتا ہے اور اس میں اشتہارات شائع کرائے جاتے ہیں، اسی طرح اس دور میں صفا کی پہاڑی سے اعلان کئے جاتے تھے۔

سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر بھی دعوتِ اسلام کا کام کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں حج میں بہت سی منکرات اور برائیاں اہلِ مکہ نے اپنی طرف سے شامل کر لی تھیں، یہاں تک کہ بعض لوگ احرام کے نام پر کعبہ کی بے احترامی کرتے تھے اور مرد دن میں اور عورتیں رات میں بے لباس طواف کیا کرتے تھے، منیٰ اور عرفات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کے بجائے لوگ اپنے آباء و اجداد کی تعریف کے نغمے گاتے اور اشعار پڑھتے تھے، عکاظ کا میلہ تو خالص تجارتی میلہ تھا، اس میں وہ تمام رنگ رلیاں ہوا کرتی تھیں اور شراب و کباب کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں جو عیش کوشوں اور عشرت پسندوں کے لوازم میں سے ہیں، لیکن اس میلہ میں بھی آپ پہنچتے اور لوگوں تک حق کی دعوت پہنچاتے، اہلِ مدینہ حج کے اجتماعات ہی کی برکت سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے اور پھر ایسے جاں نثار ہوئے کہ تاریخِ عالم میں ایسی جاں نثاری اور خود سپردگی کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

ان اجتماعات میں جانا اور وہاں دعوتِ حق پہنچانا اس زمانہ کے طاقتور ترین اور وسیع الاثر ذرائع ابلاغ سے استفادہ کی بہترین مثال ہے، اس لیے اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھانا اور ان تک رسائی حاصل کرنا صرف مصلحت کا تقاضا نہیں، بلکہ اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ افسوس کہ جہاں اور بہت سے پہلوؤں سے ہم نے غفلت کی راہ اختیار کی ہے، وہیں ذرائع ابلاغ کی طرف سے ہماری بے توجہی بھی ایک قومی گناہ سے کم نہیں۔

یہودیوں کے کم تعداد میں ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر ان کے غلبہ کا اصل راز بھی میڈیا کی طاقت ہے، جس نے ان کی پروپیگنڈہ کی صلاحیت کو بے پناہ کر دیا ہے، دس سال پہلے کے اعداد و شمار کے مطابق یورپ، ایشیا کے علاوہ امریکہ سے مجموعی طور پر یہودیوں کے ایک ہزار سات سو ستر روزنامے شائع ہوتے ہیں، ان کے

پندرہ روزے، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسالہ جات اس کے علاوہ ہیں۔ (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات ۱۳۹) یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہودی اخبارات، جرائد و رسائل صرف امریکہ اور یورپ میں چھپتے ہیں، بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں ان کی آماجگاہیں ہیں، خود عالم اسلام میں ترکی سے یہودیوں کے ۳ ہفت روزے، ۵ ماہنامے، مصر سے دو ہفت روزے، ۵ ماہنامے اور چار رسالے اور ایران سے ایک ہفت روزہ شائع ہوا کرتا ہے۔ مالٹا اور قبرص جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی ان کے جرائد و رسائل کی تعداد بالترتیب دس اور نو ہیں۔

امریکہ میں ٹیلی ویژن کی پانچ کمپنیاں ہیں، ان میں سے چار یہودیوں کی ہیں، سی بی سی، این بی سی، اے بی سی۔ ان کمپنیوں کے ذریعہ صرف امریکہ میں سات سو سے زیادہ ٹیلی چینل کام کرتے ہیں اور اپنے پروگرام پوری دنیا میں سیٹلائٹ کے ذریعہ نشر کرتے ہیں۔ (دیکھئے: مغربی میڈیا اور اس کے اثرات ۱۴۰) یہودیوں کے زیر اثر شائع ہونے والے اخبارات اپنی تعداد و اشاعت کے اعتبار سے صف اول کے اخبارات و رسائل ہیں، ٹائمز میگزین اور نیوز ویک کی اشاعت بارہ لاکھ سے زیادہ ہے، مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ کی تعداد اشاعت پونے دو کروڑ کے قریب ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کی آبادی تو سب ملا کر ۳ فیصد ہے لیکن ان کی ذرائع ابلاغ کی طاقت کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں کل ۱۷۵۹ روزنامے قارئین تک پہنچتے ہیں، ان میں سے ۱۲۴ روزنامے اخبارات کے مالکین بھی یہودی ہیں، بقیہ اخبارات میں سے ۷۰ فیصد کے مالکان یہودی ہیں اور ان کو پوری دنیا میں تقسیم کرنے کی ذمہ دار بڑی ایجنسیاں اور اشاعتی ادارے ہیں، یہ سب یہودیوں کے قبضہ میں ہیں۔ (مغربی ذرائع ابلاغ ۱۲۹)

یہودیوں نے ذرائع ابلاغ پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد صرف اپنی تجارت اور معیشت کو فروغ دیا، جس سے عیسائیت کی تباہی کا پیش خیمہ بنایا۔ اس مقصد کے لیے یہودی ذرائع ابلاغ نے عریانیت اور آزاد جنسی تعلقات کی دعوت کو اپنا خاص موضوع بنایا، فلموں، ناولوں، افسانوں اور تصویروں نے ذہنی آوارگی اور بے حیائی کو مغربی معاشرہ میں اس حد تک پھیلا دیا کہ امریکہ و یورپ کا معاشرہ جنسی خرافات، شراب و شباب کی بدمستیوں میں پوری طرح غرق

ہو چکا ہے اور اسی طرح یہ سب غفلت کوش، اپنے انجام سے بے خبر اور قوتِ عمل سے محروم معاشرہ یہودیوں نے مکمل معاشی تسلط حاصل کر لیا ہے اور ان کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔

عیسائی دنیا کو تباہ کرنے کے بعد اب ان کا نشانہ عالمِ اسلام، عالمِ عرب اور مشرقی ممالک ہیں۔ مسلمانوں اور عربوں پر یہودی ذرائع ابلاغ کی دوہری یلغار ہے۔ ایک طرف فلموں، ڈراموں اور کارٹونوں کے ذریعے تصور پیدا کیا گیا ہے کہ مسلمان عموماً اور عرب خصوصاً جاہل، شدت پسند، مجرم، قتل و خونریزی کے عادی، بے وقوف، تند ذہن، غریب و قلاش اور عیش پرست ہوا کرتے ہیں۔ اور عرب عورتوں کے دیوانے اور شہوت میں اپنے اندھے ہوتے ہیں کہ انہیں اگر اسی طرح کی کوئی رشوت دی جائے تو وہ فوراً رام ہو جاتا ہے ... اسلامی شعائر کی بے حرمتی کے لیے بھی اشتعالی ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے، عریاں تصویروں کو قرآنی آیات کے بالمقابل شائع کرنے کے کئی واقعات سامنے آ چکے ہیں۔ مغربی میڈیا کا عربوں کے ساتھ کس قدر تمسخر آمیز اور توہین آمیز رویہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ C.N.N جیسی مشہور عالمی ٹی وی کمپنی ایک صابن کا اشتہار اس طرح دیتی ہے: "یہ صابن ہر چیز صاف کر سکتا ہے حتیٰ کہ گندے عربوں کو بھی" اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی اور یہودی میڈیا اسلام سے، مسلمانوں سے اور عربوں سے کیسی نفرت کا مواد پھیلاتا ہے اور دنیا کے سامنے ان کی کیسی تصویر بناتا ہے۔

دوسری طرف ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے عالمِ عرب میں بے حیائی، فحاشی کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے، عالمِ عرب میں اپنی ذہانت اور فنکارانہ صلاحیت کے اعتبار سے مصر کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی خطہ کو مغرب نے ہدف بنایا ہے۔ مصری ٹی وی کے نو چینلوں سے روزانہ ۱۲۶ گھنٹے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں، ان میں دینی پروگراموں کا تناسب محض ساڑھے تین فیصد ہے۔ (مغربی میڈیا ۲۰۳) مصر میں فلمیں اور ڈرامے ایسے ناموں سے منظر عام پر آتی ہیں کہ ان ناموں ہی سے شرم و حیا اور عفت و پاکبازی کا خون ہوتا ہے، اکثر عرب ممالک میں امریکی اور مغربی فلمیں (جو زیادہ تر یہودیوں کا تیار

فکر ہوتی ہیں اردو میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یا ان کے عربی ترجمے قطر ین وقار ئین تک پہنچتے ہیں۔ عالم عرب پر ان کا نہایت ہی منفی اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ہندوستان پر حالیہ برسوں میں مغربی تہذیب و ثقافت جس قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئی ہے اور جس تیزی سے مغربی فیشن ہندوستان کے مشرقی سماج کو اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے، وہ ایک کھلی حقیقت ہے اور شاید ہی کوئی حساس دل ہو جو اس کی کسک کو محسوس نہ کرتا ہو۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ذرائع ابلاغ کی طرف توجہ دیں اور میڈیا تک رسائی حاصل کریں۔ ہندوستانی میڈیا پر سنگھ پریوار کے غلبہ کی وجہ سے مسلمانوں کو گزشتہ نصف صدی میں جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ ناقابل تلافی اور ناقابل بیان ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ میں مسلمان اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں، اس کے لیے منصوبہ بند طریقے پر چند کام کرنے ہوں گے۔ ذیل ملک کے مختلف علاقوں سے ذہین و باصلاحیت مسلمان طلبہ کو جرنلزم کا کورس کرانا اور انہیں انگریزی اور مقامی زبانوں کے اخبارات وغیرہ میں داخل کرنا، دوسرے جو لوگ صحافت کے پیشے سے وابستہ ہیں یا جو دوسرے ذرائع ابلاغ میں مصروف کار ہیں، وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات سے انہیں دعوت دینا اور مسلمانوں کے مسائل اور اسلام کے بارے میں ان کو صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کی غلط فہمیاں دور کرنا، تیسرے اپنے مسائل آپ پیش کرنے کے لیے ایسے چینل قائم کرنا جس کی پالیسی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس کا خوشگوار تجربہ قطر کا الجزیرہ چینل ہے، جو غلط فہمیوں کو دور کرنے اور حقائق کو پیش کرنے میں بہتر کردار ادا کر رہا ہے اور خود مغربی ممالک تک بھی حقائق کو پہنچانے میں اس نے کسی قدر کامیابی حاصل کی ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو ایسی تدبیر اختیار کرنی ہوگی تاکہ برادرانِ وطن کے قلوب میں شکوک و شبہات کے جو کانٹے چبھوئے جا رہے ہیں وہ انہیں نکالنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا انگریزی اخبار ایک خواب ہے، نہ معلوم کہ تعبیر اس کی قسمت میں ہے یا نہیں؟ یہ بات نسبتاً آسان ہے کہ مختلف علاقوں کی مقامی زبان میں مسلمان اپنا اخبار نکالیں، جیسا کہ اس وقت ملیالم اور گجراتی زبان میں مسلمانوں نے اپنا

زمزم پبلشرز

اخبار نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ گجرات کے حالیہ فساد میں ظلم و جور کا جو رقص ہوا ہے، اس میں بعض شرپسند گجراتی اخبارات کا بنیادی کردار ہے، جنہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر غلط طریقہ پر پیش کیا اور ہندو عورتوں کی عصمت ریزی کی غلط اطلاع نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان مقامی زبانوں خاص کر ہندی میں اپنا اخبار نکالیں، کم سے کم ہندی، تمل، مراٹھی، اڑیا اور بنگالی زبانیں ایسی ہیں کہ صرف مسلمان قارئین کے ذریعہ اخبار کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔

غرض ذرائع ابلاغ عصرِ نو کا طاقتور ہتھیار ہے اور اس میں اپنے اثر و رسوخ پیدا کرنا اور اس رسوخ کو دینی اور قومی مفادات کے لیے استعمال کرنا وقت کا بہت بڑا جہاد ہے!

(۲۸/ جون ۲۰۰۲ء)

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

انسان کو جو چیزیں دیگر مخلوقاتِ عالم سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں دو صفتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک عقل اور دوسرے قوتِ اظہار۔ عقل کا مرکز دماغ ہے، جو واقعات اور ان واقعات سے ثابت ہونے والے نتائج کو سمجھتا ہے اور اظہار کا ذریعہ و وسیلہ زبان ہے، جو دماغ کی فکر اور دل کے احساس کو دوسروں تک پہنچاتی ہے۔ کون انسان ہے جو اپنے خیالات اور جذبات کو ظاہر نہ کرتا ہو، لیکن سلیقۂ اظہار بھی بڑی چیز ہے۔ ایک شخص اپنا قصۂ غم سناتا ہے تو انسان کا دل بھی نہیں پگھلتا اور یہی داستانِ الم اس شخص کی زبان سے سنئے جو زبان و بیان کا سلیقہ رکھتا ہو تو لگتا ہے کہ پتھر بھی موم ہو جائے گا، چہ جائے کہ انسان کا دل اپنی دھڑکنوں اور آنکھیں اپنے آنسوؤں پر قابو رکھیں۔ اسی سلیقۂ کلام و بیان کا نام ادب ہے۔ غرض ادب اپنے افکار اور احساسات کے ایسے اظہار کا نام ہے جو دل کی انگیٹھی کو سلگا سکے اور ذہن و دماغ کو اپنا اسیر بنا سکے۔

پس ادب اظہار کا ایک ذریعہ و وسیلہ ہے۔ انسان اچھے مقاصد کے لئے بھی اس کو استعمال کر سکتا ہے اور اسی سے فساد و بگاڑ پھیلانے کا بھی کام لے سکتا ہے، لیکن افسوس کہ انسان نے اپنی اس عظیم اور امتیازی صلاحیت کا استعمال بہتر اور تعمیری مقاصد کے لئے کم اور خراب اور تخریبی مقاصد کے لئے زیادہ کیا ہے۔ اسلام سے پہلے شعر و ادب کے جو مکاتب گذرے ہیں، قریب قریب ان سب نے شعر و سخن کا موضوع ایسی چیزوں کو بنایا ہے جو نہ انسان کی فکر و اخلاق کی تعمیر میں معاون تھا اور نہ انسان کے حقیقی مسائل کو ابھارنے میں، روم و یونان ہو یا عرب و ایران، معیارِ سخن تھیں جو ادیبوں کے فکر و خیالات کا محور بنی ہوئی تھیں، ایک تو رجزیہ نظم و نثر، جس میں جنگ و جدال پر ابھارا جاتا، اپنے ممدوح کی

بہادری اور شجاعت کا اظہار ہوتا اور اپنی فتح اور دشمنوں کی شکست کے مافوق العادت نقشے کھینچے جاتے، خود ہندوستان میں رامائن اور گیتا ایسے ہی ادب کا نمونہ ہے۔

دوسرا موضوع مرثیہ اور نوحہ و ماتم کا تھا، عرب شاعری نے بھی اس میں بڑا حصہ پایا ہے، کسی شخصیت کی موت کا ایسا نقشہ کھینچا جاتا گویا اس کی وفات سے زمین میں بھی زلزلہ بپا ہوگیا اور آسمان میں آنسوؤں کی برسات بہہ پڑی۔ ادب کا تیسرا موضوع تملق اور خوشامد ہوتا تھا، ادباء اور ارباب فن اپنی کاہلی اور سست گامی کے لئے مشہور تھے، بادشاہوں، رئیسوں، نوابوں کی خوشامد میں اشعار کہتے، نثر لکھتے اور زمین کو آسمان سے ہم آغوش کرنے والی تعریفیں کرتے جو عقل و فہم سے بھی ماوراء تھے اور انعام و اکرام کی صورت میں اس کی قیمت وصول کرتے، اس لئے جھوٹ اور مبالغہ دنیوں کی عام بول چال میں ایک سنگین برائی ہے، لیکن شعر و سخن کی دنیا میں یہی سب سے بڑی خوبی، بلکہ ادب کا امتیازی وصف ہے۔ شعراء اور ادباء کا چوتھا موضوع حسن و عشق اور شراب و شباب رہا ہے۔ جن اخلاق سوز اور حیا باختہ باتوں کو کوئی شریف انسان اپنی مجلس احباب میں بھی نہیں کہہ سکتا، شعر و ادب کے نام پر ان ہی باتوں کو ادیبوں اور شاعروں نے مجمع عام میں سنایا اور اپنی تحریروں کے ذریعے چار دانگ عالم میں پھیلانے میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ یہ موضوع جو ان سب میں زیادہ بگاڑ اور فساد کا موجب تھا، مشرق و مغرب کے ادب میں اسی قدر محبوب و مطلوب قرار پایا۔ کمیونزم کے ابھرنے کے بعد ادب میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا، جس نے بغاوت کا لب و لہجہ اختیار کیا اور پیٹ کو اپنے لئے مقصود بنایا۔ پیٹ ہی سے اس کی ابتداء ہے اور پیٹ ہی پر اس کی انتہاء ہے۔

ادب کی یہ ساری صنفیں انسانی سماج کو اخلاقی بگاڑ اور فکری انتشار کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں، یہ انسان کو باغی اور دہشت گرد بناتی ہیں، خوشامد اور چاپلوس بناتی ہیں، محبوب کے گیسو و رخسار کا اسیر کرتی ہیں اور انسان کے سفلی جذبات ہی کو ان کا مقصد وجود بنا دیتی ہیں، یا پھر مال و دولت کا حریص اور ایک بھوکے جانور کی طرح شکم پروری کے لئے مضطرب و بیقرار کر دیتی ہیں۔ کیا ایسی شاعری اور ایسا ادب انسانی سماج کو کوئی نفع پہنچا سکتا

ہے اور کیا اس سے کسی بات کی توقع [illegible] سازی میں مدد مل سکتی ہے؟ اسلام نے اس مزاج کو بدلا اور ایک ایسے ادب کو وجود بخشا جو سچے انقلاب کا داعی تھا، جو انسان کے اندر اپنے خالق اور ملک کی محبت پیدا کرتا ہے، بغاوت کے بجائے محبت اور امن کی تعلیم دیتا ہے، خوشامد کے بجائے حقیقت پسند بناتا ہے، محبوب کے نقش و نگار اور خد و خال کو بے پردہ کرنے کے بجائے شرافت و پاکیزگی اور حیا کی تعلیم دیتا ہے، زندگی کے حقیقی مسائل کو ابھارتا ہے اور پاکیزہ اخلاقی جذبات کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ ادب برائے ادب اور شعر برائے شعر کا قائل نہیں، بلکہ ادب برائے تعمیر و اصلاح کا قائل ہے۔

شعرا و ادبا اسی فرسودہ تصور کے اسیر ہو کر رہ گئے، جس کا مقصد خیالی شاعری اور خیالی جذبات نگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ آج کا ادیب و شاعر آسائش کا محلوں میں بیٹھ کر غریبوں کا فسانہ بیان کرتا ہے اور جشن و طرب کی بزم میں بیٹھ کر نوحہ و ماتم کرتا ہے۔ ایسے ادب میں دلوں کی دنیا کو بدل دینے اور برف میں آگ لگانے کی صلاحیت کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے، جس شاعری میں اور ادب میں خونِ جگر شامل نہ ہو، جس کی تہوں میں درد انگڑائیاں نہ لیتا ہو، جس کے خود کے پس پشت حقیقی معنوں میں درد و کسک نہ ہو، ایسا ادب سے کانوں کی لذت کا سامان تو ہو سکتا ہے، دلوں کی دنیا نہیں بدل سکتی۔

اردو زبان اسلام کے آغوش میں پلی، اخلاق و شائستگی کی گود میں اس نے پرورش پائی، لیکن بدقسمتی سے اردو شاعری نے بھی بہت جلد حسن و عشق کی غلامی کو قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ مولانا محمد حسین آزاد کو کہنا پڑا:

> "یہ نہایت قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ یعنی مضامین عاشقانہ، مخموری، مستانہ، بیگانگی و گلزار و خزاں، رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصال [illegible] پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری، [illegible] حسن و عشق [illegible] کے [illegible] مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے۔ [illegible] ہوئے نکلے اور دل کے چبائے ہوئے نوالے ہیں، انھیں کو چباتے ہیں

اور خوش ہوتے ہیں، خیال کرو، اس میں کیا مزا رہا۔ حسن و عشق، سبحان اللہ، بہت خوب، لیکن تا بکے؟ گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ سو برس کی بڑھیا ہو گئی۔" (آبِ حیات)

یہی بات مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں کہی ہے اور اسی کو شاعر حق ترجمان علامہ اقبال نے فرمایا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اردو ادب میں اس بے حسی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مغربی دنیا سے اتنے مرعوب ہوئے کہ شعر و سخن اور زبان و ادب میں بھی ہم نے انہیں کو کعبۂ تقلید بنا رکھا ہے۔ ہندوستان کے اہل علم و نظر مغرب سے کس درجہ مرعوب تھے، اس کا اندازہ سر سید مرحوم جیسے صاحب نظر اور دردمند شخص کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے، جو ان کے خط کا اقتباس ہے۔ یہ خط اکتوبر ۱۸۶۹ء میں لندن سے لکھا گیا تھا۔

"بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، عالم سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلہ میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے جانور کو۔" (مکاتیب سرسید: ۱۸۷)

اسی لئے اقبال کو ہندوستان کے ادباء و شعراء کو یہ آواز دینی پڑی کہ

الحذر شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

اسلامی ادب اور اسلامی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ سچی حقیقتوں اور صداقتوں کی ترجمانی ہوتی ہے اور سماج کی اصلاح و تربیت کی خدمت انجام دیتی ہے، منظر نگاری اور

فنکار فطرت کی نقالی نہیں کرتا ہے بلکہ حسن و صداقت کا مظہر ہوتا ہے۔ آرٹ، ادب اور ہنر کا تصور میں اقبال کا اعلیٰ شعر و ادب کا تصور انسان کی ذات سے مقصد کی پیروی کا ہے اور فنکار کے فن کا مقصد سے جڑا ہے جو زندگی اور سماج کی ذات کے بیان میں رہنمائی کرتے ہوئے اپنے زمانے کے مطابق صالح اور مقصدی فکر کا پیغام دیتے ہیں۔ اگر شعر و ادب کی ترقی ملوث ہو کر رہ گئی ہے اور ہر قوم کی ترقی چاہنے والے انسانیت کی تعمیر، حق کی اصول اور قوموں کے تخلیقی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنے والے شعراء، ادیب اور ہنر مند ہوں تو یقیناً ان کے فن سے ایک صالح انقلاب آ سکتا ہے اور دونوں کے درمیان تال میل پیدا ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے ہندوستان کے ادیبوں، شاعروں، داستان گویوں اور اہلِ نظر سے اسی مضمون پر تفصیلی خطاب کیا ہے جو آپ کے دستِ کلیم ہونے کا ثبوت ہے۔ کاش! اقبال کی فکر کو ادیب اور شاعر اپنائیں اور ادب و حقیقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ہمارے دل کی دنیا بدل سکے۔ آپ ان اشعار کو پڑھئے اور اقبال کے فن کو سمجھئے!

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

۲۷ مارچ کے اخبارات میں ایک خبر چھپی ہے کہ بی۔ جے۔ پی نے ۷۸ سالہ قائد ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، جو خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، کے ناطے سے پارٹی لیڈر۔ بی۔ جے۔ پی کے صدر بھی رہ چکے ہیں، آج کل یہی جوتش سے وابستہ ہیں۔ وہ نجومیوں سے بھی بہت متاثر ہیں، ملاقات کر کے مبارک اور نحوست کے اوقات حاصل کرتے ہیں۔ نجومیوں نے بڑے غور و فکر کے بعد انہیں بتایا کہ پارٹی کے مرکزی دفتر واقع ۱۱ اشوکا روڈ، دہلی میں واقع ہے اس کے باب الداخلہ کے سامنے کا رخ ٹھیک نہیں۔ بی۔ جے۔ پی کے عروج اقتدار تک پہنچنے کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا ہے اور پورے ملک میں فرقہ پرستی کا رقص کرنے اور ظلم و جور کی آگ لگانے والے اس منحوس دروازے کے سامنے ایک سب سے بڑی کا اس نے نحس کو راستہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اس دروازے کو کاٹنے میں دقت نہ پیش آئی اس لئے باب الداخلہ کو بند کر دیا گیا ہے اور دوسری سمت سے دروازے سے آمد و رفت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

واجپائی جی کی حلف برداری کے لئے بھی اسی طرح گرانٹ شدہ وقت مقرر ہوا ہے اور اس کا "شبھ گھڑی" نام دیا گیا ہے، انہیں وقت کے اندازے میں غلطی نہ ہو جائے، اس کے لئے خصوصی طور پر تین گھڑیاں خریدی گئی ہیں، اور وہ بھی چار عدد۔ ایک پارٹی کے دفتر میں رہے گی، ایک راشٹرپتی بھون میں، ایک واجپائی جی کے پاس اور ایک ایڈوانی جی کے پاس۔

"شبھ گھڑی" کا انتخاب کوئی بات تعجب کی نہیں ہے۔ ملک کے آنجہانی وزیر اعظم نرسمہا راؤ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ، کئی زبانوں کے ماہر تھے، دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، مگر ملک کے سیکولر اور جمہوری کردار کو جو نقصان ان سے پہنچا ہے، وہ کسی اور سے نہیں پہنچا۔ ...

بھی نہیں پہنچا۔ انہوں نے بھی اپنی حلف برداری کے لئے ماہر نجومیوں سے وقت لیا تھا اور ان کی دانشوری اس میں کچھ بھی مانع نہ ہوئی۔ وزارتِ عظمیٰ ان کے لئے اتنی "مبارک" ثابت ہوئی کہ کسی طور کرسیٔ صدارت سے اترنے کو تیار نہ تھے، بالآخر ان کے رفقاء نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو اس کرسی سے نیچے اتار پھینکا۔ اس کے بعد پارلیمانی پارٹی کی صدارت کا مرحلہ تھا اس عہدہ سے بھی وہ کسی طور سے سبکدوش ہونے کے لئے آمادہ نہ تھے، لیکن ان رفقاء نے بقول ان کے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جیسے بھرے دربار میں "دروپدی" کی ساڑی کھینچنے کی کوشش کی گئی اور کوئی اس کی حمایت کرنے والا نہ تھا۔ "بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے" کے مصداق انہوں نے اس عہدہ کو خیرباد کہا اور اب "کل اپنے گناہوں کے جال میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ کسی طرح چھٹکارا نہیں پاتے اور صورتِ حال یہ ہے کہ "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!"

اس سے بھی زیادہ حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ملک کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو (جو بہت روشن خیال تصور کئے جاتے تھے) نے بھی حلف اٹھانے کے وقت نجومیوں سے مشورہ کیا تھا اور اسی لئے ۱۲ء بجے شب سے ۵ منٹ پہلے حلف لینے کی خواہش کی تھی، ماؤنٹ بیٹن کے لئے بھی نہرو کی یہ بات خلافِ توقع اور باعثِ حیرت تھی، وہ نہرو جیسے سائنٹفک ذہن کے آدمی سے اس کی ذرا بھی توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن نہرو جی نے نجومیوں کے فلسفۂ نفع و نقصان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

سائنس نے آج کتنی ترقی کر لی ہے، انسانی قدم نے چاند کے سینے کو روند دیا ہے، مریخ پر اس نے کمند ڈالا ہے، سمندر کی موجوں کو چیر کر وہ اس کی تہہ تک پہنچ گیا ہے اور کائنات کی ایک ایک شی کو وہ اپنے علم و تحقیق کی گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہے، یہاں تک کہ اس نے حیوانات کی پیدائش کے لئے ایک مصنوعی نظام کا تجربہ بھی کیا ہے، لیکن اگر انسان عقیدہ و ایمان سے محروم ہو تو علم و تحقیق بھی اس کو اوہام کی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتا، وہ دنیا کی ان حقیر چیزوں کو اپنی تقدیر کا مالک تصور کرنے لگتا ہے جو اس کی ٹھوکروں میں ہیں اور جن کو خدا نے خود اس کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اسلام نے انسانیت کو توحید کا جو عقیدہ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ انسانیت کے لئے بڑا اعزاز ہے۔ توحید یہ ہے کہ انسان صرف خدا ہی کو اس کائنات کا رب اور نفع و نقصان کا مالک تصور کرے اور اس بات کا یقین رکھے کہ خدا نے اس کے لئے جو کامیابی لکھی ہے، کوئی سازش اسے ناکامی سے بدل نہیں سکتی ہے اور خدا نے جو ناکامی مقدر کر دی ہے کوئی تدبیر اس کو اس سے بچا نہیں سکتی۔ دریا ہوں یا پہاڑ، درخت ہوں یا سیارہ، ماہ، ستارے ہوں یا کوئی ساعت اور مکان، یہ انسان کی قسمت اور تقدیر میں کوئی دخل نہیں رکھتے ہیں۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جو توہمات کی دیوار کو زمین بوس کر سکتا ہے اور انسان کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور اپنی کتابِ تقدیر ان کے ہاتھ میں دینے سے بچاتا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی بعض مہینوں، جانوروں اور پرندوں کو منحوس خیال کیا جاتا تھا، لیکن عقیدۂ توحید نے اس قسم کے اوہام و خرافات کی ظلمتوں کو چاک کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ تیمور نے ہندوستان کو فتح کیا اور جمنا پار کرنا چاہا تو نجومیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ نامبارک وقت ہے، تیمور بہت زیادہ لکھا پڑھا آدمی تھا، نہ سائنسی علوم حاصل کئے تھے، نہ کسی زبان کا ماہر تھا، نہ کسی یونیورسٹی کا فاضل تھا، لیکن مسلمان تھا، اس نے بے جھجک انکار کیا اور کہا کہ اس طرح کی بات پر مشرکین اور تثلیث کے ماننے والے (عیسائی) یقین رکھتے ہیں، ہم مسلمان اور اہلِ توحید ایسی باتوں کا یقین نہیں کرتے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے عہد میں مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر میں مشرکانہ مذاہب مروج تھے، مصر کی زراعت کا دارومدار دریائے نیل پر تھا، اتفاق کہ مسلمانوں کے قبضہ کے بعد دریا خشک ہو گیا، گورنر سے اہلِ ملک نے کہا کہ دریا قربانی کا خواستگار ہے، ہم لوگ ہر سال ایک کنواری لڑکی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں، اس کے بعد ہی پانی جاری ہوتا ہے، گورنر نے حضرت عمرؓ کے پاس اطلاع بھیجی، آپؓ نے ایک تحریر لکھی، یہ تحریر دریا کے نام تھی کہ "اگر تو خدا کے حکم سے بہتا ہے تو جاری ہو جا، ورنہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جا!" آپؓ نے ہدایت فرمائی کہ اسے دریا میں ڈال دیا جائے، ایسا ہی کیا گیا اور دریا کا پانی ایسا جاری ہوا کہ پھر خشک نہ ہوا۔ (دیکھئے محمد رضا: الفاروق عمر بن خطاب ط: مصر ۲۷۰)

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نہ کوئی وقت منحوس ہے اور نہ کوئی جگہ، نہ کوئی ساعت نامبارک ہے اور نہ کوئی جانور، بدبختی اور نحوست کا تعلق خود اپنے عمل سے ہے۔ انسان کا برا عمل اور انسانیت کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ سب سے بڑی نحوست ہے اور حق اور سچائی پر استقامت اور انسانیت کے ساتھ بھلائی سب سے بڑا سبب برکت اور خوش بختی ہے۔ نجومیوں سے مبارک و منحوس کے بارے میں استفسار کرنے سے بہتر ہے کہ انسان خود اپنے ضمیر سے (بشرطیکہ بالکل مردہ نہ ہو) اپنے اعمال اور رویہ کے بارے میں استفسار کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات کتنی فکر کی ہے کہ توحید کا عقیدہ کتنی بڑی رحمت ہے، اس عقیدہ نے ایک خدا کے سامنے انسان کی جبینِ نیاز کو ضرور خم کیا ہے۔ لیکن اس نے کتنے ہی دروازوں پر جھکنے سے انسان کو بچایا ہے اور کتنے ہی توہمات کی پرستاری اور غلامی سے اسے نجات بخشی ہے، اسی کی طرف شاعر مشرق علامہ اقبال نے اشارہ فرمایا ہے کہ:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۰ اپریل ۱۹۹۸ء)

کامیابی کی کلید

طوفان اس لئے آتے ہیں کہ بڑی تباہ خیزیوں کے ساتھ گزر جائیں، موجیں اس لئے متلاطم ہوتی ہیں کہ ساحل کو روندکر واپس چلی جائیں، آتش فشاں اس لئے پھوٹتے ہیں کہ زمین کے پیٹ میں جو لاوے چھپے ہوئے ہیں وہ باہر آکر ساکت و جامد ہو جائیں، ان کی ہلاکت خیزیاں اور تخریب انگیزیاں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ لگتا ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ ان کے بے پناہ استبداد سے بچ نہیں سکے گا، لیکن ان کو ثبات و دوام حاصل نہیں ہوتا، انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی میں بھی ایسے طوفان اٹھتے ہیں کہ جن سے دل لرزتے اور قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، لیکن اصل میں یہ اس کے لئے آزمائش کے لمحات ہیں، اگر وہ کچھ دیر اس میں استقامت کا ثبوت دے، اگر سختی سے دوچار ہو، جذبات سے مغلوب نہ ہو اور رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو کر کوئی غیر دانشمندانہ اقدام نہ کر بیٹھے تو یہی مصیبت اس کے لئے رحمت کا مقدمہ اور یہی وقتی پستی اس کے لئے سربلندی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مومن کو قرآن نے ایسے مواقع پر دو باتوں کا حکم دیا ہے: صبر اور صلوۃ ___ صبر کیا ہے؟ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی عزیز و قریب کی موت پر رونے دھونے سے اجتناب کا نام "صبر" ہے، لیکن حقیقت میں صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، صبر کے معنی برداشت کرنے کے ہیں، قوت برداشت بہت بڑا جوہر ہے اور اس قوت سے محرومی بہت بڑا عیب ہے، جس آدمی میں قوت برداشت ہوتی ہے، اس میں تدبیر کی صلاحیت ہوتی ہے، اور وہ مخالف سازشوں سے نمٹنے کی موثر کاروائی کر سکتا ہے، انبیاء کو چونکہ سب سے زیادہ مخالف حالات سے گزرنا پڑتا ہے، اس لئے ان میں حلم و بردباری اور مخالفت کو سہنے کی صلاحیت من جانب اللہ سب سے زیادہ ودیعت ہوتی ہے۔

میرا منشا یہ نہیں ہے کہ صبر کا مطلب بزدلی اختیار کرنا، ورنہ حملہ آور بن جانا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ عقل و حکمت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہئے اور اپنے جذبات کو بے لگام ہونے سے بچنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر اہل مکہ کی جانب سے ایک جتھے نے مسلمانوں پر حملہ کیا جو تیس چالیس افراد پر مشتمل تھا، ظاہر ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی جان لینے کے در پے ہو کر حملہ آور ہوئے تھے، وہ اس کے مستحق تھے کہ ان کو سزا دی جائے، جس مقصد کے لئے آئے تھے وہی رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا جاتا یعنی انہیں قتل کر دیا جاتا یا کم سے کم قید کر لئے جاتے لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوں ہی رہا فرما دیا، کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی اور اس سے چاہے جانی یا مالی نقصان کسی بھی فریق کا ہوتا، لیکن عربوں میں اسلام سے نفرت اور بڑھ جاتی، کیوں کہ وہ حرم کا بے حد احترام کرتے تھے، انہیں خیال ہوتا کہ مسلمانوں نے اب حرم کی حرمت کو بھی پامال کرنا شروع کر دیا ہے، یہ ہوش کو جوش اور حکمت و مصلحت کو جذبات پر غالب رکھنے کی ایک مثال ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی کا ایک سفر جو "غزوۂ بنو مصطلق" کے نام سے معروف ہے۔ اس غزوہ میں ایک انصاری اور حضرت عمرؓ کے غلام کے درمیان معمولی سی بات پر کچھ تیز و تند گفتگو ہوگئی، پھر انصاری نے اپنی مدد کے لئے انصار کو، اور حضرت عمرؓ کے غلام نے مہاجرین کو آواز دی، اور اس طرح دو افراد کا جھگڑا دو گروہ کا جھگڑا بن گیا، عبد اللہ بن اُبی جو نفاق کے مرض میں مبتلا تھا، بلکہ گروہ منافقین کی قیادت کرتا تھا، اور کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا، جس سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہونچے، اس نے اس موقع کو اپنی ناشائستہ حرکت کے لئے بہت غنیمت جانا، اور انصار کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ مہاجرین کے معاملہ میں تمہاری مثال عربوں کے اس محاورہ کی سی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو، کہ وہ تمہیں ہی کاٹ کھائے: "سمن کلبک یاکلک" عبد اللہ بن ابی کی اس ریشہ دوانی کی اطلاع حضور ﷺ کو ایک کمسن انصاری صحابیؓ نے دی، جب آپ نے عبد اللہ بن ابی کو بلا کر استفسار فرمایا تو وہ صاف مکر گیا، کچھ دوسرے بزرگ انصار نے بھی عبد اللہ بن ابی

کے نفاق سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے بھی عبداللہ بن ابی کی حمایت کی۔ اس موقع پر قرآن مجید کی آیت ان نوجوان انصاری صحابیؓ کی تصدیق میں نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے ازرہِ شفقت ان کی گوش مالی کرتے ہوئے، ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی ہے۔

حضرت عمرؓ پر حق کا جوش غالب رہتا تھا۔ انہوں نے آپ سے اجازت مانگی، کہ عبداللہ بن ابی کی گردن ماردی جائے۔ اگر حضور ﷺ اس کی اجازت مرحمت فرماتے تو یقیناً یہ بپا ہوتا کہ "الفتنة اشد من القتل" لیکن آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا تاکہ اگر میں ایسا کروں تو انصار کو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، اور لوگ بھی ایسا سوچیں گے کہ محمد ﷺ خود اپنے رفقاء کو قتل کرا رہے ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی اور صحابہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ اس پورے دن، رات اور آٹھ دن دوپہر تک خلاف معمول چلتے رہے، یہاں تک کہ سب تھک کر چور ہو گئے تو آپ نے پڑاؤ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس مسلسل سفر کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اتنا تھک جائیں کہ انصار و مہاجرین کے درمیان جو تلخی وہاں پیدا ہوگئی تھی، اس کا اثر جاتا رہے، پھر ایک وقت آیا کہ خود عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ بہت مخلص مسلمان اور نبی کریم ﷺ کے خاص محبین میں تھے، انہوں نے درخواست کی کہ میں اپنے والد کے نفاق سے واقف ہوں، اور اگر آپ ﷺ کا حکم ہو تو میں خود انہیں قتل کر سکتا ہوں، آپ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ ﷺ کو مسلمان ظاہر کرے گا۔ میں اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا ہی معاملہ کروں گا، پھر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو یہ صورت حال بتائی کہ اگر ہم اس وقت عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دیتے تو اس سے بعض مخلص مسلمانوں کو بھی غلط فہمی ہو سکتی تھی، لیکن اب یہ صورت حال ہے کہ خود ان کے بیٹے ان کا سر قلم کرنے کو تیار ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی رائے میں برکت رکھی ہے، بارك الله في رأي رسوله

یہ وہی حکمت و مصلحت اور ہوش کو جذبات اور جوش پر ہوش کو غالب رکھنے کی بات

ہے، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کی کئی ہی مثالیں ملتی ہیں، موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اس صورت حال کو سمجھیں، اگر ہم نے مغلوب الغضب ہو کر چند پتھر پھینک دیئے، تو اس سے یقیناً دوسروں کا کچھ خاص نقصان نہیں ہوگا اور نہ اس سے آپ کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا، البتہ اس سے آپ کے لئے بہت زیادہ نقصان و مضرت کا اندیشہ موجود ہے، کوئی انسان کتنا بھی ظالم اور بدخو ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو اپنے ظلم و جور کے لئے کوئی دلیل ہاتھ آجائے، خواہ وہ کمزور سے کمزور تر کیوں نہ ہو، شیطان نے بھی اپنی عدول حکمی کے لئے ایک دلیل دریافت کر لی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مادۂ تخلیق اس کے مادۂ تخلیق سے کمتر ہے، اس لئے وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کرے گا۔

اگر ہم مشتعل اور بے برداشت ہو کر کوئی معمولی سی حرکت بھی کر گزریں تو جو لوگ اپنے سینوں میں بغض چھپائے رکھتے ہیں، ان کو اپنی زیادتی کے لئے سند جواز ہاتھ آجاتی ہے، گویا ہم اپنے ہاتھوں ان کو اشتعال کا ہتھیار دے دیتے ہیں، پھر لوگ واقعات اور اس کے اصل محرکات کو نہیں دیکھتے، بلکہ ظاہری سبب کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اس لئے ایسے مواقع پر سوچنا چاہئے کہ کون سا قدم ہمارے مقصد کے لئے مفید و معاون ہوگا، مثلاً ابھی افغانستان پر امریکہ کے ظالمانہ حملہ کی بات ہے، اگر ہم حکومت سے نمائندگی کریں کہ وہ اس معاملہ میں مظلوم کی طرفداری یا کم سے کم غیر جانبداری کو برقرار رکھے، تو یہ ایک معقول بات ہوگی، اسی طرح مغربی اور عالم اسلام کے سفارت خانوں سے بھی ملاقاتیں کر سکتے ہیں اور ان کے سامنے اپنے جذبات رکھ سکتے ہیں، لیکن اگر ہم اس مقصد کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں تو اس سے ہمارے مقصد کو تو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوگی، لیکن فرقہ پرست طاقتوں کے کاز کو ضرور تقویت ملے گی، اور یہ ہمارے لئے کس قدر نقصان دہ ہوگا، وہ محتاج بیان نہیں۔

خدا کی مدد کا دوسرا ہتھیار "صلوٰۃ" ہے، صلوٰۃ کے اصل معنی نماز کے ہیں، نماز ایک ایسی عبادت ہے، جس میں انسان خدا کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچھا دیتا ہے، اور پیشانی سے لے کر پاؤں تک انگ انگ خدا کی بندگی میں مشغول ہوتا ہے، اس لئے نماز

وہ اصل رجوع الی اللہ کا عنوان ہے۔ یعنی مشکل حالات میں انسان اپنے رب کی طرف پوری طرح رجوع ہو جائے، وہ خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھ دے کہ اے مالک! میں تو تیرا بے بس فقیر ہوں، تو داتا ہے، قرآن بتاتا ہے کہ حالات جو بھی ہوں خدا کی طاقت بے پناہ ہے، ہم سب تو روز و شب خدا کی قدرت کو برسر کار دیکھتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ قدرت اسباب کے پردہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے، کبھی کبھی خدا کی طاقت اسباب سے آزاد ہو کر بھی انسان کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ غور کرو کہ جب حضرت موسیٰ اور قوم بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کے لئے فرعون کا لشکر جرار جمع ہو رہا تھا، اور کبر و غرور سے مغرور ہو کر نکل رہا تھا تو لوگ یہی دیکھ رہے تھے کہ یہ لشکر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے چل رہا ہے، لیکن اللہ کے یہاں یہ بات مقدر تھی کہ سامان کا یہ اجتماع خود ان کے نیست و نابود ہونے کا ذریعہ بن جائے گا۔ ٹھیک یہی ہوا، بدر کے معرکہ میں بڑے بڑے سورما اور بہادر مکہ سے چلے آئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو تمہارے سامنے ڈال دیا ہے۔ ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر لوگوں کو خیال گزرا ہوگا کہ یہ تو مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، لیکن کسے خبر تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سورماؤں کو اس لئے جمع کر رہا ہے کہ خود ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اور مکہ اپنے ضدی سرداروں سے نجات پا جائے، اور آئندہ اہل مکہ کے لئے دعوت حق کو قبول کرنا آسان ہو، غزوۂ احزاب میں اتحادیوں کی ایک پہاڑ جیسی فوج اس لئے جمع ہوئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تمام اسلام مخالف طاقتوں کو متحد و مربوط کر دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور تھی کہ اس آخری کوشش کی ناکامی کے بعد ہمیشہ کے لئے ان کی ہمت ٹوٹ جائے، اور خود ان کی صفیں بکھر جائیں۔

اس لئے ہمیں خدا کی طرف اور اس کے خزانۂ طاقت سے مدد لینا چاہئے، پھر اس کے لئے نہ کوئی چیز انہونی ہے اور نہ کوئی بات ناممکن، وہ چاہے تو وقت کی سپر طاقتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے، اور اپنے کمزور بندوں کو آن واحد میں زبردست قوت دے، دعا کا مقصد یہی ہے کہ مومن خدا کے غیبی خزانہ سے اپنا مدعا حاصل کریں۔۔۔۔ یہی صبر اور رجوع الی اللہ اللہ کی مدد کی کلید اور کامیابی کا ذریعہ ہے، اور بے صبری اور قلق کے نتیجے میں شکست

صبر سے مؤمن کے لئے ناکامی و نامرادی کا تصور نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ آخری فقرہ صبر کی مزید تاکید کے لئے ہے۔ کیونکہ صبر ایک مشکل کام ہے۔ اپنے جذبات کی آگ کو اپنے آپ بجھانا، اور نفس کے تقاضوں کو آپ قتل کرنے کے مترادف ہے۔ انسان کا کسی مقصد کے لئے یکبارگی جان دے دینا نسبتاً آسان ہے، لیکن کسی کاز کے لئے گھٹ گھٹ کر مرنا اور مسلسل اپنے جذبات کو تختۂ دار پر چڑھانا بہت دشوار ہے۔ اسی لئے شاعر نے خوب کہا ہے:

حقیقتاً زندگی ہے جی کے مر جانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ دیوانوں سے کیا ہوگا

موجودہ حالات میں ہمیں اپنے آپ میں صبر کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے۔ ہمارے دل حوصلہ و ہمت سے معمور ہوں، ہمارے جذبات کی لگام عقل و شعور کے ہاتھوں میں ہو، ہماری پیشانی میں خدا کے یقین کا نور ہو، اور ہمارے ہاتھ اپنے خالق کے حضور اٹھے ہوئے ہوں، یہی ہمارے لئے کامیابی کا راستہ ہے اور اسی طرح ہم اللہ کی مدد کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

(۹ نومبر ۲۰۰۱ء)